آغا ناصر

ہم جیتے جی مصروف رہے

فیض احمد فیض کی شاعری
منظر اور پس منظر

ہم جیتے جی مصروف رہے

فیض احمد فیض کی شاعری ——— منظر اور پس منظر

آغا ناصر
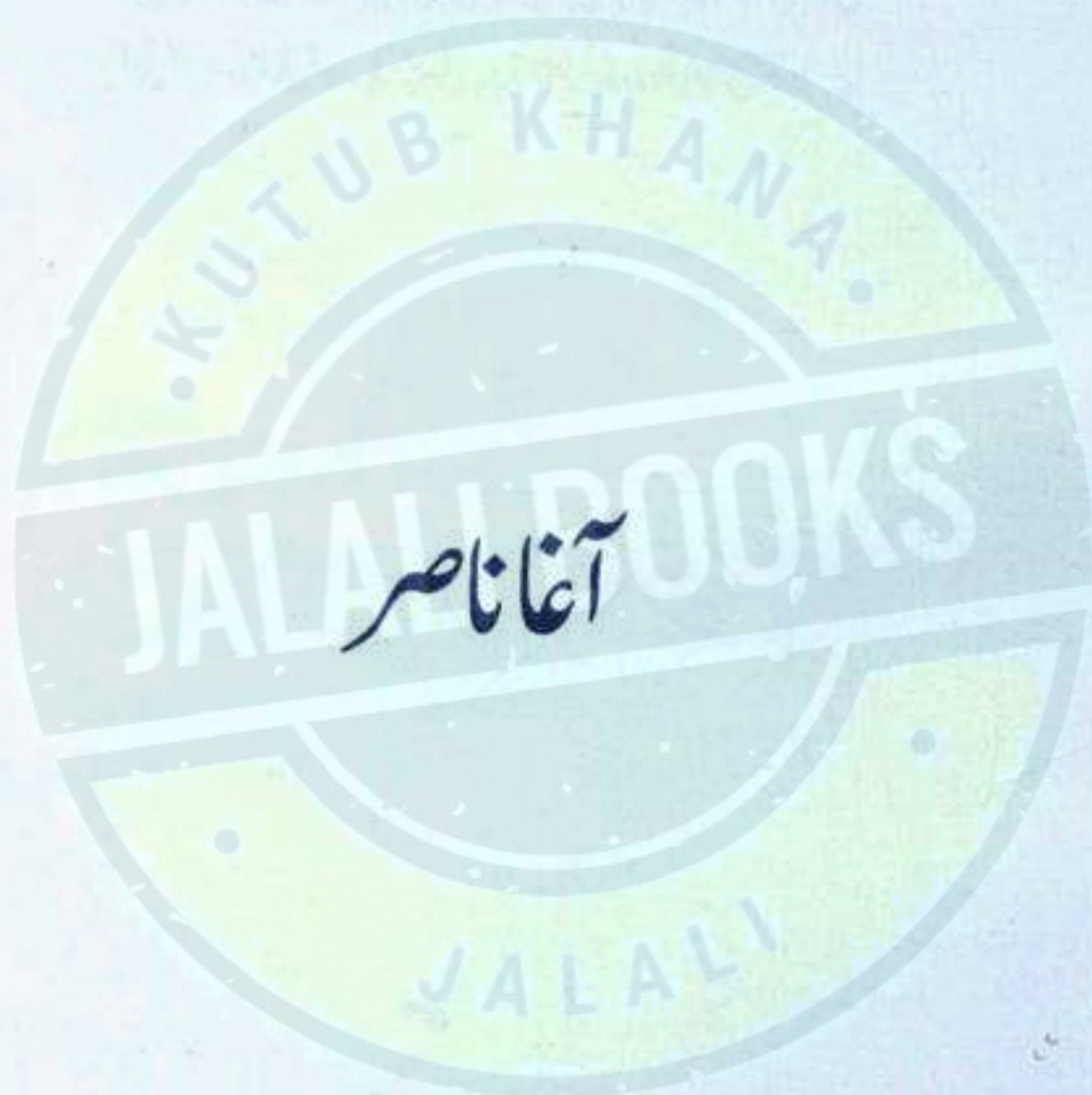
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.51 Agha Nasir

Ham Jitayji Masroof Rahay/
Agha Nasir.- Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2008.

349pp. with picture

1. Urdu Literature - Poetry.

I. Title.

2008
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2153-6
ISBN-13: 978-969-35-2153-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام

آغا ناصر اور فیض صاحب

ترتیب

حرفِ آغاز

ایک عرصہ سے یہ کتاب لکھنے کا خیال میرے دل میں تھا۔

اب سے برسوں پہلے میں نے ایک بار فیض صاحب سے کہا تھا کہ آپ نے ہماری تاریخ اور قومی زندگی کے ہر اہم موقع پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اگر پڑھنے والوں کو آپ کی ان تخلیقات کے پس منظر اور شانِ نزول کا علم ہو تو ان کا لطف دوبالا ہو جائے۔ خاص طور پر سیاسی موضوعات پر لکھی ہوئی نظموں کے لئے تو یہ بہت ہی مفید ہوگا کہ قارئین کو یہ معلوم ہو کہ یہ کس زمانے اور کن حالات میں لکھی گئی ہیں۔

میرا یہ خیال فیض صاحب کو پسند آیا اور انہوں نے فرمایا کہ میں یہ کام ضرور کروں۔ میرے ذہن میں تھا کہ نظموں اور غزلوں کا انتخاب کرنے کے بعد میں ان سے ہر ایک کی "وجہ تصنیف" اور ان کوائف کے بارے میں دریافت کروں گا جو ان کی تخلیق کے محرک تھے۔ مگر بدقسمتی سے میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس گفتگو کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ رحلت فرما گئے۔

ان کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے باوجود میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کتاب ضرور لکھوں گا اور ان کے دوست احباب کی فراہم کی ہوئی معلومات، اپنے ذاتی مشاہدات اور ان کے بارے میں لکھے ہوئے مضامین اور کتابوں سے حاصل کردہ مواد کو یکجا کر کے اپنے ارادہ کی تکمیل کروں گا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ کام خاصہ دشوار ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خاصی فراغت درکار ہوگی۔ یہی سبب تھا کہ فیض صاحب کی موت کو اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود میں یہ کام نہ کر سکا۔ پھر اچانک ایک روز مجھے احساس ہوا کہ فیض صاحب کے دیرینہ ساتھی اور ہم عصر ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں۔ فیض صاحب سے میری گفتگو کے بعد ان کے بہت سے دوست آہستہ آہستہ رخصت ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے میرے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ مزید انتظار کیے بغیر اس کتاب کے لکھنے کا کام شروع کر دوں۔ عبداللہ ملک، سبط حسن، استاد دامن، خواجہ خورشید انور، ایلس فیض اور ڈاکٹر آفتاب احمد وغیرہ، جن کے تجربات اور مشاہدات سے میں مستفید ہو سکتا تھا اب ہمارے درمیان نہیں رہے تھے اور ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

سو میں نے اللہ کا نام لے کر کتاب لکھنے کا آغاز کر دیا اور یقین کیجیے اسے لکھتے ہوئے مجھے اتنا مزہ آنے لگا کہ اندازے سے کہیں کم

وقت میں یہ کام پورا ہو گیا۔

اس کتاب کی نوعیت دوسری کتابوں سے ذرا مختلف ہے۔ یہ نہ تو فیض صاحب کی شاعری کا تنقیدی جائزہ ہے، نہ ہی ان کے سیاسی اور قومی رجحانات اور فلسفۂ حیات پر تبصرہ اور نہ ہی یہ ان کی سوانح یا شخصی خاکہ ہے۔ اگرچہ گاہے گاہے، یہ سارے عناصر اختصار کے ساتھ موقع محل کے مطابق پڑھنے والوں کو اس کتاب میں ملتے رہیں گے۔ میں نے فیض صاحب کی شاعری سے جن سو نظموں اور غزلوں کا انتخاب کیا ہے ان میں سے ہر ایک کا تعارف اور پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان نوشتوں کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں مگر غور کیا جائے تو شاید ایک طرح کا تعلق ہے بھی۔

یہ انتخاب ان کی ایسی معروف تخلیقات پر مبنی ہے جن کی شانِ نزول اور کیفیتِ احوال یقیناً قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ میرے مخاطب خاص طور پر نئی نسل اور آنے والی نسلوں کے قارئین ہیں جنہیں ان واقعات کے احوال کا علم نہیں ہے اور جنہوں نے فیض صاحب کو دیکھا بھی نہیں ہے۔

میں نے ان اشعار اور نظموں کو موضوعات کے اعتبار سے سترہ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصہ کو علیحدہ علیحدہ عنوانات دیئے ہیں۔ ممکن ہے کہ میری اس تقسیم سے سب کو اتفاق نہ ہو اور کوئی نظم جسے میں نے کسی ایک عنوان کے تحت رکھا ہے انہیں کسی دوسرے باب میں زیادہ مناسب معلوم ہو۔ قارئین کے یہ خیالات درست ہیں یا نادرست میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ چونکہ میرے لئے تو اہم بات یہ ہے کہ یہ سارے اشعار اس کتاب میں شامل ہیں خواہ کسی باب یا کسی حصہ میں ہوں۔

ان ابواب کی تقسیم میں نے پاکستان کے حالات اور فیض صاحب کے محسوسات کے حوالے سے کی ہے۔ مثلاً یوم آزادی کی تقریبات پر لکھی جانے والی نگارشات، ایام اسیری کی شاعری، جلاوطنی کے دور کی تخلیقات، جنرل ایوب خاں اور ضیاالحق کی مارشل لا کے ادوار کی شاعری، عشقیہ منظومات، دوستوں اور اپنے پیاروں کی یاد میں لکھے گئے مرثیے اور نوحے وغیرہ وغیرہ۔

میں اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب سے میری نیاز مندی تھی۔ وہ مجھ سے بے حد شفقت فرماتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی میں ان کی شاعری کا گرویدہ تھا۔ میں اور میرے قریبی دوستوں کا ایک گروپ دیوانگی کی حد تک ان کا مداح تھا۔ جب فیض صاحب حیدر آباد جیل میں اسیری کے دن گذار رہے تھے تو ہم ہر پل اس انتظار میں رہتے تھے کہ جیل سے ان کی کوئی نئی تخلیق باہر آئے۔ جب بھی ایسا ہوتا تو جیسے ہماری عید ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنی کتاب ''گمشدہ لوگ'' کے مضمون میں اس کا تفصیلی احوال قلمبند کیا ہے۔ یہاں اس کا ایک چھوٹا سا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات 1955ء میں ہوئی جب وہ جیل سے رہائی کے بعد پہلی بار کراچی آئے۔ ان دنوں ہم چند طالب علموں نے کراچی یونیورسٹی میں ''یونیورسٹی کلب'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہوا تھا جہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو بطور مہمان مدعو کیا جاتا اور ان کے ساتھ شام منائی جاتی تھی۔ فیض صاحب نے اس شام اگرچہ باتیں تو بہت زیادہ نہیں کیں مگر شعر کافی سنائے۔ ویسے وہ اس محفل میں خود کو کچھ تنہا تنہا سا محسوس کر رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ ہم سب طالبِ علم جونیئر، کم عمر اور ان کے لئے اجنبی صورت تھے۔ ان کا کوئی ہم عمر اور ہم رُتبہ شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ کچھ جونیئر لیکچرار تھے مگر وہ بھی دیکھنے میں طالبِ علم ہی معلوم ہوتے تھے۔ وائس چانسلر اور سنیئر پروفیسر ''باجوہ'' اس جلسے میں شریک نہیں تھے۔

تقریب کے اختتام پر فیض صاحب سے باتیں ہوئیں۔ وہ اپنے جیل کے شب و روز کا حال مسکرا مسکرا کر اس طرح سُناتے رہے۔ جیسے کسی دلچسپ تفریحی سفر کا قصہ ہو۔ ان کے اندازِ بیاں، لہجے کے دھیمے پن اور اپنائیت نے ہم سب کے دل موہ لئے۔ اس شام میرا سب سے بڑا انعام فیض صاحب سے تعارف تھا۔

اس طرح فیض صاحب کی شاعری سے میری رغبت ان کی ذات سے محبت کی صورت اختیار کر گئی اور میرا اور ان کا یہ تعلق ان کی دائمی جدائی تک برقرار رہا۔ اب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان سے اس قربت کے باوجود میں اُن سے زیادہ فیضیاب نہ ہو سکا۔ باتیں تو ان سے ہوتی تھیں مگر ہمیشہ ایک فاصلہ قائم رہتا تھا۔

وہ بے حد نرم خو، مدھم اور ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے مگر اس کے باوجود ان کی شخصیت اور دانشوری کا رعب قائم رہتا تھا اور اُن سے بات کرتے ہوئے کچھ خوف سا آتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے دوسرے شاعروں اور دانشوروں سے بہت مختلف تھے۔ مجھے ان کی شخصیت کے گرد ایک ہالہ سا محسوس ہوتا تھا۔ اگر وہ کسی محفل میں آجاتے تو ان کے داخل ہوتے ہی ایسے لگتا تھا جیسے کمرہ روشنی سے معمور ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔

ان کے اشعار سنتے ہی بعض اوقات سننے والوں پر ایک بے خودی کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ فیض کی شعر گوئی کے سلسلہ میں ان کی روسی سوانح نگار لدمیلا وسیلیوا نے ایک بڑے مزے کی بات لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے فیض شعر گوئی کو ''عشق'' اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں کو ''کام'' کہتے تھے۔ وہ ساری عمر کام اور عشق کی کش مکش میں مبتلا رہے۔ انہوں نے زندگی بھر اچھے اچھے شعر کہے اور اچھے اچھے کام کئے مگر ہمیشہ نا مطمئن ہی رہے۔

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے

یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور کام سے عشق الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

ان کی انہیں ابیات سے میں نے اس کتاب کا عنوان بھی اخذ کیا ہے
''ہم جیتے جی مصروف رہے''

آخر میں اس کتاب کی تدوین اور تشکیل میں ان سارے احباب کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پر واجب ہے جن کی مدد کے بغیر یہ کام مکمل کرنا مشکل تھا۔

سب سے پہلا نام اس سلسلہ میں سلیمہ ہاشمی کا ہے، جن کی مشاورت اور معاونت نے اس کتاب کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا، خاص طور پر فیض صاحب کی بہت سی تصویروں، صادقین اور ثمینہ آفتاب کی پینٹنگز کا انتخاب اور سرورق کے لئے نامور مصور سعید اختر کے بنائے ہوئے اسکیچ کا حصول۔ ان کے علاوہ میری بیوی صفیہ، برادرم افتخار عارف، منیزہ ہاشمی، محمود الحسن، محمد ارشد اور سید نعمان قادری کے نام ہیں جنہوں نے مواد کی فراہمی، کلام کے انتخاب، کمپیوٹر ٹائپنگ اور پروف ریڈنگ وغیرہ میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

آغا ناصر
اسلام آباد
جنوری ۲۰۰۸ء

☆......☆......☆

شعر گزشت سے سرگزشت تک

فیض صاحب کی نظموں اور غزلوں کے پس منظر اور شانِ نزول پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس دلچسپ کتاب کی "وجہ تصنیف" حرف آغاز میں مختصر لیکن جامع الفاظ میں آغا ناصر یوں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فیض صاحب کے "دوست احباب کی فراہم کی ہوئی معلومات، اپنے ذاتی مشاہدات اور ان کے بارے میں لکھے ہوئی مضامین سے حاصل کردہ مواد کو یکجا کر کے "یہ کتاب مرتب کی ہے۔ فیض صاحب کی سو منتخب غزلوں اور نظموں کا تعارف اور پس منظر عقیدت مندانہ لیکن محققانہ چھان بین اور چھان پھٹک کے بعد سادہ و دلنشین پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ اس سے پہلے اس انداز اور پیمانے پر کسی بھی قدیم یا جدید شاعر کے کلام کا سوانحی، محسوساتی یا واردات قلبی کا قلمی پس منظر ایسے مربوط تسلسل، حزم و احتیاط، جامعیت اور حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہو کہ نزول نظم کی کہانی کبھی جگ بیتی اور کبھی جگ بیتی بنتی دکھائی دے اور شعر گزشت پر خود شاعر کی سرگزشت کا گمان ہونے لگے۔

شعر و نظم کی تفہیم کا پہلا مرحلہ تو وہ ہوتا ہے جب ہم صرف ان کے الفاظ کو بولنے دیتے ہیں۔ اس صورت میں ہماری تفہیم ان کے لغوی، روایتی اور متداول معنوں تک محدود ہوتی ہے، جس کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ دوسرا مرحلہ وہ جب نظم کی شانِ نزول، اس کے محرکات اور پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر نظم کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایک نظم، پسِ نظم یعنی بطونِ متن سے ایک اور سیامی تو امی نظم نمودار ہوتی ہے جس کا D.N.A. تو بالکل وہی ہوتا ہے، لیکن لفظی پیراہن تلے رنگ اور روپ سُروپ کے نئے شیڈ اور معانی و تاثیر کی نئی تلمیحاتی تہیں ابھرتی ہیں۔ آغا ناصر نے اس مرحلے کو اپنی کاوش و محنت پژوہی سے ہمارے لیے آسان کر دیا ہے۔

"ہم جیتے جی مصروف رہے" نظم، پسِ نظم اور شعر اندر شعر کی کہانی ہے۔ فیض صاحب کی ان معروف نظموں کا جو ان کی زندگی ہی میں قبول عام اور بقائے دوام حاصل کر چکی تھیں۔ آغا ناصر نے بیک ڈراپ اور پس منظر انتہائی محنت اور اسی حد تک پہنچی ہوئی محبت سے فراہم کی ہے، جو اس کتاب کو فیض صاحب کے کلام کی تشریح و تفہیم کے لئے ایک مستند و معتبر حوالے کی کتاب و کلید اور روزِ اوّل ہی سے کلاسیک کا درجہ دینے کے لئے کافی ہے۔ مجھے امید ہی نہیں، یقین ہے کہ نہ صرف ادب کے بہت سنجیدہ قاری بلکہ عام پڑھنے والے بھی اس کتاب کو اتنی ہی دلچسپ پائیں گے جتنی کہ یہ معلومات افزا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

☆......☆......☆

از قسمِ پیش لفظ

یہ ناممکن ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں گردوپیش کی جھلک نظر نہ آئے، ماسوا ایسے افراد کے جو مشقت کے طور پر شعر گھڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اربابِ نقد ونظر نے اُردو کے کلاسیکی شعراء کے کلام سے بھی اُن کے دور کے سیاسی اور سماجی حقائق اخذ کیے ہیں، اس شعری روایت کی طرف فیض نے بھی اشارہ کیا ہے۔

جان جائیں گے جاننے والے فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو

لیکن فیض کے شعر میں پاکستان اور پاکستان کے عوام کے ساتھ ہونے والی واردات کا عکس تلاش کرنے کے لئے چنداں کوشش کی ضرورت نہیں کیونکہ فیض نے اپنی شاعری کی پہلی دہائی میں ہی اپنی ذات کے تقاضوں سے بلند ہو کر دنیا کا غم اپنانا شروع کر دیا تھا۔

پھر عملی زندگی میں بھی ایسی راہیں اختیار کیں، یعنی مزدور دوستی، سامراج سے آزادی کی لگن، آزاد صحافت، عوام کے اقتدار کی سیاست، فلسطین کی آزادی اور حرمت کی جنگ، اور غمِ دوراں کے علاوہ فکر اور آرزو کا کوئی اور منبع قبول خاطر نہ ہوا۔ اگر واقعات کی جزئیات سے نظر اٹھا کر تاریخ کے اتار چڑھاؤ کا احاطہ مختلف ادوار میں غالب حقیقتوں کی رُو سے کیا جائے تو فیض کی شاعری میں پاکستان کی تاریخ کے بنیادی خدوخال واضح شکل میں سامنے آجائیں گے۔

'بچپن کی فضائے گردوپیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل لگی' کے زیر اثر فیض کی شعر گوئی کا سلسلہ 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' کے ساتھ ختم تو نہیں ہوا، جیسا کہ فیض نے خود بھی کہا ہے، لیکن محبت کے سوا، زمانے کے اور بھی دکھ اور وصل کی راحت کے سوا اور بھی راحتوں کا احساس موضوعاتِ سخن میں نمایاں ہونے لگا اور فیصلہ کچھ یوں ہوا۔

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سُکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

1940ء کی دہائی کے آغاز میں ہی برصغیر کے عوام کو آزادی کے امکانات نظر آنے لگے تھے، فیض کی شاعری میں بھی وہ جن کو معذوری اجداد سے میراث میں ملی تھی، جن کی زندگی کسی مفلس کی قبا کی مانند تھی جس میں ہر گھڑی درد کے پیوند لگتے رہے تھے، اُن سب کو اُمید ہو چلی تھی کہ اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ لیکن جب آزادی آئی تو شاعر کے دل سے یہی صدا بلند ہوئی

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

....

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ایک طویل مدت تک فیض کو صبح آزادی کو شب گزیدہ سحر کہنے پر ہدف ملامت بنایا گیا، لیکن قیام پاکستان کے 50 سال بعد فیض کی دعوت سفر نے ہی موقر مبصرین کو ملک کی حالت زار کے بیان پر اختتامیہ کلمات فراہم کیے۔

فیض کو شعر کی شان نزول کی کھوج لگانے والے "ادبی سراغرساں حضرات" کے سوالات سے خاصی کوفت ہوتی تھی، لیکن مرزا ظفر الحسن کی شستہ مستقل مزاجی کے سامنے وہ بے بس ہو جاتے تھے۔ مرزا صاحب کی تشفی کے لئے کی گئی داغ داغ اجالا، کی توضیح فیض کی نظر میں آزادی کے معانی سمجھنے اور شاعر کی انسان دوستی کی مضبوط بنیادوں کا احاطہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ پتہ چلا کہ پنجاب بھر میں اور لاہور میں خاص طور پر آنکھوں کے سامنے قتل و غارت کا بازار تو گرم تھا ہی، رات گئے مال روڈ پر ایک مجبور اور لباس سے محروم عورت کی پناہ کے لئے تڑپ نے آزادی کے دعویٰ پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ یعنی آزادی کے معنی صرف بلند عمارتوں پر جھنڈے لہرانا نہیں ہو سکتے تھے، شہریوں کی زندگی اور بے بس عورت کی حرمت کے تحفظ کے بغیر آزادی کا تصور ممکن ہی نہیں تھا۔

انسان دوستی کا یہی پیمانہ ہمیں فیض کے جیل کے ایام کی شاعری میں واقعات و حالات کی قدر متعین کرنے میں زیر استعمال نظر آتا ہے۔ ان ہی ایام میں فیض کے نظریۂ حیات و فن کی تکمیل ہوئی جسے اِن لافانی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"حیات انسانی کی اجتماعی جدّ و جہد کا ادراک، اور اس جدّ و جہد میں
حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے، فن اسی زندگی کا
ایک جزو اور فنی جدّ و جہد کا ایک پہلو ہے، یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لئے
طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور

مستقل کاوش۔

اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق واستطاعت پر ہے۔

لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔''

اس نظریے کی شہادت فیض کے کلام میں سال بہ سال مل جاتی ہے، قید میں آزادی کے متوالے کا جلال سرور افزا بھی نظر آتا ہے اور پردیس میں قاتل و ہمدم سے دوری کا ملال بھی، کبھی موسم گل طرب خیز ہے تو کبھی احوال گل ولالہ غم انگیز، صبا جمہوریت کی بحالی کا مدھم سا پیغام لاتی ہے تو فضا معطر ہو جاتی ہے، اور جب فاطمہ جناح کے خلاف ایوب خاں کی فتح کا جشن منانے والے خاک نشینوں کا خون رزق خاک بناتے ہیں تو قومی بے کسی کی تصویر سامنے آ جاتی ہے، کیوبا دیکھنے کا موقع ملتا ہے تو دیارِ یار کی جوششِ جنوں کو سلام کرتے کرتے اپنے وطن کے دامانِ تار تار کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کسان کانفرنس کا ولولہ انگیز موقع آتا ہے تو آواز گرجدار ہو جاتی ہے۔ یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر۔ یہیں پہ روزِ حساب ہوگا۔ اور جب بنگالی ہموطنوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے تو پہلے اضطراب وقہر کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔

حذر کرو مرے تن سے یہ سَم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوب صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشک صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

اور پھر اپنی بے بسی کا ماتم

تہ بہ تہ دل کی کدورت
میری آنکھوں میں اُمڈ آئی تو کچھ چارہ نہ تھا
چارہ گر کی مان لی
اور میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھولیا

فیض کا شعر سیاستدان اور صحافی کی براہِ راست جارحیت کا پیکر نہیں، یہاں اشارے کی لطافت پر انحصار ہے، کبھی کبھی جو ہے اور جو ہوگا یا ہونا چاہیے مختلف آوازوں کی صورت میں بیان ہوتا ہے جیسے ''شورش بربط وئے'' کی دو آوازیں یا تین آوازیں (ظالم، مظلوم اور ندائے غیب)، ان مکالموں میں جولانی عزم بزدلوں کو بھی حوصلہ دے سکتی ہے۔

فیض کے شعر کے ساتھ پاکستانی عوام کے سفر میں بعض مسرت افزا مقام بھی آتے ہیں، اور بہت سے المناک بھی، لیکن یہ سفر نہایت دلچسپ اور حسب توفیق سبق آموز ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ سفر کے آخری ایام کے علاوہ جب ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا، فیض کے ظرف صبر واستقلال میں اُمید چھلکتی رہی۔

یہ نامناسب ہوگا کہ آغا ناصر کی شاندار ضیافت سے پہلے ہی فیض کی شاعری میں پاکستانی تاریخ کے نمایاں مواقع کی نشاندہی کر کے قارئین کا مزہ کرکرا کر دیا جائے۔ اتنا عرض کر دینا شاید کافی ہے کہ آغا ناصر سخن فہم ہی نہیں اہل دل کے ہمراز بھی ہیں، فیض سے نیاز مندی نے ان کی حق گوئی کو جلا دی ہے۔ اور حسن بیان کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ جس خلوص اور عرق ریزی سے آغا ناصر نے فیض کے شعر کے ساتھ تاریخ کو سمجھنے میں سہولت کا اہتمام کیا ہے وہ قابل رشک ہے اور اسی بنا پر وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ اس عاجز قلم فقیر کو پیش لفظ لکھنے کی دعوت صرف ان کی دوست نوازی اور فراخدلی کا کرشمہ ہے۔ آیئے فیض کو کشاں کشاں کھینچ لینے والے قافلے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

آئی۔اے۔رحمٰن

☆......☆......☆

شعراور شاعر

آغا ناصر نے جب اِس کتاب کے لیے کچھ لکھنے کو کہا تو عمرِ گذشتہ کی کتاب کے ورق اُلٹنے لگے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جی چاہا کہ یاد کی دہلیز پہ رُک جاؤں۔

کچھ ہی روز پہلے ابّو کے کاغذات سیدھے کرتے ہوئے ان کا ۲۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو لکھا ہوا خط ہاتھ لگا۔ فارم ب۔ پر میرے نام یہ خط لاہور جیل سے بھیجا گیا تھا۔ فارم ب میں ۱۲ لائنیں ہوتی ہیں۔ قیدی کو ان ہی ۱۲ لائنوں میں اپنا خط پورا کرنا ہوتا ہے۔ خط میں قیدی کو وصول کنندہ سے رشتہ اور اگر کسی اور کا بھی نام تحریر میں ہو تو اُس سے بھی اپنا رشتہ بیان کرنا ہوتا ہے۔ غرضیکہ یہ (Daughter) Salema Faiz کے نام فارم ب کچھ یوں تھا.....

''پیاری چھیمی، بہت سا پیار، امی کے ہاتھ تمہارا خط ملا، دل خوش ہوا، پھر اخبار کی cutting بھی ملی، لو بھئی تمہارا نام تو ابھی سے کوئی چار دفعہ اخبار میں چھپ چکا ہے بڑے بڑے نواب اور خان بہادر ساری عمر اتنی سی بات کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اکثر اپنا نام PT میں دیکھنے کے لیے ہماری خوشامد کیا کرتے تھے، ایک ایسے ہی نواب صاحب کے بارے میں میں نے ایک play بی بی سی کے لیے لکھا تھا، غالباً اگلے مہینے براڈ کاسٹ ہوگا۔ BBC کے لیے میں نے اور بھی بہت سے پروگرام ریکارڈ کئے تھے، تمہارا ریڈیو تو شاید نہیں چلتا، کسی چچا سے کہنا خیال رکھیں اور تمہیں سنوا دیں، میں بالکل آرام سے ہوں، Brothers Karamazov شروع کی ہے، آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں تا کہ زیادہ لُطف آئے، تم نے پڑھی ہے یا نہیں؟ اگلے ہفتے تمہاری آنٹی جمیلہ کی شادی پر سب لوگ کراچی سے آئیں گے، خیال تھا کہ New Year سب ساتھ منائیں گے لیکن افسوس کہ ہمیں اِدھر کی دعوت آ گئی، خیر تم سمجھ لینا کہ ہم ڈھاکہ یا لندن میں ہیں، تمہاری سالگرہ منالی، یہی بہت ہے۔ باقی باتیں ملنے پر ہوں گی۔

بہت سا پیار

ابا''

جس سالگرہ کا ذکر ہے اُسی کے لیے ابّو ۱۳ دسمبر کو لندن سے لاہور پہنچے تھے۔ تا کہ ۱۴ دسمبر کو میرے دوستوں کے ساتھ منائی جا سکے۔ ۱۵ دسمبر کو۔ بلاوا۔ آ گیا۔ لاہور آنے سے قبل اُن کا ایک پوسٹ کارڈ لندن سے میرے نام آیا تھا۔ آخری

جُملہ تھا

''جُدائی سے دل تنگ آ گیا ہے''

آغا صاحب نے ''ہم جیتے جی مصروف رہے'' میں وہ واقعات، حالات، کیفیات چُن دیے ہیں جو فیض کے متفرّق عنوانات سے جُڑے ہوئے ہیں۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو جاننے سے پڑھنے والے شعر سے زیادہ محظوظ ہوں گے۔ البتہ ممکن ہے شاعر کی فکر سے رفاقت بڑھ جائے۔

اور یہاں ماما کی وہ بات موزوں ہے کہ جب لوگ ان سے اصرار کر کے سوال کرتے کہ ''ایلس، کیا آپ فیض کی شاعری سمجھ لیتی ہیں؟'' تو وہ ہمیشہ جواب دیتیں ''شاعری نہ سہی، شاعر کو سمجھ لیتی ہوں۔'' آغا ناصر نے ایلس کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔

سلیمہ ہاشمی

☆......☆......☆
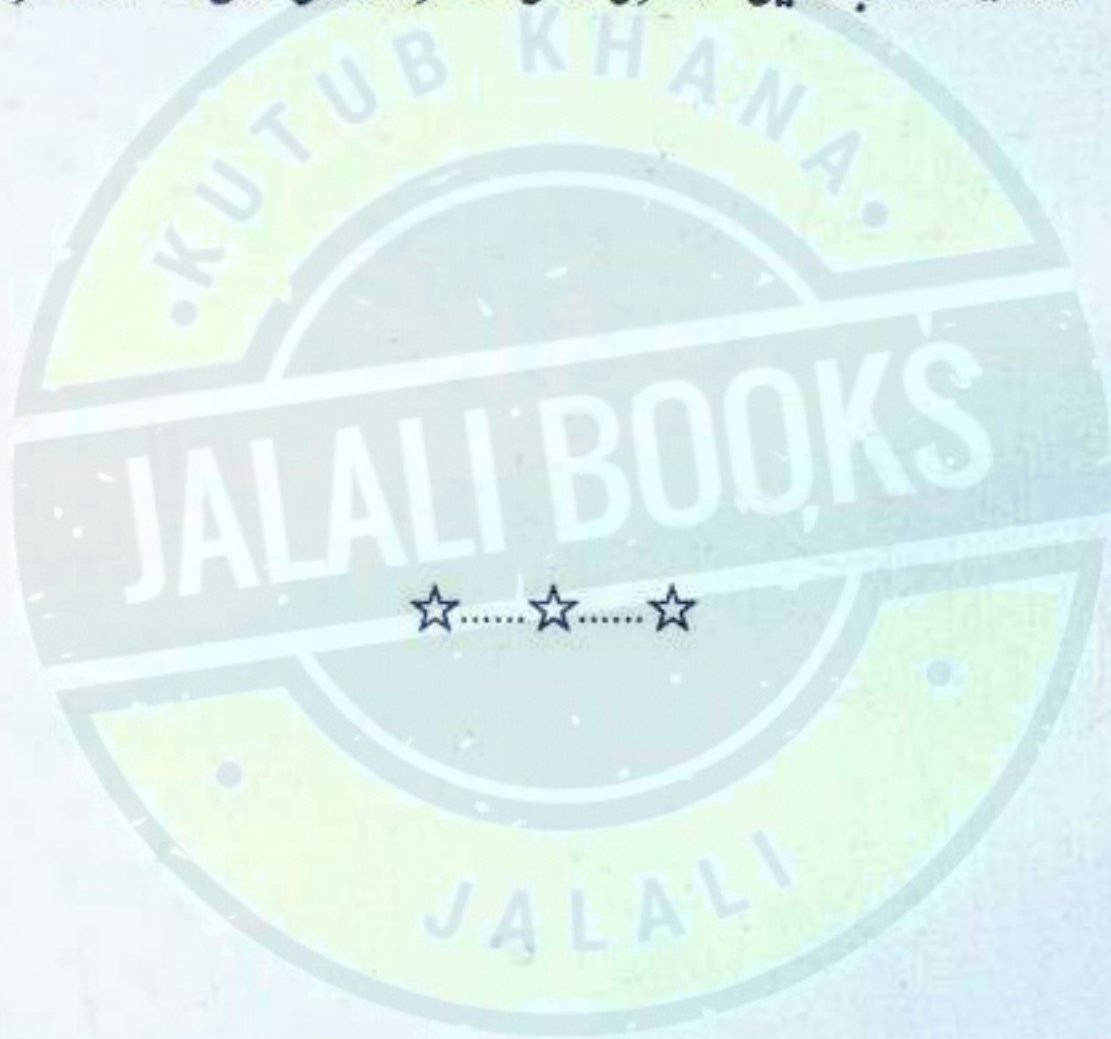
یہ داغ داغ اجالا

قومی تقریبات

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
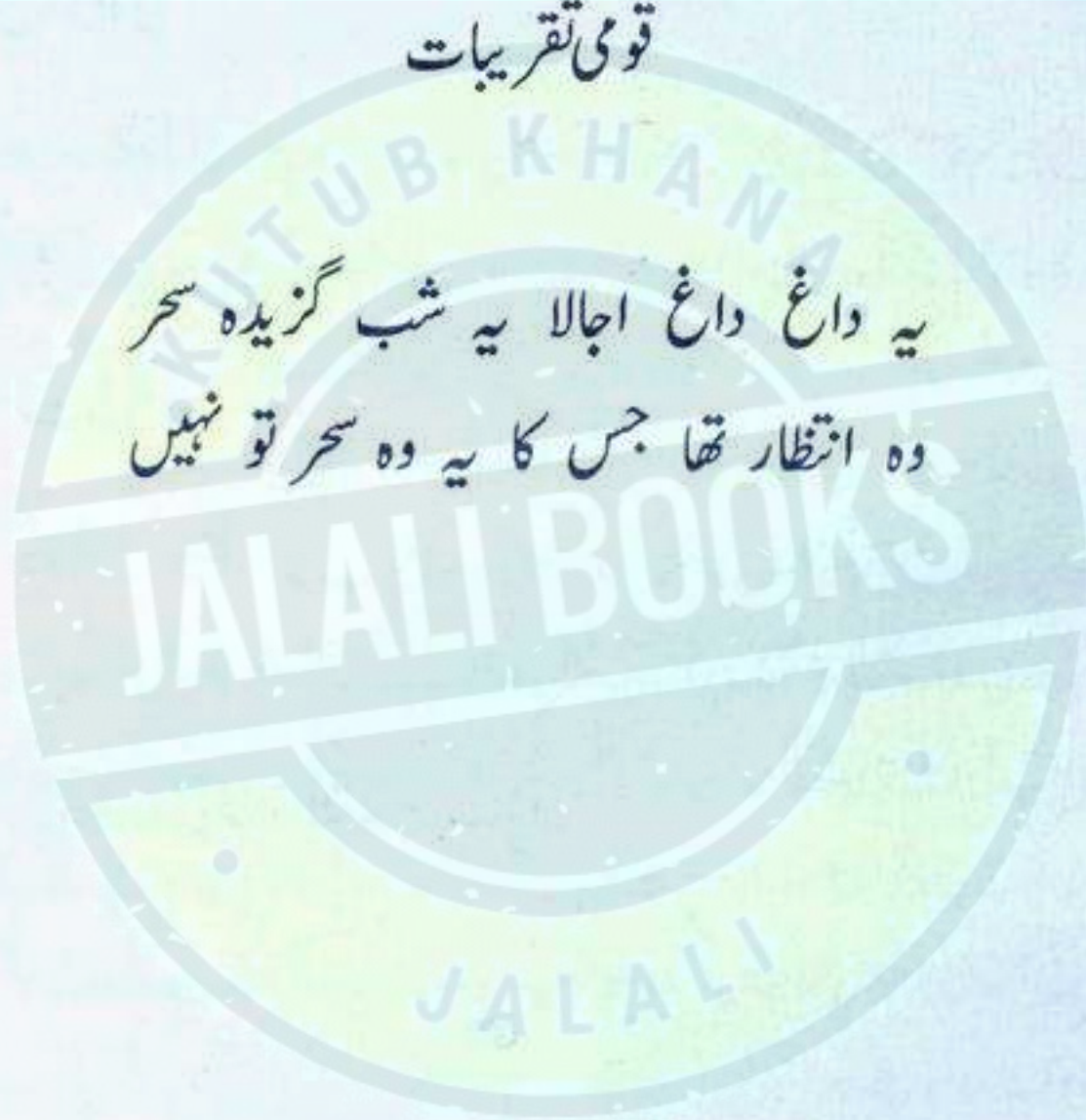
- اک ذرا سوچنے دو
- صبحِ آزادی
- اگست 52ء
- یہ فصل امیدوں کی ہمدم
- اگست 55ء
- جشن کا دن ہے
- خورشیدِ محشر کی لَو
- شرحِ بیدردیٔ حالات نہ ہونے پائی
- دعا

اک ذرا سوچنے دو

فیض صاحب نے یوم آزادی اور یوم پاکستان کے موضوع پر بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں وطن عزیز سے کس قدر لگاؤ تھا۔ حساب لگایئے تو 1947ء سے 1984ء تک اُن کی تقریباً گیارہ نظمیں ایسی ہیں جو یوم آزادی یا یوم پاکستان کے موقعوں پر لکھی گئیں۔

اس سلسلہ کی پہلی نظم تو ''صبح آزادی'' کے عنوان سے ہے جو اردو شاعری کا ایک شاہکار ہے اور جس نے فیض صاحب کی سیاسی شاعری کو شہرت کے بامِ عروج تک پہنچایا۔ اس کے بعد ہر دو دو چار چار سال کے وقفہ سے وہ پاکستان کے قومی دنوں پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے خاص طور پر اُن مرحلوں پر کہ جب ملک اپنی تاریخ کے کسی کڑے وقت سے گزر رہا تھا۔ طلوع آزادی سے زندگی کے آخری لمحات تک فیض صاحب پر جو قیامت گزری اس کی ایک بھی روز مکافات نہ ہونے پائی۔

اگلے صفحات پر اُن کی ایسی تمام نظموں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے جو اُنہوں نے قومی دنوں کے موقعوں پر لکھیں۔ اُن کی تاریخ وار ترتیب اور مختصر پس منظر سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب فیض صاحب نے یہ اشعار لکھے ملک کن حالات سے گزر رہا تھا، دُنیا کا کیا احوال تھا اور خود فیض صاحب کی ذاتی ذہنی اور قلبی کیفیت کیا تھی۔ اُن تاثرات اور گزرے ہوئے لمحات کو یکجا کرنا خود فیض صاحب کے لیے بھی دشوار تھا۔ وہ قومی اور بین الاقوامی صورت حالات کو بیان کرنے سے پہلے کچھ سوچنا چاہتے تھے۔ ایسے ملک کی تاریخ کو اشعار کے سانچے میں ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا جہاں آگ اور خون، رنج اور الم بے رنگی اور بے رونقی کے سوا کچھ نہ ہو۔

اک ذرا سوچنے دو
اس خیاباں میں
جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کون سی شاخ میں پھول آتے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی کونسے موسم میں یہاں خون کا قحط پڑا
گُل کی شہ رگ پہ کڑا وقت پڑا

سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو

یہ بھرا شہر جواب وادئ ویراں بھی نہیں

اس میں کس وقت کہاں

آگ لگی تھی پہلے

اس کے صف بستہ دریچوں میں سے

کس میں پہلے زہ ہوئی سرخ شعاعوں کی کمان

کس جگہ موت جگی تھی پہلے

سوچنے دو.....

یہ کیسے کرب کا مقام ہے کہ اپنے دیس، اپنی زمین اور اپنے لوگوں کی بات کرتے ہوئے شاعر سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا کہے اور کیسے کہے۔

ہم سے اس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو

جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے

لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ اس قدر مایوسی کے باوجود جب فیض صاحب کی یہ ساری نظمیں ایک تواتر میں پڑھی جائیں تو حالات کی سفا کی اور تاریخ کے ناروا سلوک کے باوجود اندر سے ایک طمانیت سی محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ فیض صاحب کے عزم اور حوصلہ کی جھلکیاں ان اشعار میں بھی موجود ہیں۔ فیض صاحب طبعاً رجائیت پسند انسان تھے۔ وہ مایوسی کو کفر سمجھتے تھے اور اُمید اور حوصلے کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

مری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتب وقت نے

کسی اپنے کل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مُسرتیں

فیض صاحب کی زندگی میں جاری وساری یہی فلسفہ ہے جو ان کے شیدائیوں کو پُر اُمید اور پُرعزم رکھتا ہے۔

ہو نہ ہو اپنے قبیلہ کا بھی کوئی لشکر

منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

اُن کو شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے

خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے

دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے

فیض صاحب کی زندگی کے اسی فلسفہ کو سامنے رکھ کر اُن کی اُن ساری نظموں کو ایک ایک کر کے پڑھیے۔ اُن میں ایک تسلسل

بھی ہے اور ربط بھی ہے۔

اُن کی نظم ''اک ذرا سوچنے دو'' 1967ء میں مارچ کے مہینے میں ماسکو میں لکھی گئی۔ اسے اُنہوں نے روسی دانشور آندرے وزنیسن سکی کے نام معنون کیا ہے۔
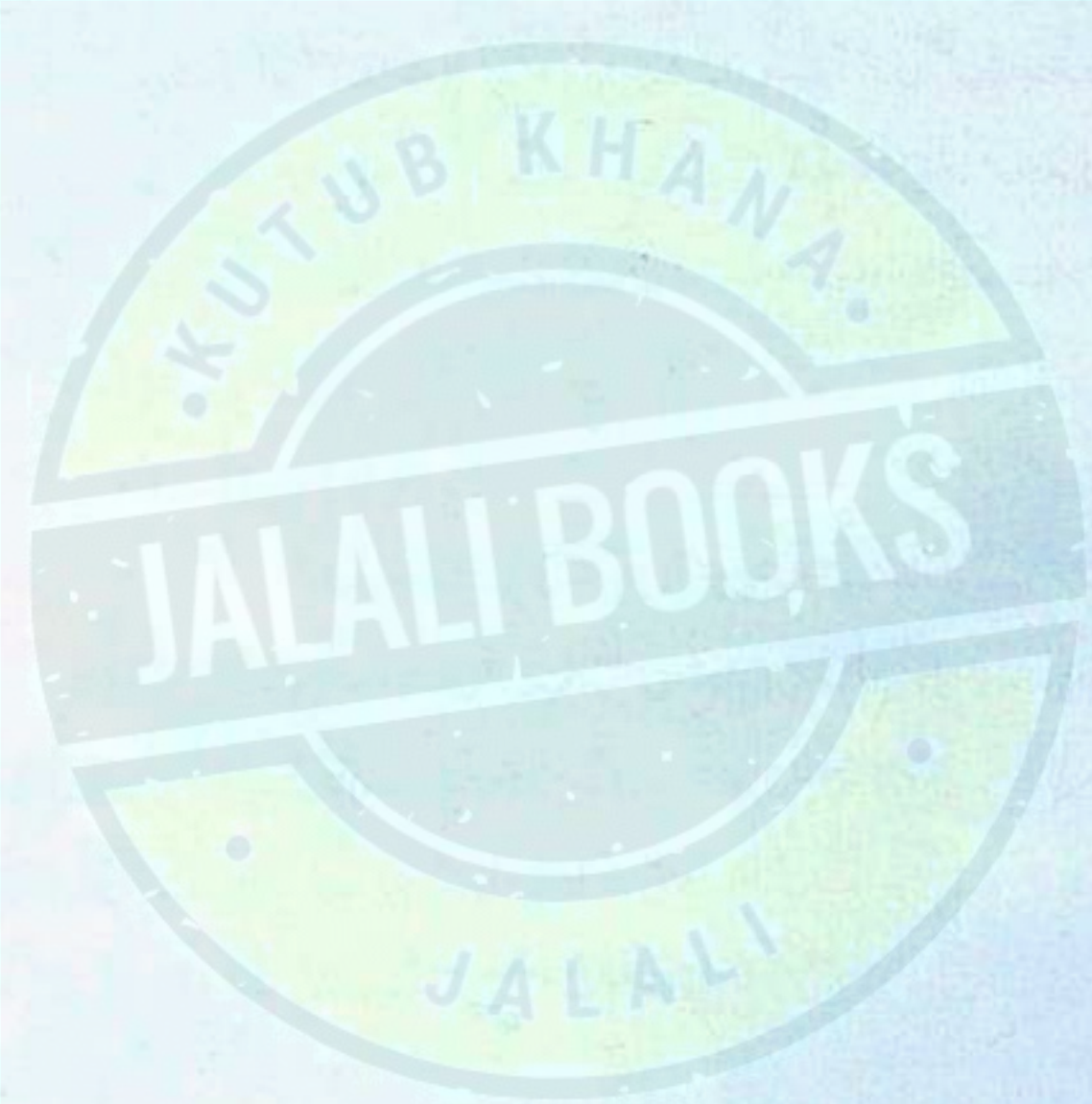
صبحِ آزادی

قیام پاکستان کے بعد یہ فیض صاحب کی پہلی نظم تھی۔

آزادی کی طویل جدوجہد کے بعد 14 اگست 1947ء کو پاکستان ایک آزاد خود مختار مملکت کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ آزادی کی اس جنگ کا آغاز تو ایک صدی قبل اُسی وقت ہو گیا تھا۔ جب فرنگیوں نے آخری مغل تاجدار کو اسیر کر کے جلاوطن کیا اور رنگون کے قید خانے میں محبوس کر دیا۔ مسلمان جنگ ہار چکے تھے۔ ایک جنگ کا اختتام ہو گیا تھا مگر دوسری جنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔ کھوئے ہوئے اقتدار کے حصول کے لیے تحریک کی ابتداء اسی لمحے ہوئی تھی۔ جب مغلیہ سپاہ ندامت سے سر جھکائے دہلی کے لال قلعہ سے نکلی تھی۔

پھر یہ تحریک سر سید احمد خاں، علی برادران، علامہ اقبال اور قائداعظم کی زیر قیادت آگے بڑھتی گئی۔ کبھی تیز رفتاری سے اور کبھی سست قدم۔ قوم کو اپنی منزل کا سُراغ مل گیا تھا اور میر کارواں بھی لیکن ان امن پسند قومی رہنماؤں کے نظریے کے مطابق یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں نہ بے گناہوں کا خوں بہایا جانا تھا اور نہ ہی غریب، مفلس و نادار عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جانا تھا۔ یہ پُرامن جدوجہد تھی۔ جمہوری طرز سے چلائی جانے والی ایک تحریک۔ سب کو یہی اُمید تھی۔ سب کی یہی آرزو تھی۔

مگر ایسا ہو نہ سکا۔ صبح آزادی کا آفتاب خون میں ڈوبا ہوا طلوع ہوا۔ غلامی کے اندھیرے تو فنا ہو گئے تھے مگر آزادی کا اُجالا کہاں تھا۔ فیض صاحب شاید پہلے شاعر تھے جنہوں نے اس موضوع پر اتنی زوردار نظم لکھی۔ اس نظم نے برصغیر کے تمام ادبی اور سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نے، جو فیض صاحب کے بہت قریب تھے، اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

”3 جون کو برصغیر کی تقسیم کا اعلان ہوا۔ کچھ دن بعد گرمیوں کی تعطیلات شروع ہو گئیں۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ اگست کے شروع میں ہم لوگ سرینگر آ گئے اور بند پر ایک ہاؤس بوٹ میں رہنے لگے۔ دریا کے اس پار ایک بنگلہ Harmoney میں ایم ڈی تاثیر اور فیض صاحب کے اہل خانہ مقیم تھے۔ 14 اگست کے دو تین دن بعد فیض صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں اُن سے دوسرے دن تاثیر صاحب کے گھر ملا۔ اس وقت بشیر ہاشمی اور ڈاکٹر نذیر احمد بھی وہاں موجود تھے۔ فیض صاحب نے کسی قدر جھجک کے ساتھ جو بزرگوں کے سامنے کچھ زیادہ ہو جاتی تھی ذکر کیا کہ لاہور میں ایک نظم شروع ہوئی تھی جو سرینگر آتے ہوئے مکمل ہو گئی۔ تاثیر صاحب کے کہنے پر اُنہوں نے پہلی بار یہ نظم سُنائی۔“

ڈاکٹر آفتاب احمد، فیض احمد فیض، شان الحق حقی، افتخار عارف اور احمد مقصود حمیدی

"یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر"

اس نظم پر ایک طرف ترقی پسند اور بائیں بازو کے ناقدین نے انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو دوسری جانب دائیں بازو کے ادیب اور شاعروں نے بھی۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "فیض صاحب کی یہ نظم "یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر سے" سے شروع ہوکر" چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" پر تمام ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ صبحِ آزادی کو"داغ داغ اُجالا" اور" شب گزیدہ سحر" سے تعبیر کرنے پر چیں بہ جبیں ہونے والوں کو اس انداز بیان میں پاکستان سے گہری اٹوٹ محبت کیوں نظر نہ آئی۔ خصوصاً اس زمانے میں جب ریڈکلف کے زخم ہر دل میں تازہ تھے۔ اور ہمارے قائدین انگریز کی عیاری اور غداری کا برملا اظہار کر رہے تھے۔"

آزادی کے ساتھ ہی نوزائیدہ ملک کو طرح طرح کی مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ قوم کو نئی نئی آزمائشیں درپیش تھیں۔

فیض صاحب آزادی سے قبل لاہور میں مقیم تھے اور میاں افتخار الدین کے اخبارات کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ انہوں نے جو کچھ اپنی اس نظم میں کہا تھا اس کی عکاسی اُن کے اخبارات کے صفحات میں بھی ہوتی تھی۔ وہ ملک کی بدلتی ہوئی صورتِ حال سے واقف تھے۔ نہ صرف پاکستانی پنجاب بلکہ وہ مشرقی پنجاب بھی گھوم پھر کر آئے تھے۔ پاکستانی مجاہدوں اور ہندوستانی سورماؤں نے جس طور انسانیت کو ذلیل کیا تھا۔ فیض صاحب نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انہیں دکھ تھا کہ پاگل ہاتھوں نے ہیر رانجھا کی محبت بھری سرزمین میں کشت وخون اور قتل وغارت کی طرح ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے پیارے وطن کی پیاری دھرتی خون سے لال ہوگئی۔ اُنہوں نے لکھا تھا" جب پاکستان کی تشکیل کا دن آیا تو ایک سمت ایک نیا ملک آزادی کی ترنگ میں چراغاں کا اہتمام کر رہا تھا تو دوسری طرف لاتعداد گھروں میں مسرت اور اطمینان کے چراغ گل ہو رہے تھے۔"

اس صورت حال کی عکاسی اتنی مکمل اور اتنی موثر کسی اور شاعر نے نہیں کی جو اس نظم کے حصہ میں آئی ہے۔ بلاشبہ یہ فیض صاحب کی عظیم ترین تخلیق ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ ست موج کا ساحل

کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

☆......☆......☆

اگست 52ء

احوالِ وطن:

یہ زمانہ ملک کے لیے بہت ہیجان انگیز تھا۔ ایک سال قبل ملک کے پہلے وزیرِاعظم کو راولپنڈی میں شہید کر دیا گیا تھا۔ افسر شاہی نے موقع مناسب جان کر اقتدار پر قبضہ جمانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ ملک کے سربراہ کا عہدہ ملک غلام محمد نے حاصل کر لیا۔ وہ لیاقت علی خان کی کابینہ میں وزیرِ خزانہ تھے اور سیاست سے اُن کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کے علاوہ چودھری محمد علی، میجر جنرل اسکندر مرزا جو سرکاری عہدے داروں میں شامل تھے، براہِ راست وزارت اور سیاست میں حصہ دار بنا دیے گئے۔

سیاسی گروہ بندیاں اور صوبائی عصبیت کے عناصر پوری شدت کے ساتھ نمودار ہونے لگے جو رفتہ رفتہ ملک کے اتحاد کو گھن کی طرح کھانے لگے۔ لاہور میں قادیانیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا اور مشرقی پاکستان میں بنگالی کو قومی زبان کا درجہ عطا کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔

اقتصادی زبوں حالی بڑھتی گئی۔ امریکہ نواز پالیسی نے عوام کو حکومت کے خلاف کر دیا۔ مگر امریکہ نے کمال ہوشیاری سے حکومت کو مکمل طور پر امریکی بلاک میں شمولیت پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ جلد ہی امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کو غیر جمہوری طریقے سے ملک کا وزیرِاعظم بنا دیا گیا۔

پاکستان کو قائم ہوئے ابھی پانچ سال کا عرصہ ہوا تھا۔ نوزائیدہ مملکت کی تعمیر کا کٹھن کام درپیش تھا۔ ہر روز نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ اُن کے نئے حل تلاش کیے جا رہے تھے۔

عالمی منظر نامہ:

عالمی سطح پر بھی جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ نوآبادیوں سے سامراجی طاقتوں کی حاکمیت ختم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تیسری دنیا کے چھوٹے بڑے ملک آزاد ہو رہے تھے۔ افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں نئے بلاک اور نئے اتحاد وجود میں آ رہے تھے۔ عرب دنیا ایک نئے تجربے سے گزر رہی تھی۔ بادشاہوں کا عروج ختم ہونے لگا تھا۔ اُن کی

جگہ فوجی آمریتوں نے لینا شروع کر دی تھی۔ مصر میں جمال عبدالناصر اور ایران میں ڈاکٹر مصدق کی سربراہی میں زبردست جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ تہران کی سڑکوں پر طالب علموں کا بے دریغ خون بہایا گیا تھا۔

یہ کون سخی ہیں جن کے لہو کی اشرفیاں چھن چھن چھن

دھرتی کے پیہم پیاسے

کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں

کشکول کو بھرتی جاتی ہیں

تیسری دنیا میں نئے لیڈر نمودار ہو رہے تھے۔ ایک نئے دور کے آغاز کی اُمیدیں پیدا ہونے لگی تھیں۔

کیفیت ذات:

فیض صاحب پسِ دیوارِ زنداں بدلتی ہوئی ملکی اور غیر ملکی صورت حال کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے پندرہ ساتھیوں کے ساتھ حیدر آباد جیل میں تھے جہاں ان پر حکومت وقت کے خلاف سازش کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ سازش کیس کے اسیروں کا مقدمہ اب تقریباً آخری مراحل میں تھا۔ ملزمان کی طرف سے اس کیس کی پیروی معروف قانون دان حسین شہید سہروردی کر رہے تھے۔ لیکن حکومت نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا اور کامیابی کی اُمید بہت کم تھی۔ حالاتِ حاضرہ اور فیض صاحب کے ذاتی کوائف کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر وہ کیا اسباب تھے جس کو مدنظر رکھتے ہوئے فیض صاحب نے یوم آزادی پر لکھی گئی اس نظم میں اُمید کا اظہار کیا تھا۔ ''روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں''۔

میں نے فیض صاحب سے قریبی تعلق رکھنے والے اپنے احباب سے اور اُن کے شاعر دوستوں سے اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی اطمینان بخش جواب نہ دے سکا۔ پھر ایک دن سلیمہ ہاشمی نے میری مشکل آسان کر دی۔ انہوں نے کہا کہ اس انبساط و اطمینان کے موڈ کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کی تبدیلی کے بعد اب اس بات کے کچھ کچھ امکانات پیدا ہو گئے تھے کہ شاید اسیران سازش کیس کی رہائی کی کوئی صورت نکل آئے۔ سلیمہ نے بتایا کہ "اکتوبر 1951 میں ہم لوگ ابا کو ملنے حیدر آباد جیل گئے اور جیل سے متصل ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ اسی ریسٹ ہاؤس میں سہروردی صاحب بھی قیام پذیر تھے۔ ایک شام جب ہم سب باہر لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو سہروردی صاحب آ گئے اور اُنہوں نے ماما کو بتایا کہ ابھی اطلاع آئی ہے کہ تھوڑی دیر پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے جلسہ عام میں خطاب کرتے ہوئے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک صدمہ انگیز خبر تھی۔ ماما حیرت کے ساتھ سہروردی صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔ اُنہوں نے ماما سے انگریزی میں کہا۔

"Mrs Faiz, now I may be able to save your husband"

ماما کے ذریعہ یہ بات ابو کو اور ان کی زبانی ان کے دوسرے ساتھیوں تک پہنچی تو ساری جیل میں اُمید و اطمینان کی لہر دوڑ گئی جو اس وقت تک برقرار رہی جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہ ہوگیا۔ اسی زمانے میں جب آزادی کا دن آیا تو فیض صاحب نے اپنی نظم میں ''بہار کے امکان'' کا ذکر بہت احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پَر افشاں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا، کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لُٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں
اہلِ قفس کی صبح چمن میں کُھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم

احوالِ وطن:

1952ء سے 1955ء کا درمیانی عرصہ ملک میں سیاسی اُکھاڑ پچھاڑ کا زمانہ تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد ہر صورت میں اپنے اقتدار کو طول دینا چاہتے تھے اور جائز ناجائز سارے حربے استعمال کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر خواجہ ناظم الدین جو مسلم لیگ کے صدر بھی تھے، گورنر جنرل کے خلاف آئینی جنگ لڑنے میں مُصروف تھے۔ اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے سندھ ہائی کورٹ میں گورنر جنرل کے حکم کو چیلنج کیا اور جو کالعدم قرار دیے دیا گیا۔ حکومتی اہل کار اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل لے کر پہنچے اور وہاں چیف جسٹس منیر سے اس فیصلہ کو جائز قرار دلوانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ آغاز تھا ''نظریہ ضرورت'' کا۔ یعنی اگر قانون اجازت نہ بھی دیتا ہو تو ملکی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس طرح کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر گورنر جنرل کی یہ فتح دیرپا ثابت نہ ہوئی اور جلد ہی اُنہیں میجر جنرل اسکندر مرزا کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔ نئے گورنر جنرل نے جو اپنے پیش رو کی نسبت کہیں زیادہ ہوشیار تھے، انہوں نے ملک کا سارا سیاسی نقشہ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ محمد علی بوگرہ کی جگہ چوہدری محمد علی کو نیا وزیر اعظم بنایا گیا۔ پاکستان کے مغربی حصہ کے چاروں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا جس کا نام ون یونٹ رکھا گیا۔ اس طرح اب ملک دو صوبوں میں تقسیم تھا مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔

دیگر ملکی معاملات اسی نہج پر چلتے رہے۔ صوبائی انتخابات ہوئے مگر سیاسی جماعتوں کے تبدیل ہو جانے کے باوجود کوئی بڑی تبدیلی عمل میں نہ آئی۔

عالمی منظر نامہ:

عالمی سطح پر یہ سرد جنگ کے عروج کا دور تھا۔ سرد جنگ جو اگرچہ سوشلزم اور جمہوری نظام کے درمیان تھی مگر حقیقت میں سوویت یونین امریکہ کی جنگ بن چکی تھی۔ یورپ میں مشرقی اور مغربی یورپ کی تقسیم عمل میں آچکی تھی۔ مشرق بعید میں کوریا، ہند چینی اور ویت نام میں یہ کش مکش بڑھ رہی تھی اور ایک باقاعدہ خونریز جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ کوریا میں شروع ہونے والی چین اور امریکہ کی جنگ ختم ہوئی تو اس کے نتیجہ میں شمالی اور جنوبی کوریا کی دو مملکتیں وجود میں آئیں اور امریکہ کو بھاری مالی اور جانی نقصان کے بعد جنگ بندی کے سمجھوتے پر دستخط کرنے پڑے۔ اسی طرح فرانس کو شکست کے بعد ویت نام سے رخصت ہونا پڑا۔

سارے ملکوں کے رہنما اس تبدیل ہوتی ہوئی دنیا کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ امریکہ نے زوروشور سے اپنے حواریوں کی مدد کرنا شروع کردی تھی۔ فروری 1955ء میں بغداد پیکٹ کا اعلان ہوا جس میں ایران، ترکی اور پاکستان کو شامل کیا گیا۔ اسی طرح غیر جانبدار ملکوں نے انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں پہلی ایفروایشیائی کانفرنس منعقد کی۔ اس طرح ''تیسری دنیا'' کی اصطلاح سامنے آئی جس میں ایسے ملک شامل تھے جو سرد جنگ میں امریکہ اور روس دونوں میں سے کسی ایک کے بھی طرفدار نہیں تھے۔

کیفیت ذات:

1953ء میں جنوری کے پہلے ہفتہ میں راولپنڈی سازش کیس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ یہ فیصلہ تمام توقعات کے برعکس تھا۔ فیض صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو اس سے شدید صدمہ ہوا مگر اُنہوں نے اپنا حوصلہ بلند رکھا۔ اُسی روز فیض صاحب نے ایلس کو اپنے خط میں لکھا۔ ''اب تک بُری خبر تمہیں پہنچ چکی ہوگی۔ اس سے اپنا دل زیادہ پریشان نہ ہونے دو۔ جس طرح ہم نے پچھلے دو سال گزار لیے یہ بھی گزار لیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت بھی اتنی بُری نہیں ہوتی جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔''

جب تک مقدمہ چل رہا تھا ایک آس تھی۔ اب فیصلہ کے بعد سوچنے اور اُمید کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اُن دنوں فیض صاحب بے حد افسردہ اور ملول رہتے تھے۔ سارے ساتھیوں کو سزا کے اعلان کے بعد مختلف جیلوں میں منتقل کردیا گیا تھا۔ فیض صاحب کو بھی سزا سنانے کے بعد منٹگمری (ساہیوال) جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اُن کی افسردگی کا سبب وہ حالات بھی تھے جو ملک کو درپیش تھے۔ کراچی میں طلباء کے ایک جلوس پر پولیس نے گولی چلادی تھی۔ مشرقی پاکستان میں کرنافلی پیپر ملز کے مزدوروں سے جھڑپ میں بڑی تعداد میں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔

ذاتی سطح پر بھی اُن کو بہت سے صدمات ملے تھے۔ اُردو کے مایہ ناز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اسی سال دنیا سے رخصت ہوئے۔ منٹو کو فیض صاحب خود سے بہت قریب رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے بزرگ دوست اور اُستاد چراغ حسن حسرت بھی لاہور میں انتقال کرگئے تھے۔

اس ذہنی کیفیت میں جب اُنہوں نے 1955ء میں یوم پاکستان اور یومِ آزادی کے موقعوں پر یہ نظمیں لکھیں تو حالات اس سے بالکل مختلف تھے جو تین برس قبل اگست 1952ء کے یوم آزادی کے موقع پر تھے۔

پہلی نظم مارچ 1955ء میں یوم پاکستان کے موقع پر لکھی گئی۔

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو

بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی
کھیتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو

پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اُجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

☆......☆......☆

اگست 55ء

1955ء میں یومِ آزادی کے موقع پر فیض صاحب نے ایک اور نظم بھی لکھی۔

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے
لطف کر اے نگہ یار کے غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے
چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے
دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے
پھر سے بُجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

☆......☆......☆

جشن کا دن ہے

احوال وطن:

1955ء سے 1957ء کے دوران میں بہت سے واقعات اور بہت سے فیصلے ایسے ہوئے جنھوں نے ملکی حالات پر گہرا اثر ڈالا۔ مغربی پاکستان کے نام سے نیا صوبہ تشکیل دیا گیا اور مشرقی بنگال کا نام بدل کر مشرقی پاکستان کر دیا گیا۔ یہ کام محمد علی بوگرہ کے بعد آنے والے وزیر اعظم چوہدری محمد علی کے دور حکومت میں ہوا۔

چوہدری محمد علی کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ آزادی کے نو سال بعد وہ پاکستان کی قومی اسمبلی سے ملک کے آئین کا مسودہ پاس کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دستور تاریخ میں 1956ء کے آئین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس روز دستور کی منظوری کا اعلان ہوا سارے ملک میں ایک جشن کا سماں تھا۔ میں ان دنوں ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر تھا اور اس سلسلہ میں منعقد ہونے والی ساری تقریبات کی ریڈیو کوریج کرنے پر میری ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ لہٰذا میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ مناظر دیکھے جب قومی اسمبلی کے اسپیکر عبدالوہاب خان کی قیادت میں ارکان اسمبلی کا جلوس آئین کی کاپیاں ہاتھوں میں اُٹھائے گورنر جنرل ہاؤس گئے جہاں اسکندر مرزا نے سب کی موجودگی میں اس مسوّدے پر دستخط کر کے ملک کو برطانوی Dominion Status سے جمہوریہ پاکستان میں تبدیل کر دیا۔

لیکن آئین کے پاس ہو جانے کا ملکی سیاست پر کوئی خاص مثبت اثر نہیں پڑا۔ محلاتی سازشوں کا زور کم نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں اسکندر مرزا کے اشارے پر ریپبلکن پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی گئی، جس کی جانب سے ڈاکٹر خان صاحب کو مغربی پاکستان کا پہلا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ مرکز میں وزیر اعظم کے عہدے کے لیے اُکھاڑ بچھاڑ کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک سال کے قلیل عرصہ میں یکے بعد دیگرے مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈر وزیر اعظم بنتے اور ہٹتے رہے۔

عالمی منظر نامہ:

عالمی سطح پر جو اہم واقعات رونما ہوئے ان میں نہر سویز پر برطانیہ اور فرانس کا مشترکہ حملہ اور اس کے جواب میں ملک کے نئے جواں سال اور حوصلہ مند صدر جمال عبدالناصر کا نہر سویز کو قومیانے کا فیصلہ بہت اہم ہیں۔ اسرائیل نے بھی موقع سے فائدہ اُٹھا کر مصر کے خلاف جنگ شروع کر دی مگر جمال عبدالناصر کی قیادت میں اب عرب نیشنلزم کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ لہٰذا ان بدلے ہوئے

حالات میں عوام کی خواہشات کے خلاف فیصلہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً فرانس اور برطانیہ کو اپنا قبضہ اُٹھانا پڑا اور نہر سویز کو مصر کی ملکیت میں دے دیا گیا۔ اُدھر ایران میں بھی ڈاکٹر مصدق کی سوشلسٹ پارٹی کو عوام کی پُر زور حمایت حاصل ہوگئی اور شہنشاہِ ایران اور امریکہ کے دباؤ کے باوجود وہ تیل کی صنعت کو قومیانے میں کامیاب ہوگئے۔

کیفیت ذات:

1955ء میں تمام اسیرانِ راولپنڈی کیس کو بری کر دیا گیا۔ فیض صاحب بھی چار سال سے زیادہ کا عرصہ اپنے خاندان اور گھر والوں سے دور گزار کر لاہور واپس آ گئے۔ انہیں ایک بار پھر ''پاکستان ٹائمز'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ لیکن وہ پہلے والی بات نہیں تھی۔ اخبار میں فیض صاحب کی دلچسپی اب ویسی نہیں رہی تھی جیسی پہلے تھی۔ وہ خود اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ کام کم اور فراغت زیادہ ہے۔ وہ اپنے احباب سے بھی کچھ بیگانہ ہو گئے تھے۔ شاید لاہور شہر کو جو اُن کا اپنا شہر تھا انہیں دوبارہ accept کرنے میں ابھی کچھ دقت پیش آ رہی تھی۔ فیض صاحب پر سکوت طاری تھا۔ اُن کی زندگی کی چہل پہل ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ وہ شعر کہتے رہے مگر اُن کی شاعری میں اُداسی اور مایوسی کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا۔

بیزار فضا درپئے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

اس عرصہ میں فیض صاحب کو ہندوستان اور چین کے دوروں پر جانے کا بھی اتفاق ہوا اور انہوں نے چین کے شہروں پر بہت اچھی نظمیں بھی لکھیں لیکن ابھی وہ پہلی والی کیفیت نہیں تھی۔ پھر 23 مارچ 1956ء کا دن آ گیا۔ ملک بھر میں آئین کی منظوری کا جشن منایا گیا۔ فیض صاحب نے بھی اس موقع پر جشن منایا مگر ذرا مختلف انداز سے۔

یہ چھوٹی سی نظم شاید ان کے مخصوص طرز ادا کی طرف مراجعت کا اشارہ تھا۔

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے
طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے
تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے
ہے انتظار ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے
وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

☆......☆......☆
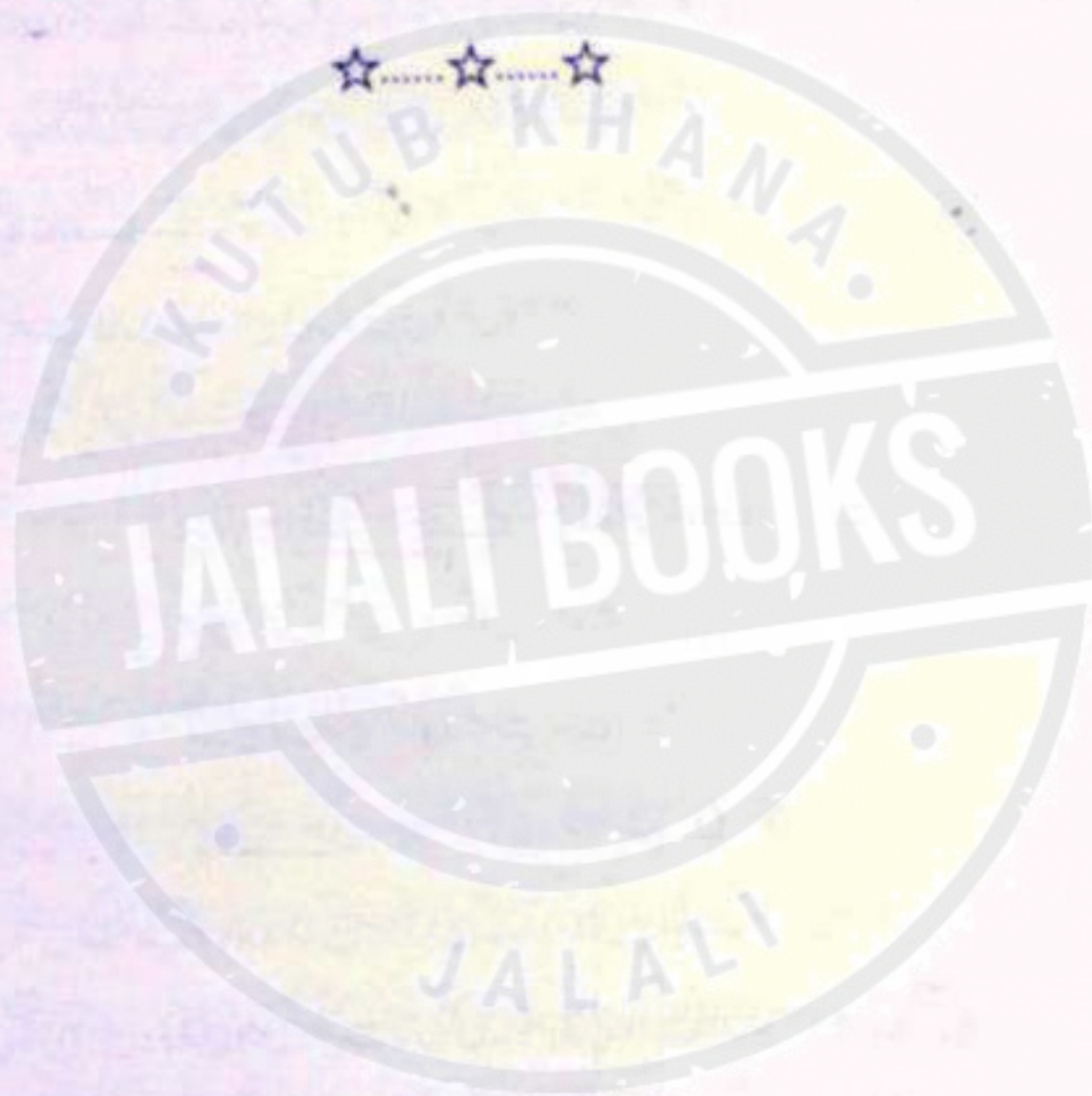
خورشیدِ محشر کی لو

سن تصنیف مارچ 1969ء

احوال وطن:

1969ء میں جب صدر ایوب خان دستوری اور قانونی طریقوں سے امن وامان بحال کرنے میں ناکام ہوگئے تو مارچ کی 25 تاریخ کو انہوں نے صدارت چھوڑ دی اوران کے جانشین آغا یحیٰی خان نے دوسرے مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے 1962ء کا آئین منسوخ کر دیا۔ سارے ملک میں بنیادی حقوق معطل کر دیے۔ یہ امر انتہائی قابلِ افسوس ہے کہ ایوب خان نے خود ہی اپنے بنائے ہوئے دستور کی بالادستی کو تسلیم نہیں کیا اور قومی اسمبلی کے اسپیکر کی بجائے بری فوج کے کمانڈر انچیف کو اقتدار سپرد کر دیا۔ انہوں نے اپنے ماتحت جنرل کو ایک خط لکھا جو ان کی بزدلی اور نااہلی کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔

یحیٰی خاں نے دو تین بڑے کام اپنے ذمہ لئے اور بڑی حد تک ان کی تکمیل بھی کی۔ پہلا کام تو یہ کہ انہوں نے "ون یونٹ" کو توڑ دیا اور مغربی پاکستان کے پرانے صوبوں کو بحال کر دیا ان کا دوسرا بڑا کام 1970ء میں عام انتخابات کا انعقاد تھا۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر سارے ملک میں منصفانہ اور غیر جانبدارانہ الیکشن کرائیں گے۔ یہ وعدہ انہوں نے پورا کر دیا۔ لیکن عام انتخابات کے بعد کیا ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے۔

ملک کا سیاسی منظر نامہ تیزی سے بدل رہا تھا۔ دس سال قبل جب ایوب خاں نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا تو حالات کچھ اور تھے۔ یہ حسین شہید سہروردی، خواجہ ناظم الدین، خان عبدالقیوم خان، عبدالغفار خاں، ممتاز دولتانہ جیسے سیاستدانوں کا دور تھا۔ لیکن یحیٰی خان کے زمانے میں بساطِ سیاست پر نئی قیادتیں نمودار ہو چکی تھیں۔ یہ نسبتاً جواں سال سیاسی رہنماؤں کا دور تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمان، ائر مارشل اصغر خاں جیسے نئے نئے لیڈر سامنے آرہے تھے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا دور ہے ساز بدلے گئے

عالمی منظر نامہ:

دنیا کے حالات بھی نئی صورت اختیار کر رہے تھے۔ امریکہ اور روس کی سرد جنگ میں اب ایک تیسرا فریق بھی شامل ہو گیا تھا۔ یہ تھا دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ''عوامی جمہوریہ چین''..... اگرچہ چین ایک اشتراکی ملک تھا مگر روس اور چین کے اشتراکی فلسفوں میں بھی اختلاف تھا اور اسی بنا پر کمیونسٹ دنیا بھی دو دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ روس کے طرفدار ''مارکسٹ'' کہلاتے تھے اور چین کے حامی ''ماؤسٹ''۔ امریکہ اور روس کی تو کھلی جنگ تھی مگر چین کو امریکہ اور اس کے حواریوں میں بین الاقوامی سطح پر ابھی کوئی کردار ادا کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ یہ اتنا بڑا ملک اقوامِ متحدہ کا رکن بھی نہیں تھا..... یحییٰ خان کے دور میں ایک اہم پیش رفت اس سلسلہ میں یہ ہوئی کہ پاکستان کے توسط سے امریکی وزیر خارجہ پاکستان کے راستے بیجنگ گئے اور یوں ان دو عظیم ملکوں میں اعلیٰ سطح پر پہلا بڑا رابطہ کرانے کا سہرا پاکستان کے سر رہا۔

مشرقِ بعید میں ویت نام کی جنگ زوروں پر تھی اور حریت پسندوں نے امریکی افواج کا قافیہ تنگ کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ میں بھی ایک بار پھر جنگ کا بازار گرم ہونے کو تھا۔ اسرائیل بڑے پیمانے پر عرب ملکوں کی سرزنش کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

کیفیت ذات:

یہ زمانہ فیض صاحب کے لئے نسبتاً فرصت اور فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ وہ ان دنوں کراچی میں مقیم تھے اور سر عبداللہ ہارون کالج میں بحیثیت پرنسپل کام کر رہے تھے۔ فیض صاحب اس زمانے میں بڑی حد تک مطمئن تھے۔ ان کی زندگی بھر یہ خواہش رہی کہ درس و تدریس کے کام میں لگے رہیں اور اب ان کو اپنی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کا موقع ملا تھا۔

یہ ایوب خاں کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ ان کے زوال کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ماحول پر ایک جان لیوا سناٹا طاری تھا۔ فیض صاحب نے انہیں حالات کی عکاسی کرتے ہوئے بہت سے خوبصورت اشعار لکھے۔

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اسی دور میں انہوں نے اپنی مشہور نظم ''یہاں سے شہر کو دیکھو'' بھی لکھی۔

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل

اور ایک اور غزل نما نظم

گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

مایوس کن سیاسی حالات کے علاوہ فیض صاحب کو اس دور میں کچھ ذاتی صدموں سے بھی دوچار ہونا پڑا جس میں ان کی عزیز دوست لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون کی موت بھی شامل ہے۔

دور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے
اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے

ان ذاتی اور قومی حالات کے پس منظر میں انہوں نے 1969ء کے یومِ پاکستان کے موقع پر یہ نظم لکھی۔

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن
کُھل کے ہنسنے کے دن، گیت گانے کے دن
پیار کرنے کے دن، دل لگانے کے دن

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

آج کا دن زبوں ہے، مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے، مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پرانے نشاں
سب چلے سُوئے دل کارواں، کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں
سے اُٹھے نالۂ الاماں، الاماں

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
ازکراں تاکراں کب تمہارے قدم
لے کے اُٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں ڈھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم سارے جور و ستم
دُور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لَو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

☆......☆......☆

شرحِ بیدردیٔ حالات نہ ہونے پائی

مارچ 1971ء

احوالِ وطن:

1971ء شاید ہماری تاریخ کا سب سے المناک سال ہے۔ 1947ء میں وجود میں آنے والا ملک اب آخری دموں پر تھا۔ سانس اکھڑ رہی تھی اور جلد یا بدیر یہ آس بھی ختم ہو رہی تھی۔

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

1970ء کے الیکشن تو یقیناً جنرل یحییٰ خاں نے شفاف اور منصفانہ کرا دیے تھے لیکن اس کے بعد کے حالات نے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا تھا۔ نہ تو اس الیکشن میں منتخب ہونے والی قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو سکا اور نہ ہی دو بڑی سیاسی جماعتیں اسمبلی سے باہر کسی سمجھوتے پر پہنچ سکیں۔

مشرقی پاکستان میں شورش اسقدر بڑھی کہ حکومت کے لئے حالات کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں رہا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے صوبے کے کمانڈر کو آرمی ایکشن لینے کا حکم دے دیا۔ یہ ایکشن 23 مارچ سے شروع ہوا۔ غالباً اسی سے متاثر ہو کر فیض صاحب نے یہ نظم لکھی جو یومِ آزادی کے موقعوں پر لکھی جانے والی نظموں کے سلسلہ کی آخری نظم ہے۔ اس کے بعد متحدہ پاکستان نے نہ کوئی یومِ پاکستان منایا اور نہ یومِ آزادی۔۔ اور فیض احمد فیض نے بھی پھر کوئی نظم نہ لکھی۔ شاید ہمارا شاعر بہت دل گرفتہ ہو گیا تھا۔ اس نے جس پاکستان کے خواب دیکھے تھے وہ تو دسمبر 1971ء میں ختم ہو چکا تھا۔ پھر وہ قومی نظمیں کس لئے لکھتا.....!

فیض صاحب کی نظروں کے سامنے اب تیرگی اور مایوسی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ ساری آرزوئیں اور تمنائیں جن کو انہوں نے اب تک سنبھال کر رکھا تھا ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں۔ پچیس سال کے طویل عرصہ تک وہ ہر ناکامی پر دل کو یہی سہارا دیتے رہے کہ شاید اب بھی حال سدھر جائے گا مگر ان کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یوں ہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی سمجھے کہ بہار آئی

یک جان نہ ہو سکیئے انجان نہ بن سکیئے
یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیرِ شناسائی
اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی

ملک میں اندرونی خلفشار اور شورش نے جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ بنگالی حریت پسند جو ''مکتی باہنی'' کے نام سے مشہور ہوئے ہندوستانی فوج کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کے ہر محاذ پر پاک فوج سے معرکہ آرائی کرنے لگے اور تاریخ میں پہلی بار ایک اسلامی ملک کی اتنی بڑی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں پاکستانی کمانڈر کو شکست کی دستاویز پر دستخط کرتے دیکھا وہ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے اور ان چیخوں اور آہوں کے جلو میں ''بنگلہ دیش'' کی آزاد مملکت وجود میں آگئی۔ شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کی قرارداد کے نتیجے میں قائم ہونے والا ''پاکستان'' دولخت ہو گیا۔ یہ المیہ ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ مگر اس ڈرامے کا یہ بڑا کمال بھی تھا کہ ڈرامے کے چاروں بڑے (Major) کرداروں میں ایک بھی مثبت کردار (Protaganist) نہیں تھا۔ جنرل یحییٰ خاں، ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمان اور اندرا گاندھی یہ سارے منفی کردار (Antigonist) تھے۔ عجیب بات ہے صدیوں سے برتے جانے والے ڈرامے کے سارے قواعد اور سارے قانون یہاں آ کر بدل گئے۔

عالمی منظر نامہ:

1971ء پر نظر ڈالیں تو دنیا میں ہر طرف جھوٹ، فریب اور وعدہ خلافیوں کا زور نظر آتا ہے۔ بڑی طاقتیں سازشوں اور جھوٹے وعدوں پر تعمیر کی جانے والی پالیسیوں پر عمل پیرا تھیں۔ روس نے ساری اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان سے ایک طویل المیعاد معاہدہ کیا جس کے تحت اس نے پاکستان کے ساتھ جنگ میں ہندوستان کی بھرپور مدد کی..... امریکہ نے حسب روایت پاکستان سے کئے گئے اپنے سارے وعدے توڑ دیے۔

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ مرگ عام ہوتی رہی

اقوام متحدہ نے بار بار منافقت اور بے انصافی پر مبنی قراردادیں پاس کیں جو آخر کار بنگلہ دیش کی قانونی اور آئینی مملکت کے قیام کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔

کیفیت ذات:

فیض صاحب مایوس اور غم زدہ تھے۔ ان کی ہر آس اور امید ٹوٹ چکی تھی وہ گزشتہ چند مہینوں میں بار بار اہلِ اقتدار کو یاد

دلاتے رہے کہ جوراہ انہوں نے منتخب کی ہے وہ تباہی اور بربادی کی راہ ہے۔ وہ آنے والے وقت سے نادان حکمرانوں کو ڈراتے رہے۔

حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

مگر جب آنکھیں آہن پوش ہو جائیں تو پھر ایمانداری اور راست بازی کی روشنی کہاں نظر آتی ہے۔

جب خونِ جگر برفاب بنا　　جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدہ تر کا کیا ہوگا　　اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے　　نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے　　اس کاخ گہر کا کیا ہوگا

ہمارا شاعر شعر کہتا رہا۔ وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا مگر کسی نے اس کی آواز پر دھیان نہ دیا اور پورے پاکستان کا چاند گہن کھا کر آدھا رہ گیا۔

شرح بیدردی حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا!
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

پھر وہ پروانے جنہیں اذنِ شہادت نہ ملا
پھر وہ شمعیں کہ جنہیں رات نہ ہونے پائی

پھر وہی جاں بہ لبی لذّتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

پھر دمِ دید رہے چشم و نظر دید طلب
پھر شب وصل ملاقات نہ ہونے پائی

پھر وہاں بابِ اثر جانیے کب بند ہُوا
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی

فیضؔ سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری
ایک بھی روزِ مکافات نہ ہونے پائی

☆......☆......☆
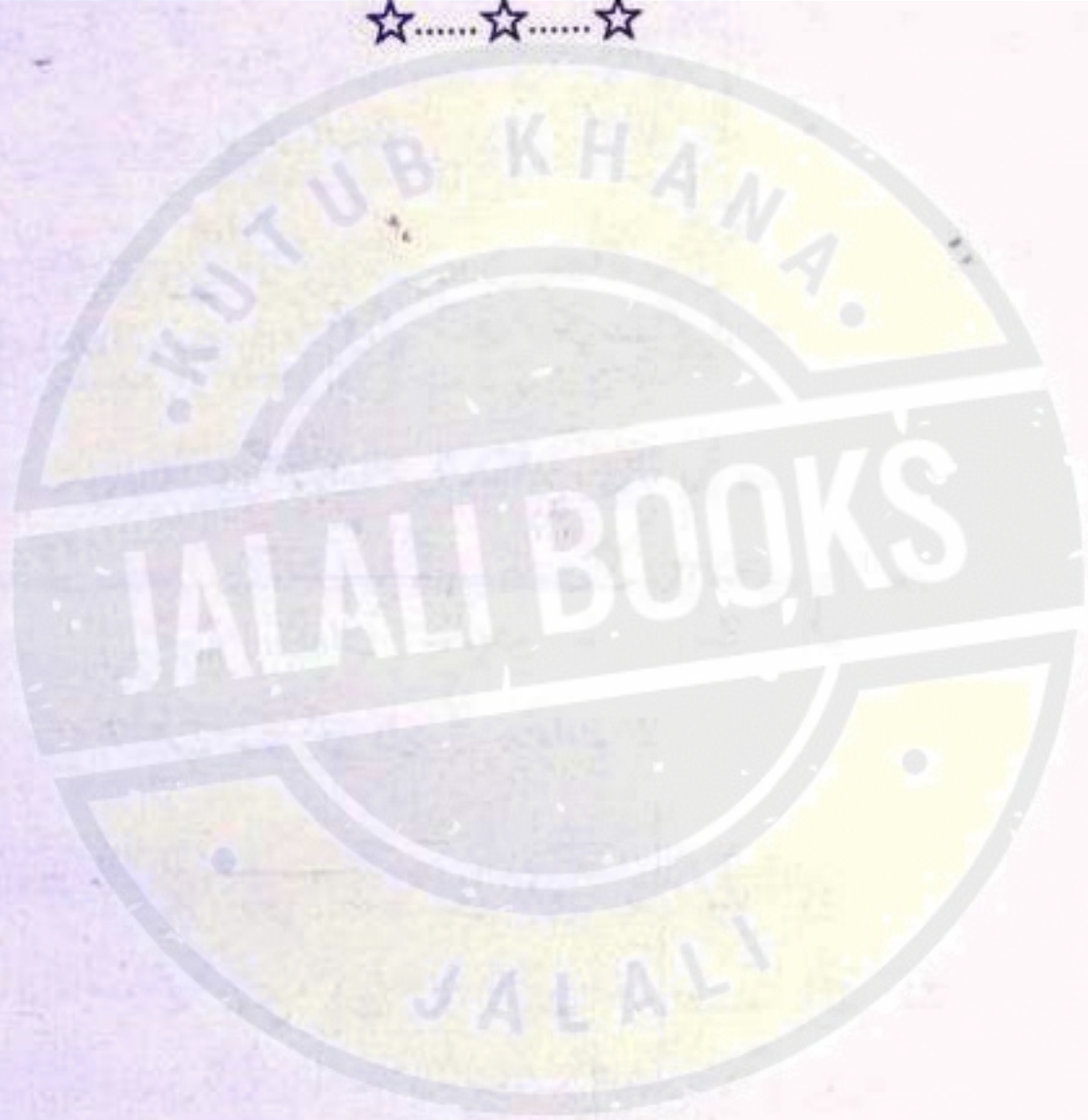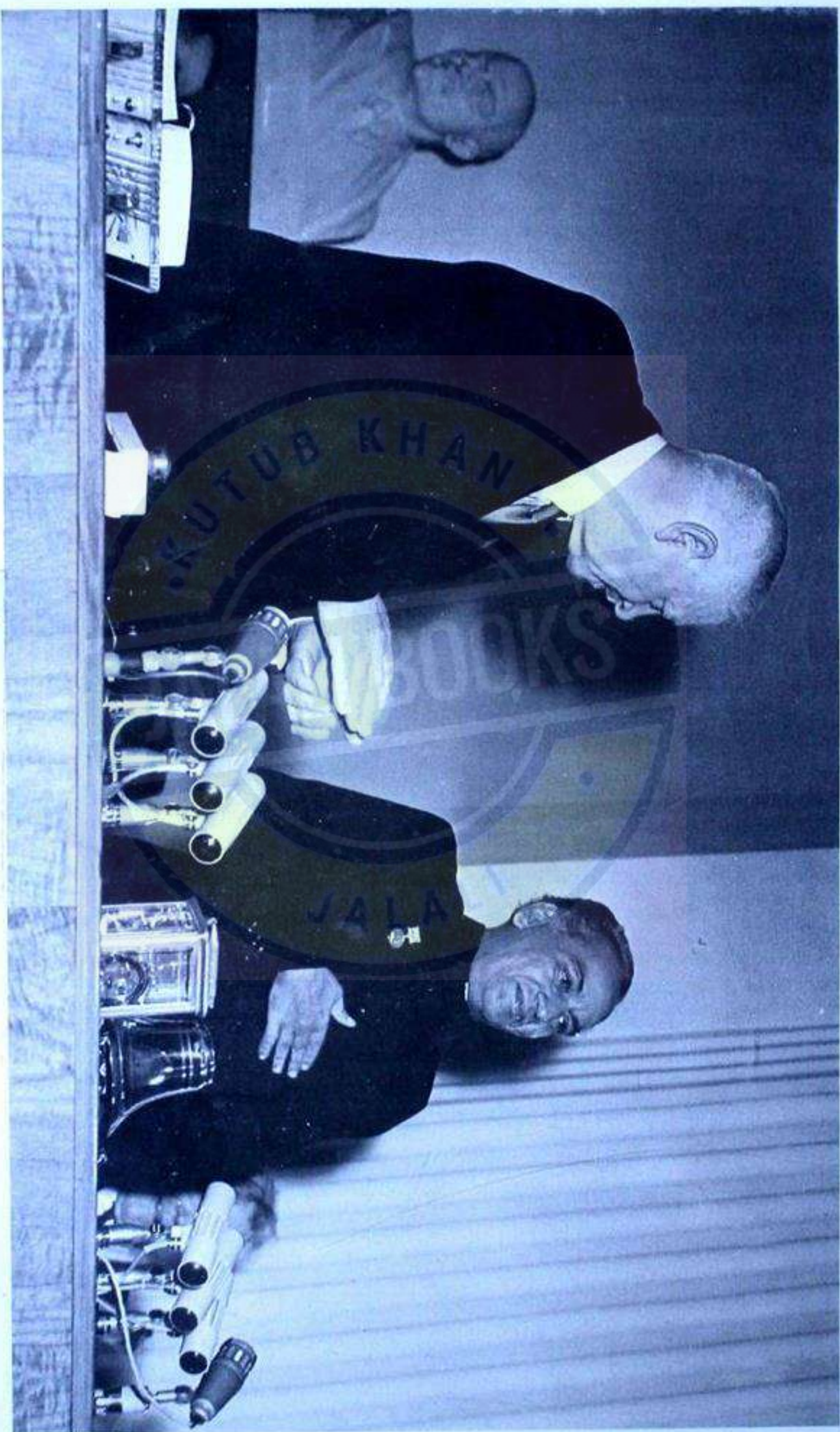
لینن امن انعام کی تقریب ــــ ماسکو

دعا

1973ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے مشترکہ طور پر ایک آئین کی منظوری دی۔ یہ ایک بڑا معرکہ تھا جس کا سہرا پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے سر جاتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ملک کی ساری بڑی جماعتوں کے قائدین ایک فیصلہ پر متفق ہوئے۔ اس آئین پر ملک کی ساری چھوٹی بڑی جماعتوں نے دستخط کئے۔ یہ قوم کے لئے۔ ایک بڑا یادگار دن تھا اور اس کی خوشی منانے کے لئے سارے ملک میں جشن کا اہتمام کیا گیا۔ ظاہر ہے حسبِ روایت قومی ریڈیو اور ٹیلی وژن رنگا رنگ پروگرام ترتیب دینے میں پیش پیش تھے۔

ہم نے پاکستان ٹیلیویژن پر اور بہت سے پروگراموں کے علاوہ ایک کل پاکستان محفلِ مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا۔ اس محفل میں پاکستان کے تقریباً سارے ہی نامور شعراء شریک ہوئے، جن میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ جب وہ مشاعرہ پڑھنے آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اس قومی اہمیت کے دن کی مناسبت سے مشاعرہ میں کیا سنائیں گے۔ فیض صاحب نے جواب دیا کہ بھئی ہمیں ترانے ورانے لکھنے تو آتے نہیں ہیں۔ البتہ ایسے خاص موقعوں کے لئے ہمارے پاس ایک ہی چیز ہے۔ وہ ہم پہلے بھی سناتے رہے ہیں، سو آج بھی سنائیں گے۔ ہم اسی کو اپنی قومی شاعری سمجھتے ہیں۔

فیض صاحب نے اپنی معروف نظم ''دعا'' مشاعرہ میں پڑھی جو یقیناً قومی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔

یہ نظم فیض صاحب نے 1967ء کے یومِ آزادی کے موقعہ پر لکھی تھی۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ صدر ایوب کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے مشیروں کے کہنے پر سارے ملک میں اپنی حکومت کے دس سال پورے ہونے پر ایک ''عشرہ اصلاحات'' منانے کا اہتمام کیا تھا۔ اس دس سالہ جشن کو منانے کے لئے بڑے پیمانے پر تیاری کی گئی تھی۔ اہلِ حکومت خوش تھے مگر درحقیقت یہ جشن ایوب خان کے اقتدار کے کفن میں آخری کیل ثابت ہوا۔ پریشان حال، مجبور اور غربت و افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کے ساتھ یہ ایک بڑا سنگین مذاق تھا۔ اب انہوں نے کُھل کر ''آمریت'' کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمان نے جبکہ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور اصغر خان نے اس جشن کے خلاف ایسی زوردار تحریک چلائی کہ ایوانِ اقتدار کانپ اٹھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ لیڈروں کی تقریریں سن سن کر عام آدمی کے دل سے بھی ایوب خان کا خوف نکل گیا یہاں تک کہ شادی بیاہ کی تقریبوں میں مراثیوں نے بھی برسرِ عام نئے نئے لطیفے سنانا شروع کر دیے۔ ایک لطیفہ جو بہت مشہور ہوا

وہ پاکستان کے ڈاک کے ٹکٹوں (Post stamps) کے بارے میں تھا، جو ''جشنِ دس سالہ'' کے موقع پر جاری کیے گئے تھے۔ ڈاک کے ان ٹکٹوں پر صدرِ پاکستان کی تصویر تھی۔ لطیفہ کچھ اس طرح تھا کہ جب ایوب خان کو یہ شکایت پہنچی کہ لوگ ڈاک کے یہ خصوصی ٹکٹ نہیں خرید رہے ہیں تو انہوں نے اپنے مقرب خاص الطاف گوہر کو ہدایت کی کہ اس سلسلہ میں تحقیقات کریں اور رپورٹ پیش کریں کہ آخر کیوں لوگ یہ اسٹامپ نہیں خریدنا چاہتے۔ تحقیقات ہوئی اور جو رپورٹ سامنے آئی اس کے مطابق اسٹامپ نہ خریدنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ اسٹامپ چپکانے کے لئے ٹکٹ کے الٹے رخ پر تھوکتے تھے جدھر ایوب کی تصویر تھی لہٰذا ٹکٹ چسپاں نہیں ہوتا تھا۔

ایک اور بڑا دلچسپ واقع مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے شوہر ماجد علی سناتے تھے۔ وہ وزارت خزانہ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ان دنوں سارے شہر میں ہنگاموں کا زور تھا اور دن رات جلوس نکلتے رہتے تھے، جس میں سرکار کے خلاف نعرے لگائے جاتے۔ ان نعروں میں ایک نعرہ یہ بھی تھا۔ ''ایوب کے چمچے ہائے ہائے'' ایک روز ماجد بھائی وزیر خزانہ کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ باہر سے نعروں کی آواز آنے لگی ''ایوب کے چمچے ہائے ہائے'' وزیر خزانہ نے جو غالباً بنگالی تھے ان سے دریافت کیا یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟

ماجد بھائی نے جو اپنی حاضر جوابی کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے، برجستہ کہا ''سر آپ اُدھر دھیان نہ دیں۔ یہ لوگ کچھ کراکری کا ذکر کررہے ہیں۔''

مدعا یہ کہ اقتدار کی کشتی جب ہچکولے کھانے لگتی ہے تو خواص وعوام سب ہی ان تحریکوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ ان حالات میں جب آزادی کا دن آیا تو فیض صاحب کے ہاتھ بے اختیار دعا کے لئے اُٹھ گئے۔

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں

دعا ہماری دینی اور تہذیبی روایت کا ایک لازمی جُز ہے۔ اللہ کے پہلے نبی ابراہیم علیہ السلام سے لیکر ہمارے رسول ﷺ تک کوئی نہ کوئی دعا ہر پیغمبر سے منسوب ہے۔

حضرت امّ معبد سے روایت ہے کہ میں نے اکثر رسول اللہ ﷺ کو یہ دعا کرتے سنا:

''الٰہی پاک کردے میرے دل کو نفاق سے اور عمل کو ریا سے، اور زبان کو جھوٹ سے اور آنکھ کو خیانت سے چونکہ تو آنکھ کی چوری اور سینوں کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔''

دعا کو ہمارے شاعروں نے بھی بڑی اہمیت دی ہے۔ خود علامہ اقبال کی شاعری جابجا دعائیہ اشعار سے بھری پڑی ہے۔ ان کی شاعری میں ''بچے کی دعا'' سے لیکر ''طارق کی دعا'' کے علاوہ دوسری اور بہت سی نظموں میں بھی دعائیہ اشعار شامل ہیں۔ مثلاً ''ساقی نامہ'' کے ان اشعار کی دلسوزی قاری کا دل اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

مری ناؤ گرداب سے پار کر
میں ثابت ہوں تو اس کو سیّار کر
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اقبال کی نظم کی طرح فیض صاحب کی نظم بھی سوز و گداز اور حسن کاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ مگر نظم سے پہلے یہ چھوٹی سے دلچسپ حکایت جو میں نے ایوب مرزا کی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' سے مستعار لی ہے۔ فیض صاحب کی بڑی بیٹی سلیمہ ہاشمی نے اس کتاب کے پرولاگ میں یوں لکھا ہے۔

''میرے ڈیڈی کمال کے آدمی ہیں۔ ایک دن سویرے سویرے سب کو اکٹھا کرلیا۔ کہنے لگے دعا مانگو...سب حیران تھے ڈیڈی کو کیا ہوگیا ہے نہ آگے نہ پیچھے۔ یہ آج انہیں دعا کی کیا سوجھی...میں نے کہا ڈیڈی نماز تو پڑھی نہیں پھر دعا کیوں مانگیں۔ بس ڈیڈی کسی کی سنتے تھوڑا ہی ہیں نہ سرکار کی نہ پٹوار کی...اور پھر شروع ہوگئے...

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی

پوری نظم سن کر ممی کچن سے بولیں..... ''فیض یہ بہت اچھا ہے، یہ ایوب کو سناؤ''۔
مگر میں سوچ میں پڑ گئی۔ بہت دیر تک سوچتی رہی، یہ جرأت تحقیق کیا چیز ہوتی ہے؟۔

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنہیں تابِ گراں بارئ ایام نہیں

اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

☆......☆......☆

طوق و دار کا موسم

ایامِ اسیری

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

- ترانہ
- رنگِ پیراہن کا
- نثار میں تری گلیوں کے
- زنداں کی ایک شام
- زنداں کی ایک صبح
- اے حبیبِ عنبر دست
- بنیاد کچھ تو ہو
- ہم خستہ تنوں سے
- آج بازار میں پابہ جولاں چلو

ترانہ

9 مارچ 1951ء کو پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے پاکستان کے دشمنوں کی ایک سازش پکڑی گئی ہے۔ اس سازش کا مقصد یہ تھا کہ تشدّد کے ذریعہ ملک میں انتشار اور افراتفری پھیلائی جائے اور اس کے حصول کی خاطر افواج پاکستان کی وفاداری کو بھی ملیا میٹ کر دیا جائے۔ حکومت کو ان ناپاک ارادوں کا بروقت علم ہو گیا چنانچہ اس سازش کے سرغنوں کی گرفتاری آج ہی عمل میں آئی ہے۔

اس سازش کے الزام میں چودہ مرد اور ایک عورت کو گرفتار کیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں قابل ذکر نام میجر جنرل اکبر خان، بیگم نسیم اکبر خاں، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر وغیرہ کے تھے۔ ان پر مقدمہ چلانے کے لیے حیدر آباد جیل کا انتخاب کیا گیا۔ اس مقدمہ کے لیے جیل ہی میں ایک عدالت قائم کر دی گئی تھی جس نے سارے گواہوں کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد جنوری 1953ء کو اپنا فیصلہ سنایا۔

مقدمہ کے دوران جب سازش کے ملزمان حیدر آباد جیل میں مقیم تھے۔ انہوں نے بڑے صبر اور جرأت مندی کے ساتھ یہ وقت گزارا۔

قید کے زمانے میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے فیض صاحب نے کچھ نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول وہ ترانہ تھا جو انہوں نے جیل کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں لکھا۔ اُن کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ اسیری کے دنوں میں اُن کو جس چیز نے سب سے زیادہ حوصلہ دیا وہ یہ ترانہ تھا۔ یہ ترانہ جبر اور فریب کی قوتوں کے خلاف ایک حساس انسان کا احتجاج ہے۔ ایک ایسا احتجاج جو عزم اور رجائیت سے بھرپور ہونے کے علاوہ حق اور باطل کی اس جنگ میں آخری فتح کی نوید بھی دیتا ہے۔ اس ترانہ کو سارے قیدی مل کر کورس کی صورت میں گایا کرتے اور گاتے ہوئے ہر شخص دل میں ایک نیا جوش اور ایک نئی اُمنگ محسوس کرتا تھا۔ ظفر اللہ پوشنی نے لکھا ہے کہ سجاد ظہیر کے کمرے میں چھٹی کے دن منعقد ہونے والی اُن محفلوں میں یہ ترانہ بڑے جوش وخروش سے گایا جاتا۔

اس ترانہ کے بارے میں ایلس فیض نے بھی لکھا ہے کہ

''یہ فیض کی محبوب ترین اور مقبول ترین قوالیوں میں سے ایک ہے۔ مجھے حیدرآباد جیل کی ایک عید یاد ہے جب بیشتر قیدیوں کے خاندان یک جا ہوئے تھے۔ شوخ رنگوں کے رنگارنگ اور بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے اتنے بچے وہاں جمع تھے جنہیں دیکھ کر دیکھنے والا یہ بھول جاتا کہ ان سب کے باپ ایسے الزامات میں ماخوذ تھے جن کی بنا پر انہیں سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔''

عید کی اس پارٹی میں یہ قوالی جس جوش، چاؤ اور تیز دھن میں گائی گئی، اس کا تصور بھی اب مشکل ہے۔ جب قوالی ختم ہوئی تو اس وقت تک تمام بچے، بیویاں اور مائیں سب ہی اس میں شریک ہو چکے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر بس یہی بول تھے۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو، کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

☆......☆......☆

رنگ پیراہن کا

یہ فیض صاحب کی مقبول ترین غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے اشعار میں مولانا حسرت موہانی کے رنگ کی جھلک ہے، جن سے وہ بے حد متاثر تھے اور جن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فیض صاحب نے یہ شعر کہا تھا۔

کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے

فیض صاحب نے بارہا حسرت موہانی سے اپنے تعلق خاطر اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اس غزل کے سلسلہ میں مجھے بھی ناقدانِ ادب کا یہ خیال دُرست معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل جس کا پہلا مصرع ہے ''رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام'' حسرت موہانی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

پیراہن اسکا ہے سادہ رنگین یا عکس مہ سے شیشہ گلابی

یہ غزل فیض صاحب کی پسِ زنداں تخلیقات کے ابتدائی دنوں کی تخلیق ہے۔ اس غزل کا پس منظر اللہ پوشنی نے جو طویل عرصہ تک فیض صاحب کے ساتھ حیدر آباد جیل میں قید رہے تھے، بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''فیض صاحب جیل میں وقتاً فوقتاً شعر لکھتے رہتے تھے اور جب بھی کوئی غزل یا نظم مکمل ہو جاتی تو وہ چپکے سے کسی سے کہہ دیتے کہ بھئی کچھ سننا ہے تو آ جاؤ میرے کمرے میں۔ اس پر چاروں طرف ایک شور سا مچ جاتا کہ فیض نے کوئی نئی چیز کہہ لی ہے۔''

''1951ء کے آخری دنوں کی بات ہے رات کے وقت ہم سب بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ فیض نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی۔ اُنہوں نے کہا کہ بجائے اس کے کہ میں ہی تنہا شعر لکھوں اور سب دوستوں کو اپنا کلام سُناتا رہوں، کیوں نہ ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جائے تاکہ میں بھی غزل لکھوں اور دوسرے اصحاب بھی طرح کے مصرع پر طبع آزمائی کریں۔ تجویز معقول نظر آئی چنانچہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مصرع طرح چن لیا جائے اور بزم مشاعرہ کے انعقاد کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ اس طرح حیدر آباد سینٹرل جیل میں قیام کے دوران میں کم و بیش دس گیارہ بار ایسی محفلیں برپا ہوئیں۔''

جن مشاعروں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ پوشنی کی کتاب میں درج ہے ان میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جو 19 اگست 1952ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں مصرع طرح تھا ''آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام۔''

اس زمین میں لکھی ہوئی فیض صاحب کی غزل امر ہوگئی اور ملک کا شاید ہی کوئی قابل ذکر گلوکار ہو جس نے یہ غزل نہ گائی ہو۔ اسی غزل کے حوالے سے سجاد ظہیر نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔

''ان دنوں ہم لوگ ہر پندرہ دن پر چھٹی کے دن ایک طرحی مشاعرہ کیا کرتے تھے جس کے لئے شعر کہنا ہر قیدی کے لئے لازمی تھا۔ان ہی حالات میں فیض نے یہ غزل بھی لکھی تھی۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

انہیں دنوں ایک دن ہم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ انارکلی میں ایک خوبصورت لڑکی جس کے کندھوں پر بالوں کی گھٹا چھائی تھی ہنستی بولتی گزر رہی تھی۔ایک مولانا کسی دوکان پر بیٹھے تھے۔ان کو یہ منظر دیکھ کر سخت غصہ آیا اور اس بے پردگی میں انہیں اسلام کی توہین نظر آئی۔چنانچہ وہ ایک قینچی لئے ہوئے اپنی جگہ سے کودے اور لپک کر اس بیچاری لڑکی کی زلفیں کاٹ دیں۔خیر اس مداخلتِ بیجا پر مولانا پکڑے گئے اور ان کو سزا ہوئی۔معلوم ہوتا ہے فیض اس واقعہ سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی غزل میں یہ شعر شامل کر دیا۔

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام''

اس زمیں میں فیض صاحب کی پوری غزل اس طرح ہے:

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گُل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر، اُونچا ہے اسی کے فیض سے

رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں

آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

☆......☆......☆
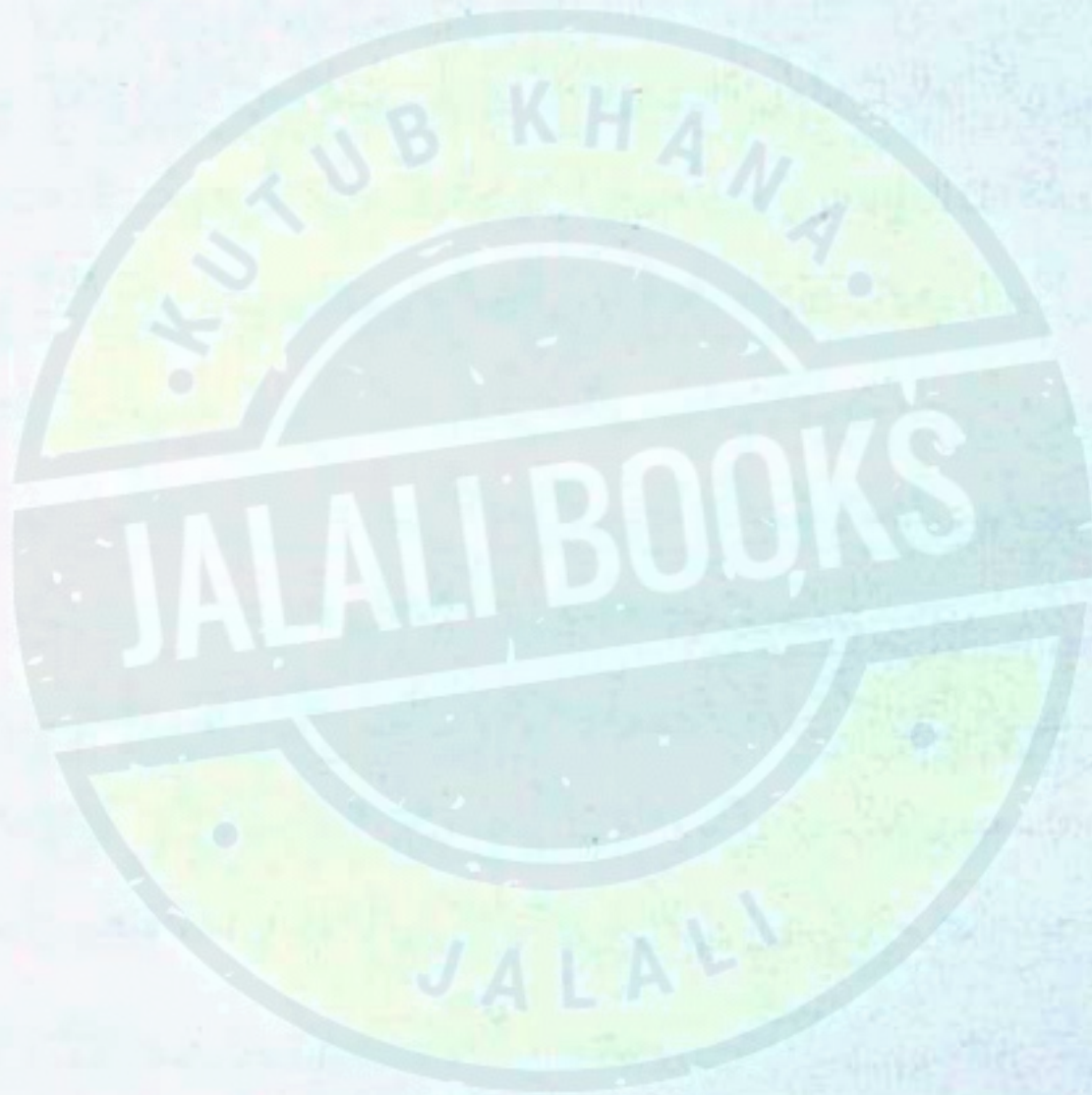
نثار میں تری گلیوں کے

15 اگست 1952ء کو فیض صاحب نے حیدر آباد جیل سے ایلس کو خط میں لکھا ''کل یہاں کے منظر میں ایک انقلاب دیکھنے میں آیا۔ جیل کے دروازے پر سرخ، سبز اور نیلی بتیوں کی لڑیاں روشن ہوئیں اور چار لاؤڈ اسپیکروں نے اپنی پھٹی اور بے سُری آوازوں میں ریڈیو پر نغمے نشر کیے۔ رنگ، روشنیاں اور شور وغل، یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم حیدر آباد جیل میں نہیں ہیں انار کلی بازار میں ہیں۔ صبح آنکھ کھلی تو دل میں عجب طرح کی خوشی محسوس ہوئی اور میں نے اسی وقت بیٹھ کر لکھنا شروع کیا جو اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ لکھنے میں کچھ وقت ہی نہ لگا اور ناشتہ کے وقت تک میں اسے قریب قریب ختم کر چکا تھا۔ ابھی تک اس کا نشہ موجود ہے اور کچھ خدشہ محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہم واقعی کسی دن شاعر ہو جائیں گے۔''

فیض صاحب نے خط کے آخری فقرے میں کس خوبصورتی سے خود کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بلا شبہ ان کی نظم ''نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں'' واقعی ایک شاہکار تخلیق ہے۔ فیض صاحب بھی اسی لئے اس سے بے حد مطمئن نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ شاعر کے جذبات کا ترجمان ہے جو اس کے دل میں جاں گزیں ہیں۔ کس حسرت اور دردمندی کے ساتھ وہ باہر کی دنیا کو دیکھ رہا ہے اور فریاد کر رہا ہے۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے

کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے

کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

یہ پاکستان کے یومِ آزادی کی پانچویں سالگرہ تھی۔ روشنیوں، رنگوں اور نغموں کی جو ہلکی سی جھلک زندان کی چار دیواری کے اندر انہیں نظر آئی اس کا نظارہ بڑے پیمانے پر ملک کے سارے شہروں، گلی کوچوں اور بازاروں میں بھی جلوہ گر تھا۔ مگر ان مسرت بھرے نعروں کے پیچھے وہی محرومیاں، مجبوریاں اور ناکام آرزوئیں تھیں جو آزادی کے بعد سے قوم کا مقدر بن چکی تھیں۔ شاعر کا دل خوشی سے معمور ہے مگر ساتھ ہی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ رنج و مسرت کا یہ ایک ایسا انمول اور نادر امتزاج ہے جو شاید صرف فیض صاحب کا

ہی حصّہ ہوسکتا تھا۔

پروفیسر فتح محمد ملک نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ہمارے شاعروں نے وطن کے ترانوں کا ایک انبار تخلیق کر ڈالا ہے مگر جیل کی کال کوٹھڑی میں بیٹھ کر فیض نے پاکستان کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے وہ بے مثال ہی نہیں لاجواب بھی ہے۔ جبر و تشدد اور آمریت واستبداد کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پھول کھلانے کی رسم قدیم پر ناز کرتے ہوئے فیض صاحب پاکستان کو پکار رہے ہیں۔

یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول

رقیب کی یہ ''چار دن کی جدائی'' فیض کی پوری زندگی پر محیط ہے مگر فیض نے کٹھن سے کٹھن مرحلۂ جہاد میں بھی غرورِ عشق کا بانکپن ہمیشہ قائم رکھا۔ نہ اپنوں کی ملامت پر دل بُرا کیا، نہ غیروں کے دشنام کو خاطر میں لائے اور نہ ہی قید و بند اور جلاوطنی کے عذاب سے ہار مانی۔''

ہماری تاریخ کا یہ دور قومی اور بین الاقوامی سازشوں، سیاسی کشمکش اور صوبائی عصبیت کے گھناؤنے پھیلاؤ کا دور تھا۔

قائداعظم کی رحلت اور لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد سارے مخلص اور محبِ وطن راہنما تتر بتر ہوگئے اور ملک طرح طرح کی سازشوں کا مرکز بن گیا۔ اقتدار کے لئے رسہ کشی نے ملک کی ترقی اور فروغ کے کام کو پس پشت ڈال دیا اور بڑے بڑے لوگ ذاتی منفعت اور حرص زر کی دوڑ میں شامل ہوتے گئے۔ یہ لوگ تمام اخلاقی اصول بھول گئے اور ملک کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیا۔

محلّاتی سازشوں کے ذریعہ ملک غلام محمد کو جو وزیرِ خزانہ تھے، گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے نئے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین بہت کمزور ثابت ہوئے اور گورنر جنرل سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے بعد باہمی چپقلش کے سبب ملک میں بڑھتے ہوئے داخلی انتشار پر قابو پانا دشوار ہوگیا۔

ان حالات میں فیض صاحب نے یہ نظم لکھی۔ وہ جو طبعاً ایک Optimist تھے ان حالات میں بھی ان کو یقین تھا آخر کار جیت ان کی ہوگی جو حق پر ہیں۔

ان کی یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور آج بھی مقبول ہے۔ اس کے بعض مصرعے تو روزمرہ کے محاورات کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لئے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدّعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

زنداں کی ایک شام

زنداں کی ایک شام فیض صاحب کی بہت خوبصورت نظموں میں سے ہے۔ اس کے شعری پیکر، ماحول کا طلسم، خواب آگیں الفاظ اور غنائی انداز نے اسے ایک لافانی حُسن عطا کر دیا ہے۔ فیض صاحب کو ایسی نظم تخلیق کرنے کا خیال اُس مختصر سی گفتگو کے بعد آیا جو ایک روز سازش کیس کے لیڈر میجر جنرل اکبر خاں اور اُن کے درمیان ہوئی۔

یہ 1952ء کی بات ہے اور مقام حیدر آباد جیل ہے۔ فیض صاحب نے اس کا ذکر ایلس کو ایک خط میں یوں کیا ہے۔

''گرمی کی ایک لہر گزر چکی ہے اور پچھلے تین چار دن سے موسم خاصہ خوشگوار ہے۔ آجکل رات کو چاند نکلتا ہے جب جیل کی دیواریں محو ہو جاتی ہیں۔ میرے برآمدے کے فرش پر چاندنی کی لہروں میں ریشمی سائے لہراتے ہیں تو درختوں اور ہوا کی سرسراہٹ سے کوہساروں میں بہتے ہوئے ندی نالوں کا نغمہ ذہن میں آتا ہے۔ کل کافی رات گئے میں اپنے بستر پر بیٹھا کشمیر اور شملہ کی راتیں یاد کر رہا تھا اور دل کسی صورت یہ ماننے پر راضی نہ تھا کہ یہ جیل خانہ ہے اور جوانی کے دن جانے کب کے بیت چکے۔ غالباً کوئی ایسا ہی خیال اکبر خاں کے دل سے گزرا اور وہ میرے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئے۔

''کیا اس پل زندگی بہت خوبصورت نہیں ہے؟ اکبر خاں نے پوچھا ''ہاں ہے'' میں نے جواب دیا۔ پھر دیر تک خاموش بیٹھے ہم دونوں سگریٹ پیتے رہے۔ یہ حُسن جسے زندگی کبھی کبھی بے نقاب کرتی ہے کیسی عشوہ طراز اور کیسی سیماب صفت چیز ہے اور زندگی اسے آشکار کرنے کے لیے عجیب و غریب لمحے اور عجیب و غریب مقامات کا انتخاب کرتی ہے بعینہٖ ہمارے قدیمی محلوں کی کسی پردہ نشین حسینہ کی طرح۔''

برسوں پہلے بھی فیض صاحب نے ایک منظر سے متاثر ہو کر اپنے احساسات کا اظہار یوں کیا تھا۔ ''مجھے یاد ہے کہ ہم اس

زمانے میں مستی گیٹ کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن تھا۔ چاروں طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدرو اور اردگرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار سا منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حسن پیدا ہو گیا تھا۔''

یہ تصویریں اور امیجز فیض صاحب کے ذہن کے کسی گوشہ میں محفوظ رہے اور ان کے عکس گاہے گاہے آنے والی زندگی میں ان کے تخیل میں ابھرتے رہے۔

شفق کی راہ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شب فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیماں کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

ایسا موڈ اکثر ان پر طاری ہوتا جس کی جھلک فطرت کے مناظر کی حسن کاری کی صورت میں ساری زندگی فیض صاحب کے اشعار میں اور گاہے گاہے ان کی نثر میں بھی نظر آتی ہے۔ جیل سے لکھے گئے ان کے خطوط کے بہت سے حصّوں کو تو نثری نظم کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ایلس کے نام خط کا یہ چھوٹا سا اقتباس کس قدر سحر آگیں ہے۔

''صبح وشام بہت تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ جب یہ ہوا ہمارے گنے چنے پیڑوں اور بیل بوٹوں میں سے سنسناتی ہوئی گزرتی ہے تو سب پودے اس کی لے پر رقص کرنے لگتے ہیں اس رنگ و آہنگ سے نظر کو عجیب عجیب دھوکے ہوتے ہیں کبھی بچپن کی یاد میں بسے ہوئے کسی پنجابی گاؤں کا دھوکا ہوتا ہے۔ کبھی شملہ اور کشمیر کے دامن کوہسار کا دھوکہ ہوتا ہے۔ چیڑ کے پتوں پر ہلکی ہلکی پھوار گر رہی ہے اور دور بہتی ہوئی ندیوں کے نغمات کے لئے بادام اور بید مجنوں کے پیڑ گوش بر آواز ہیں۔ کبھی یہ سمندر کا بیچ اور سرسبز ساحل نظر آتا ہے جہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں اور دیوہیکل موجوں کی چنگھاڑ سنائی دیتی ہے۔ جیل کے گوشے میں بیٹھے ہوئے نظر کے سامنے منظر ابھرتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں اور ان لمبے وقفوں میں نہ جیل خانہ باقی رہتا ہے نہ جیل کی دیواروں کا وجود۔''

یہ حقیقت ہے کہ رات کا سماں ان کے لئے ایک خاص کشش رکھتا تھا۔ غروبِ آفتاب کے بعد ان کا دل ولولہ انگیز جذبات سے بھر آتا۔ گزرے ہوئے دنوں کی یادیں جاگ جاتیں اور شاعر امید بھرے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں پہنچ جاتا۔ اسیری کے کلام کے کئی خوبصورت نمونے ایسے ہی وقت سے منسوب ہیں۔ ''زنداں کی ایک شام'' بھی اس کی ایک مثال ہے

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے!
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نُور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

☆......☆......☆

زنداں کی ایک صبح

1981ء میں مجھے بقول فیض صاحب نیف ڈیک کی ٹھیکیداری سپرد کر دی گئی۔ نیف ڈیک نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا مخفف تھا اور اسی نام سے مشہور تھا۔ اسی زمانے میں صوبہ سرحد کے ایک معتبر سیاستدان ارباب نیاز محمد، وزارت ثقافت کے وزیر مقرر ہوئے۔ یہ ضیاء الحق کے دورِ حکومت کا تیسرا سال تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ اپنی کابینہ میں زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو شامل کریں کہ جن کی شخصیت شک وشبہ سے بالاتر ہو۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اپنی حکومت کا کچھ بھرم قائم کر سکیں گے۔

ارباب صاحب سابق فوجی تھے اور راولپنڈی سازش کیس میں فیض صاحب کے ساتھ سزا بھی بھگت چکے تھے۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ضیاء الحق جیسے ''اسلام پسند'' حکمران نے ایک ایسے آدمی کو جو فوج سے نکالا ہوا تھا، سازش کیس کا سزا یافتہ تھا، سوشلسٹ خیالات کا حامل تھا اور فیض احمد فیض کا دوست تھا۔ اپنا وزیر کس طرح بنالیا۔

ارباب نیاز ایک نہایت نیک دل، شریف النفس اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک تھے۔ جلد ہی مجھے اُن کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ جب 1981ء میں مجھے اُن کے ساتھ چین کے دورے پر جانے کا اتفاق ہوا تو یہ اعتماد دوستی میں بدل گیا۔ چین کے سات روزہ دورہ میں ہم تقریباً روزرات کو ایک ساتھ بیٹھتے اور گپ لگاتے تھے۔ ایک روز شنگھائی میں ڈنر سے واپسی پر ارباب صاحب نے کہا ''یارو! آؤ میرے کمرے میں چلو کافی پیئں گے۔'' وہ مجھے خاص طور پر اس لیے بھی زیادہ پسند کرنے لگے تھے کہ میں فیض صاحب کے نیاز مندوں میں سے تھا اور غالباً فیض صاحب نے خود بھی ان سے میرا تذکرہ کیا تھا۔ اُس رات شنگھائی کے قدیم فرانسیسی انداز کے ہوٹل کے کشادہ ڈرائنگ روم میں کافی پیتے ہوئے میں نے اُن سے فیض صاحب کا ذکر چھیڑ دیا اور پوچھا کہ آپ کو تو فیض صاحب کی شاعری سے فیض یاب ہونے کا بہت موقع ملا ہوگا۔ سخت پٹھانی لہجہ میں کہنے لگے ''ہاں موقع تو ملا مگر ام کو اُن کا شعر دیر بالکل سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اُن کا صحبت میں رہ کہ ہم کچھ سمجھدار ہو گیا۔'' وہ ذرا توقف کے بعد بولے ''ایک بار تو ہم نے فیض کو شعر بناتے ہوئے بھی دیکھا۔''

''وہ کس طرح؟'' میں نے دریافت کیا۔

اُنہوں نے بتایا ''ایک رات ہمارا دل بہت افسوس میں تھا۔ جیل کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحے آتے ہیں جب انسان بالکل حوصلہ کھو دیتا ہے۔ وہ کچھ ایسا ہی دن تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ ہمارا پلنگ فیض کے ساتھ ہی بچھا ہوا تھا۔ سارے ساتھی سو رہے تھے۔

رات کے پچھلے پہر ہمارا آنکھ کھلا تو ہم نے دیکھا فیض اپنے بستر پر بیٹھا ہے۔ ہم بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہم پریشان ہوا اور اُس سے پوچھا کیا بات ہے۔ اُس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دیا اور ہاتھ سے کچھ اس طرح کا اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو تم سو جاؤ ہم منہ ڈھانپ کر بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں چپکے چپکے دیکھتا رہا کہ فیض کیا کرتا ہے۔ وہ بڑا بے چین اور مضطرب سا تھا، کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی بیٹھ جاتا اور کبھی زیرلب کچھ بولنے لگتا۔ اتنے ہولے سے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ ہم کو خیال ہوا شاید وہ کوئی نئی شاعری کرنے لگا ہے۔ پھر ہم کو نیند آ گیا۔"

ارباب صاحب کی اس بات کی تصدیق خود فیض صاحب نے بھی کی ہے۔ اُنہوں نے اپنے ایک خط میں ایلس کو لکھا تھا۔

"آج کی صبح چاند کی تیز روشنی چہرے پر اس طرح پڑی کہ آنکھ کھل گئی۔ جیل کے گھڑیال نے ساڑھے چار بجائے میں بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ٹھیک اسی لمحے ساتھ کے پلنگ پر ارباب بھی اُٹھ بیٹھا۔ وہ تو دوبارہ سو گیا لیکن میں اُٹھ کر برآمدے میں آ بیٹھا اور صبح کی آمد کا نظارہ کرتا رہا۔ پہرے دار بدلے تو جیل کے صدر دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ دور کہیں زنجیروں اور چابیوں کی جھنکار سنائی دی اور مختلف فولادی دروازوں کے جبڑے اس طرح کھلنے اور بند ہونے لگے جیسے وہ آخر شب کی تاروں بھری تاریکی کو جلد جلد چبا رہے ہوں۔ پھر ایک خواب آلود حسینہ کی طرح ہلکے سے صبح کی ہوا بیدار ہوئی۔ آسمان دھیرے دھیرے پیلا ہونے لگا اور ستارے موتیوں کے گرداب بن کر تہہ و بالا ہونے لگے۔ میں بیٹھا رہا اور دیکھتا رہا اور کئی طرح کی یادیں خیالوں میں آتی رہیں۔ فیض صاحب کے یہی محسوسات، اشعار کے سانچے میں ڈھل کر زنداں کی ایک صبح کے زیر عنوان ان کی نظم میں آشکار ہوئے۔

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اِس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہہِ جام اُتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو ودع کر کے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جابجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہُوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رُخ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی بانہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے
لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چُور صدائیں جاگیں
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہُوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہُوئے جناتِ گراں
جن کے چُنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں اُمید کے جلتے ہُوئے تیر

☆......☆......☆

اے حبیبِ عنبر دست

فیض صاحب نے طویل عرصہ قید میں گزارا۔ وہ پاکستان کی مختلف جیلوں میں مختلف زمانوں میں محبوس رہے۔ 1953ء میں جب وہ حیدر آباد جیل میں تھے، تو بہت سے لوگ ان سے وقتاً فوقتاً ملنے آیا کرتے تھے۔ جیل کے روز و شب کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بار فیض صاحب نے ڈاکٹر ایوب مرزا کو بتایا کہ بھئی جیل خانہ عجب چیز ہے۔ یہ بھی ایک عجب نوعیت کا بنیادی تجربہ ہے۔ اس تجربہ کے محسوسات ایک ایسے شخص کو نہیں سمجھائے جاسکتے جو اس لذت کشائی سے ہمکنار نہ ہوا ہو۔ جیل میں انسان محوِ حیرت ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اولاً جوشِ جنوں درجہ کمال کے حصول کی سرفرازی، فخر کی حد تک، پھر تعطل احساسات اور پھر ساتھیوں ہمسائیوں اور دیواروں، سلاخوں سے محبت اور پھر اُکتاہٹ اور مایوسی، چاند ستاروں، روشنی اور طلوعِ سحر سے محبت۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں گاہے گاہے ملاقات کے لیے آنے والے دوست احباب، رشتہ دار اور دوسرے لوگ بھی کسی حد تک سکون اور طمانیت کا باعث ہوتے ہیں۔ فیض صاحب سے ملنے کے لئے آنے والوں میں ایلس فیض، بیگم آمنہ مجید ملک، اُن کے بھائی طفیل احمد، میاں افتخار الدین اور اُن کے وکیل حسین شہید سہروردی قابلِ ذکر ہیں۔ جیل کی زبان میں ملنے کے لئے آنے والوں کو ''ملاقات'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری

ایسی ہی ''ایک ملاقات''، فیض صاحب کی ایک نظم ''اے حبیبِ عنبر دست'' بھی ہے، جس کے عنوان کے ساتھ یہ بھی درج ہے ''ایک اجنبی خاتون کے نام خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر۔''

اس کا پس منظر خود فیض صاحب نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ ''ہمیں زندگی میں بے شمار تحائف ملے، بوتلیں بھی ملیں۔ لیکن جیل میں ایک دن ایک مختصری شیشی ملی، کسی اجنبی خاتون کی طرف سے۔ کھولا تو زنداں تھا کہ مہک مہک گیا، ہم تھے کہ مچل مچل گئے۔ میں نے انہیں جواب میں ایک نظم لکھ کر بھیجی ''اے حبیبِ عنبر دست''۔ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خوشبو کا یہ تحفہ بھیجنے والی خاتون کون تھی۔''
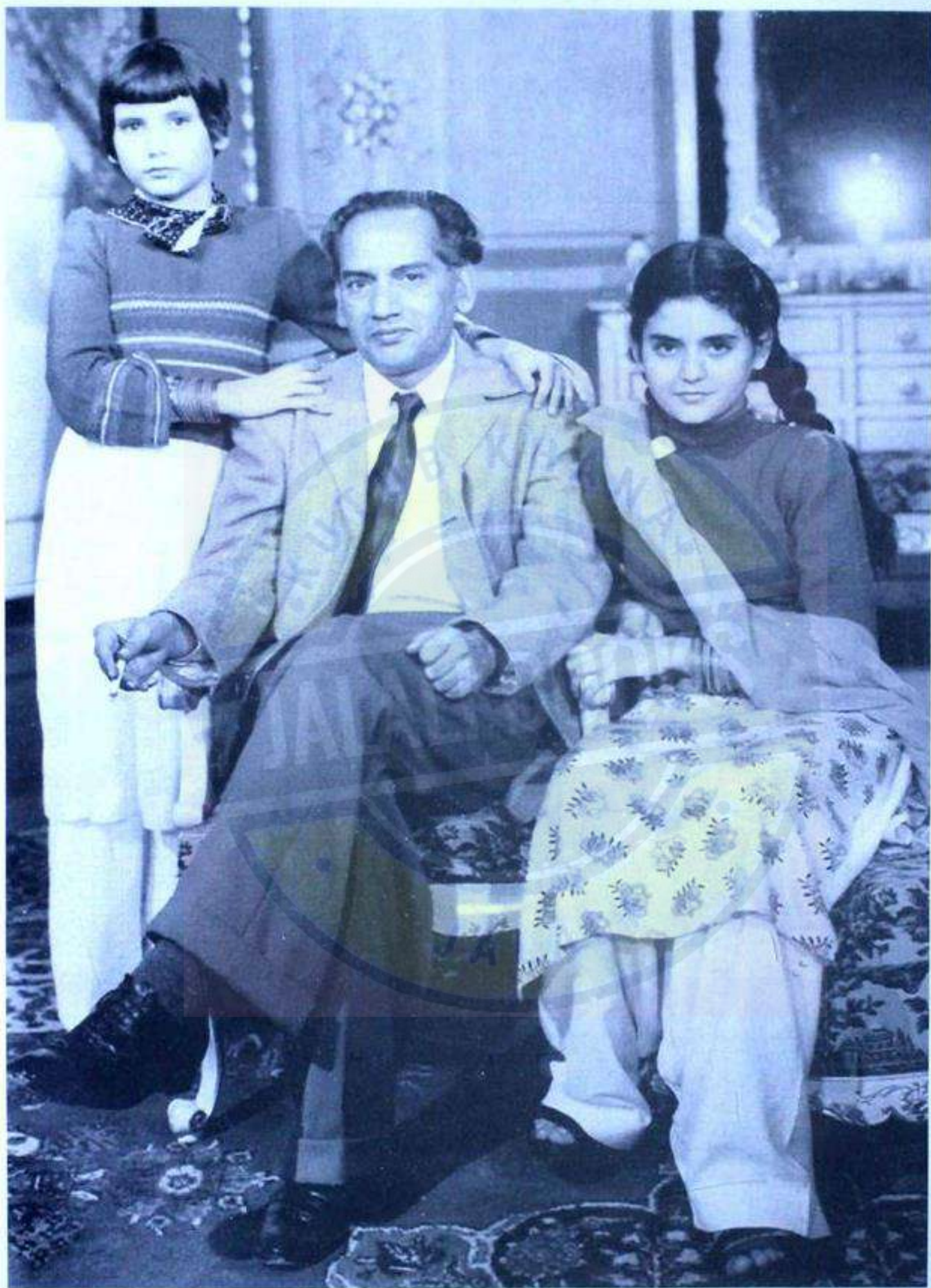
دونوں بیٹیوں کے ساتھ

لیکن اب یہ راز راز نہیں رہا۔ پچھلے دنوں میں نے سلیمہ ہاشمی سے اس تحفہ اور اس نظم کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اس اجنبی خاتون کا نام مسز بھرگری تھا۔ وہ حیدر آباد جیل کے قریب ایک بنگلے میں رہتی تھیں۔ ان کا تعلق سندھ کے ایک رئیس خاندان سے تھا۔

حیدر آباد جیل میں سازش کیس کے ملزمان کی آمد سے پہلے کچھ ضروری تبدیلیاں کی جا رہی تھیں۔ جیل کی دیواروں کو اونچا کرنے کا کام ہو رہا تھا۔ وہ اپنے گھر سے سب دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں بڑا تجسس تھا کہ آخر وہ کیسے ملزم ہیں جن کے لئے یہ اہتمام کیا جا رہا ہے۔ پھر جب ملزمان آگئے اور عدالتی کارروائی شروع ہوگئی تو بیگم بھرگری کو پتہ چل گیا کہ ان میں کس کس نام کے قیدی ہیں۔ فیض صاحب کا نام انہیں کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اگرچہ وہ ان کی عظمت اور شہرت سے زیادہ واقف نہیں تھیں۔ ایک دن ان کو خیال آیا کہ اس شاعر کو کوئی تحفہ دینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے عطر کی ایک شیشی جیلر کو جا کر دی کہ فیض صاحب کو پہنچا دی جائے۔ فیض صاحب نہ ان کے نام سے واقف تھے اور نہ ان سے لہٰذا وہ ان کے لئے ''اجنبی خاتون'' ہی رہیں۔

کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمئ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گل بدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست
لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

☆......☆......☆

بنیاد کچھ تو ہو

فیض صاحب میں ایک خاص صوفیانہ لٹک تھی۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ اشفاق احمد نے جو اگر چہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے، بڑی سچائی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ فیض صاحب ایک ملامتی صوفی ہیں۔ اگر چہ فیض صاحب نے صوفی ازم کا اکتساب کسی سلسلہ میں بیعت کر کے نہیں کیا نہ ہی انہوں نے ورد و وظیفہ یا چلّہ کشی کا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے دراصل صوفیا کا تیسرا راستہ اختیار کیا جو مجاہدے پر محیط ہے۔ اس کو بزرگانِ دین ادب اور تواضع کا نام دیتے ہیں۔ اشفاق احمد نے مزید لکھا ہے ''یہ ادب، یہ صبر، ایسا دھیما پن اس قدر درگزر، تحتی اور احتجاج سے گریز۔ یہ صوفیوں کے کام ہیں۔ ان سب کو فیض نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموش اور چپ چاپ میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضورﷺ سرور کائنات کے زمانے میں ہوتے تو ان کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بدزبان، تند خو، بداندیش یہودی دوکاندار کی دراز دستی کی خبر پہنچتی تو حضورﷺ کبھی کبھی ضرور فرماتے آج فیض کو بھیجو۔ یہ بھی دھیما ہے، صابر ہے، بردبار ہے، احتجاج نہیں کرتا، پتھر بھی کھالیتا ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔''

فیض صاحب میں صوفیوں والی ساری شان تھی۔ ان کے ذوق بھی صوفیائے کرام سے ملتے جلتے تھے۔ ہمارے ہاں صوفیوں کا تعلق سماع سے بہت گہرا ہے۔ صوفیائے کرام کا خیال ہے کہ سماع یا قوالی انسانوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا کرتی ہے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب لاتی ہے۔ موسیقی کی اس صنف سے تعلق انسان کے لئے ذہنی سکون اور اطمینان قلب کا باعث ہوتا ہے۔ امیر خسرو سے فیض صاحب تک ایسے لوگ ایک خاص ڈھب کے انسان ہوتے ہیں جو قوالی اور سماع کی حقیقی دنیا سے آشنا ہوتے ہیں۔

فیض صاحب کو قوالیاں سننے سے خاص رغبت تھی۔ انہوں نے بہت سی ایسی چیزیں لکھی بھی ہیں جو قوالی کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ اشعار بھی قوالی کے اشعار ہیں جو انہوں نے منٹگمری جیل میں لکھے تھے۔ جب سزا سنائے جانے کے بعد فیض صاحب کو حیدرآباد سے منٹگمری جیل منتقل کیا گیا تو ان کے سارے دوست اور ساتھی چھوٹ گئے۔ صرف میجر اسحاق منٹگمری جیل میں ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے لکھا ہے۔'' منٹگمری جیل کے ارباب اقتدار نیک دل اور اچھے لوگ تھے اور ان میں سے بعض بہت اعلیٰ ذوق کے مالک تھے۔

ایک روز سپرنٹنڈنٹ نے فیض صاحب سے قوالی لکھنے کی فرمائش کی۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ شہر میں ایک درگاہ شریف تھی۔ جو بہت مشہور تھی۔ وہ کسی پہنچے ہوئے درویش کا مزار تھا۔ جب ان بزرگ کے عرس کا زمانہ آیا تو درگاہ کے گدی نشین نے کسی کے ذریعہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو کہلوا بھیجا کہ فیض صاحب سے عرس کے موقع پر پیش کرنے کے لئے کلام لکھوا دیں۔ جب فیض صاحب سے یہ درخواست کی گئی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا مگر ایک شرط کے ساتھ کہ جب عرس ہو جائے تو وہ قوالی جیل والوں کو بھی سنوائیں۔ جیلر نے فیض صاحب کی یہ شرط منظور کر لی چنانچہ عرس پر قوالی ہوئی اور بعد میں قیدیوں اور اسٹاف نے بھی سُنی۔

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیدادگر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اِتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیّاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

☆......☆......☆

ہم خستہ تنوں سے

اکتوبر 1958ء میں ملک میں پہلا مارشل لا لگا تو فیض صاحب ایک ایفروایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے روس گئے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر جب وہ وطن واپسی کے لیے براستہ لندن روانہ ہوئے تو انہیں مشورہ دیا گیا کہ واپس پاکستان نہ جائیں کیونکہ نئی فوجی حکومت غالباً ان کو گرفتار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مگر فیض صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ کچھ دن لندن قیام کرنے کے بعد پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

واپسی پر حسب توقع انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پہلے جیل میں اور بعد میں لاہور کے شاہی قلعہ میں رکھا گیا۔ فیض صاحب کی اس بار گرفتاری کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

> ''پہلے تو یہ تھا کہ جب ملک میں کوئی ہنگامہ ہوتا یا کوئی حکومت تبدیل ہوتی تو مخالفین کو احتیاطاً نظر بند کر دیا جاتا تھا مگر جنرل محمد ایوب خاں نے مارشل لا لگاتے ہی یہ کمال کیا کہ 1921ء کے زمانے سے لیکر مارشل لا کے نفاذ تک سی آئی ڈی کی فائلوں میں جن جن لوگوں کے نام تھے ان سب کو بلالحاظ اس بات کے کہ اُنہوں نے کچھ کیا ہے یا نہیں پکڑ لیا۔
>
> جب ہم گرفتار ہوئے تو ہم نے پوچھا کہ '' بھئی ہمیں کس شوق میں گرفتار کیا ہے؟ ہم نے تو کچھ نہیں کیا؟ اور ہم تو یہاں تھے بھی نہیں۔ ہمیں تو حکومت کی طرف سے ماسکو بھیجا گیا تھا۔'' اس پر جواب ملا۔'' ہاں آپ نے کچھ نہیں کیا اور ہم نے بھی آپ پر کوئی الزام نہیں لگایا ہے۔ آپ کو محض احتیاطاً قید میں رکھا ہے۔ جب ہم یہ سمجھیں گے کہ حکومت کو آپ سے کوئی خطرہ نہیں ہے تو آپ کو چھوڑ دیں گے یا پھر ایک صورت یہ ہے کہ آپ لکھ کر دے دیں کہ آپ حکومت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کریں گے۔'' ہم نے کہا'' اس میں لکھ کر دینے کی تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہم ایک زمانے سے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں۔'' اس پر انہوں نے کہا '' اچھا پھر آپ لکھ کر دیں کہ آپ حکومت کا ساتھ دیں گے۔'' ہم نے جواب دیا'' ہم آپ کو کوئی تحریر نہیں دیں

گے۔"

ہر دسویں پندرہویں دن بعد پولیس کے کوئی بڑے صاحب تشریف لاتے اور اصرار کرتے کہ آپ لکھ کر دیں، ہم انکار کر دیتے۔ چار مہینے کے بعد ہم سے کہا گیا اب آپ گھر جائیے۔"

اس زمانے میں کی جانے والی اس مستقل پوچھ گچھ سے فیض صاحب بہت نالاں تھے۔ ان سے طرح طرح کے سوال کیے جاتے۔ ذاتی کوائف، ملازمت، املاک، جائیداد، بینک بیلنس وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا جاتا۔ وہ اس طریقہ کار سے بہت عاجز تھے۔ اسی کا اظہار اُنہوں نے اِس قطعہ میں کیا جو اشاعت کے بعد فوراً ہی زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا وہ سامنے لائے رکھتے ہیں
دامن میں ہے مشت خاک جگر ساغر میں ہے خون حسرت مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

آج بازار میں پابجولاں چلو

1959ء میں فیض صاحب لاہور سینٹرل جیل میں تھے۔ وہ اُن دنوں علیل رہتے تھے۔ ایک روز اُن کے دانت میں سخت درد اُٹھا۔ جیل کے حکام نے اُنہیں پولیس کی حفاظت میں چیک اپ کرانے کے لیے دانتوں کے اسپتال بھیج دیا۔ ڈاکٹر صاحب اُن کے پرستاروں میں سے تھے لہٰذا اُنہوں نے روزانہ چیک اپ کے لیے بلانے کا طریقہ اختیار کیا تاکہ اس طرح جیل کے ماحول سے کچھ دیر کے لیے انہیں نجات حاصل ہو جایا کرے۔ اس طرح انہیں روزانہ جیل کی گاڑی میں اسپتال لایا جاتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جیل والوں کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ جیلر نے انہیں تانگہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس صورت میں انہیں ہتھکڑی پہننا ضروری تھا۔ فیض صاحب مان گئے۔ اس طرح وہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ پولیس کے سپاہی بندوقیں لئے ان کے ساتھ تھے۔

اس حال میں وہ لاہور کے گلی کوچوں سے گزرے، اُنہوں نے تازہ ہوا کو محسوس کیا۔ بازاروں سے گزرتے ہوئے خوانچے والے، تانگے والے، بیل گاڑیاں سب بچھڑے ہوئے یاروں کی طرح اُن کے قریب سے گزرتے رہے۔ عجیب منظر تھا۔ وہ لاہور شہر کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزرتے رہے۔ شہر اور اہلیانِ شہر یہ تماشا دیکھتے رہے۔ شاید کچھ لوگوں نے اُنہیں پہچان بھی لیا ہو۔ اردگرد لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا جن میں نانبائیوں سے لیکر صحافیوں تک سبھی شامل تھے۔ اس طرح ایک جلوس کی شکل بن گئی۔ فیض صاحب کہتے تھے میں نے زندگی میں ایسا دل کش جلوس نہیں دیکھا۔ اسی واقعہ سے متاثر ہو کر اُنہوں نے اپنی یہ مشہورِ زمانہ نظم لکھی ''آج بازار میں پابجولاں چلو''

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

مرے دل مرے مسافر

دورِ جلاوطنی

دیارِ غیر میں ہمدم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی
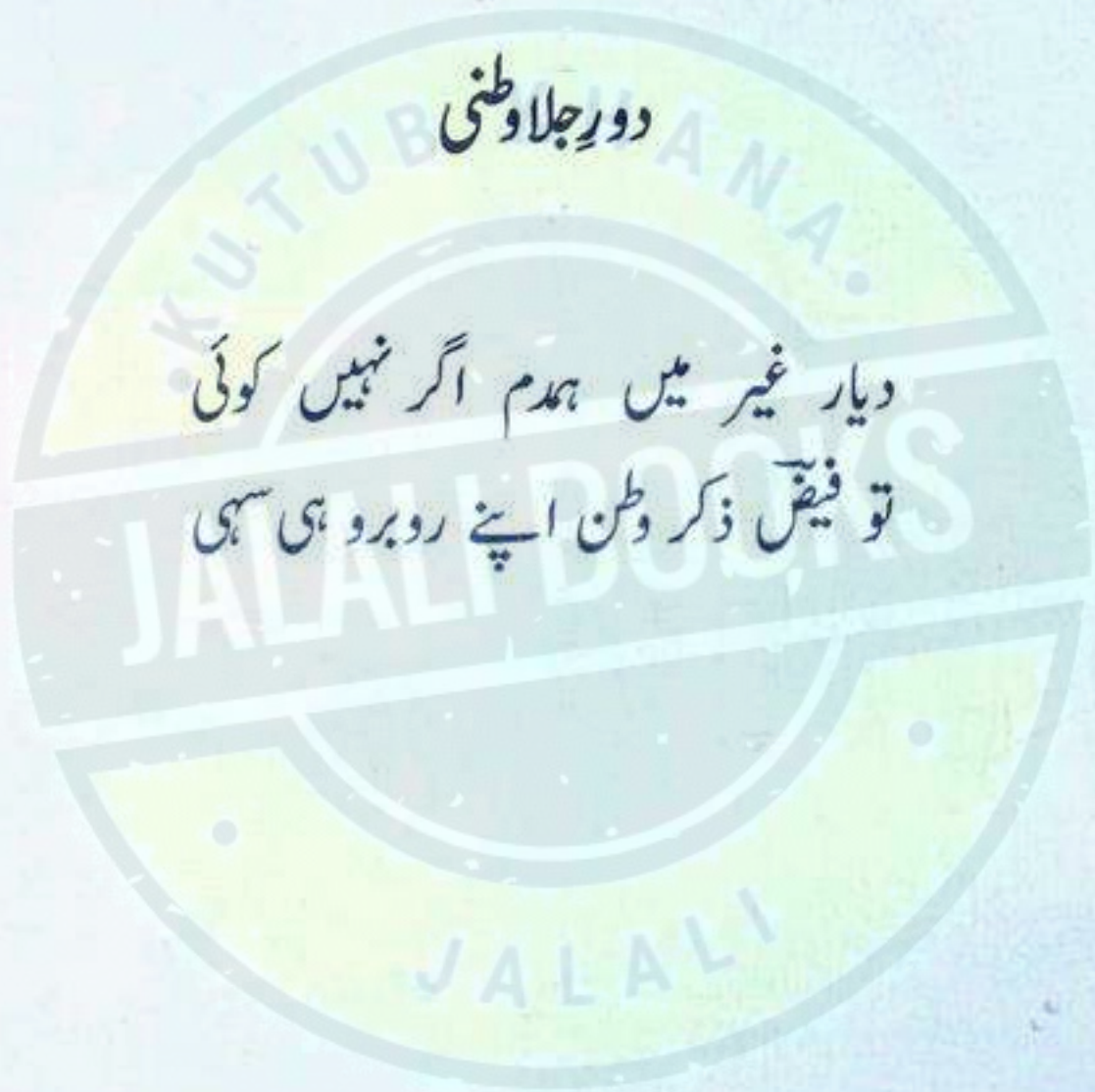
- دلِ من مسافرِ من
- عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا
- میرے ملنے والے
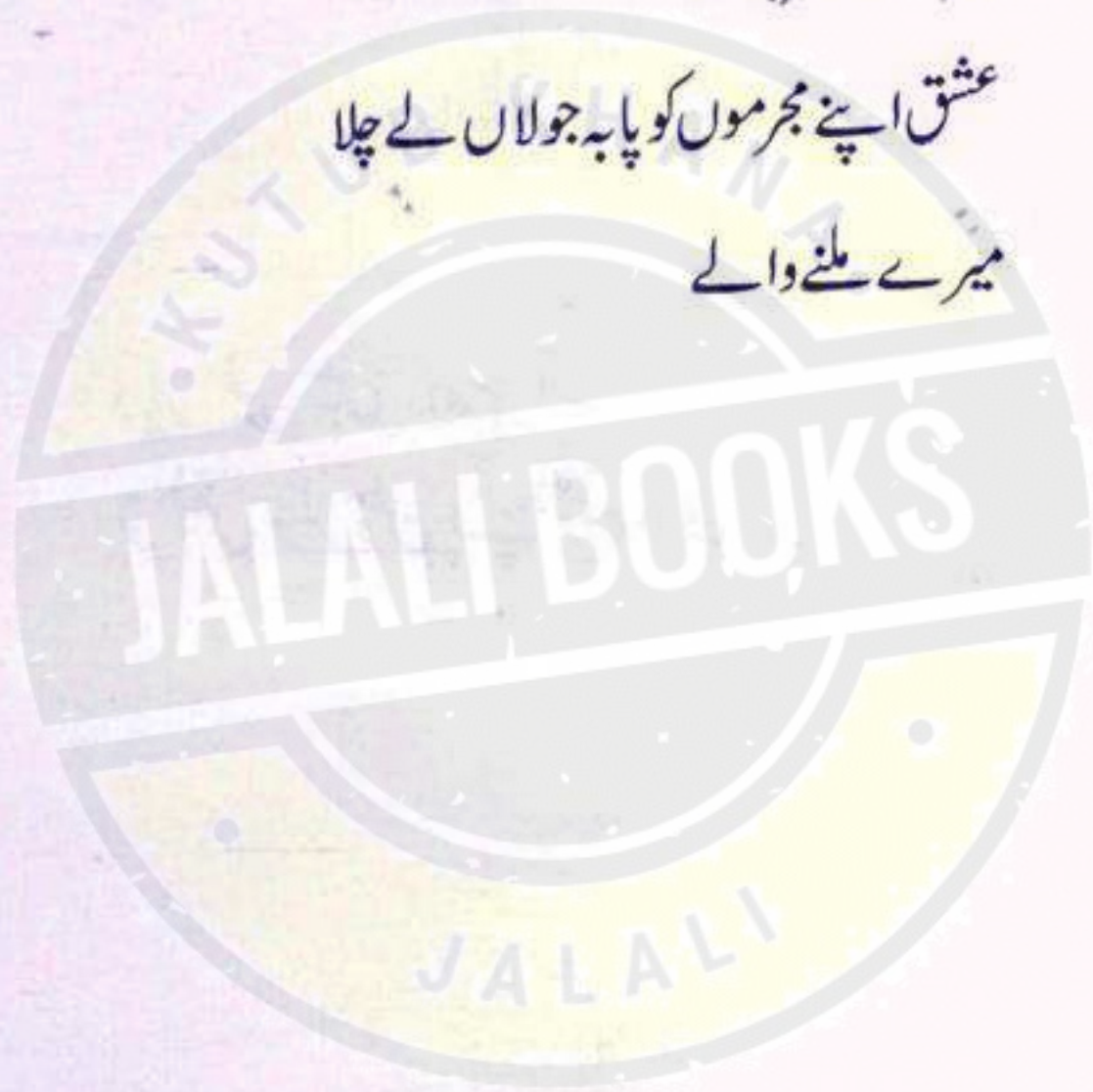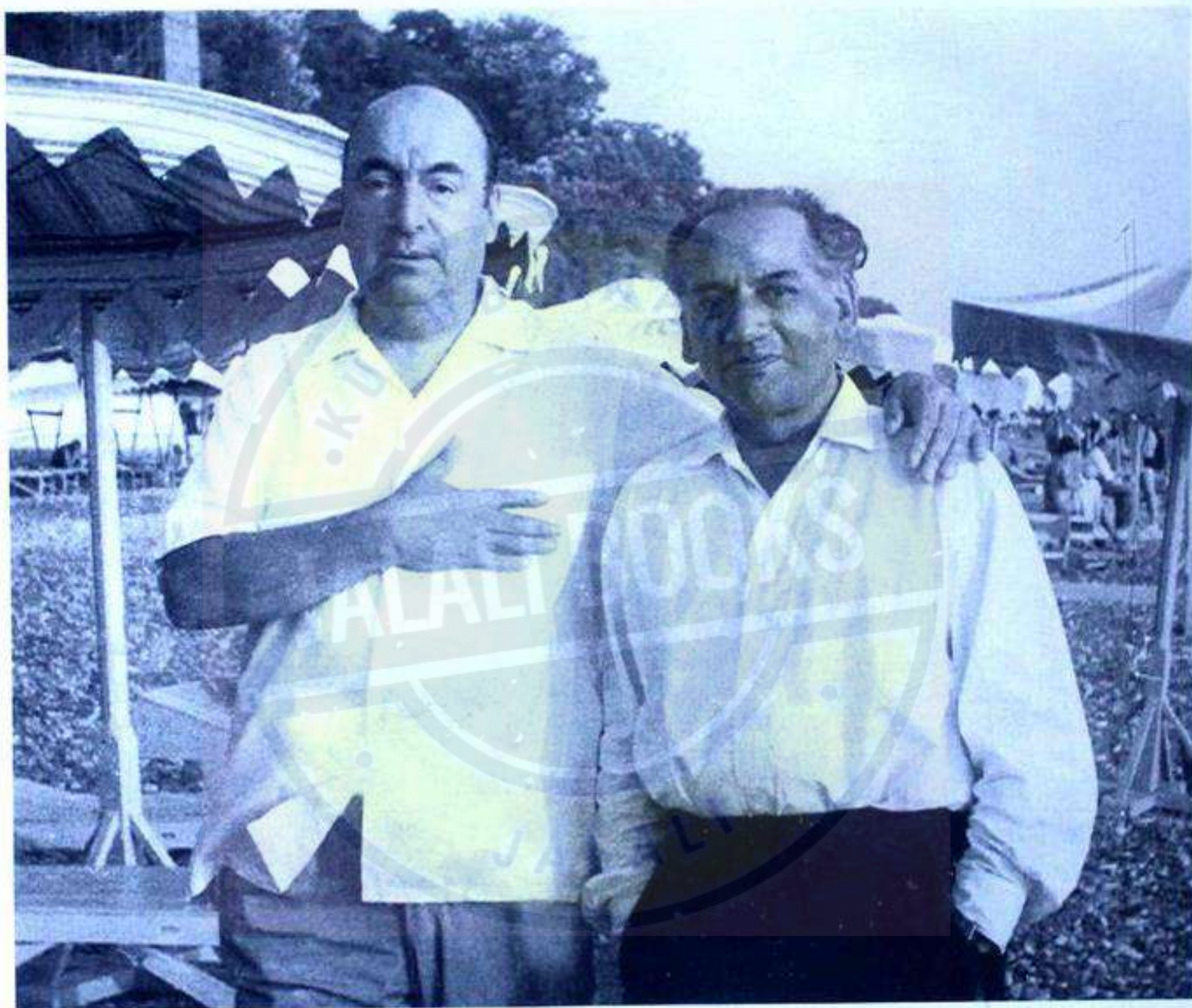
فیض اور پابلو نرودا

دلِ من مسافرِ من

جولائی 1977ء کے مارشل کے نفاذ کے کچھ عرصہ بعد فیض صاحب نے ''خود ساختہ'' جلاوطنی اختیار کرلی۔ وہ فروری 1978ء میں ملک چھوڑ کر چلے گئے اور پھر کم و بیش چار سال باہر رہے۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کا زور جس طرح روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ فیض صاحب کو اس کا احساس تھا۔ اس دور میں انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں ان حالات کی جھلکیاں واضح طور پر نمایاں ہیں

کس شہر نہ شہرہ ہوا نادانیء دل کا
کس پر نہ کھلا راز پریشانی دل کا
دیکھ آئیں چلو کوئے نگاراں کا خرابہ
شاید کوئی محرم ملے ویرانی دل کا
دیکھو تو کدھر آج رخ باد صبا ہے
کس رہ سے پیام آیا ہے زندانی دل کا

مارشل لا کے قوانین میں بڑھتی ہوئی شدت اور اہلِ اقتدار کی بنیاد پرستی کی پالیسی نے ساری قوم کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ دائیں بازو کی جماعتوں اور فوجی حکمرانوں کے گٹھ جوڑ نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نہ کوئی دادرسی کرنے والا تھا نہ آہ وزاری سننے والا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مذہب کے نام پر ہر جور ہر ستم روا سمجھا جانے لگا تھا۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روزِ قیامتیں کہ خیال روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خار گلو بنا، جو اٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاط آہ سحر گئی، وہ وقارِ دست دعا گیا

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے فیض صاحب کو ملک بدر ہونے پر مجبور کیا اور جس کے نتیجہ میں ۔"مرے دل مرے

مسافر" جیسی انمول کتاب وجود میں آئی۔اس کا عنوان فیض صاحب نے حافظ کے مصرع سے ترجمہ کیا تھا۔

دلِ من مسافرِ من

فیض صاحب کے ملک سے جانے کا احوال ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنی کتاب "بیادِ صحبت نازک خیالاں" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

''جولائی 1977ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو فیض لاہور میں تھے۔دو تین دن کے بعد وہ راولپنڈی آئے۔ایک شام جب ہمارے ہاں فیض اور کچھ دیگر احباب جمع تھے مارشل لا کے نفاذ کے ضمن میں جنرل ضیاء الحق کے نوے دنوں میں الیکشن کرانے کا ذکر آیا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے فیض نے مسکراتے ہوئے کہا یہ تو خلاف وضع فطرت فعل ہوگا۔اس وقت تو اسی پر کسی نے یقین کیا کسی نے نہیں کیا مگر بعد میں فیض کی یہ بات واقعی سیاسی پیش گوئی ثابت ہوئی۔

کچھ دنوں کے بعد حکومت کی مختلف ایجنسیوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔کچھ مخصوص قسم کے لوگ لاہور میں ان کے گھر کے سامنے گھومنے لگے۔وہ باہر نکلتے تو ایک جیپ ان کے پیچھے لگی رہتی۔فیض اب عمر کی اس منزل میں تھے کہ ان سے اس قسم کی ناروا کارروائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔چنانچہ انہوں نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔1978ء میں سردیوں کے ایک دن وہ ایلس کے ساتھ پنڈی ہمارے گھر آئے، چند منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھے۔کہنے لگے ہم شام کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں، وہاں سے لندن۔بس تمہیں خدا حافظ کہنے آئے ہیں۔اب دیکھو کب ملاقات ہوتی ہے۔''

ان کی اس نظم ''دلِ من مسافرِ من'' کے بہت سے پہلو ہیں لیکن روسی مصنفہ لدمیلا نے اسے ایک اور ہی زاویہ سے پرکھا ہے۔انہوں نے لکھا ''اس نظم میں ایک اور اہم موضوع تنہائی کا بھی ہے۔اس سلسلہ میں فیض کی ساری نظمیں اور اشعار یاد آتے ہیں۔سب سے پہلے نقشِ فریادی کی تنہائی، پھر کوئی آیا دلِ زار۔ اس میں بھی گفتگو کی شکل میں خود کلامی پیش کی گئی ہے۔لیکن اس بار تنہائی کی قطعی دوسری کیفیت ہے۔یہ گھر کی چاردیواری میں بند انتظار کرنے والے کردار کی تنہائی نہیں بلکہ ہجوم میں اور آباد شہروں میں بھٹکنے والے انسان کی جان لیوا تنہائی ہے۔''

مرے دل، مرے مسافر
ہُوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر، کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بَر کا

ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!

☆......☆......☆

عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا

یہ 1981ء کے موسم گرما کی بات ہے۔ میں اُن دنوں نیف ڈیک کا سربراہ تھا، جس کا دفتر اسلام آباد میں تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر مجھے کراچی سے اپنے دوست احمد مقصود حمیدی کا فون آیا جو ان دنوں صوبائی سکریٹری اطلاعات تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ آج صبح کراچی ائیر پورٹ پر ایک تماشہ ہوگیا۔ فیض صاحب جس جہاز کے ذریعہ بیروت سے ٹوکیو جارہے تھے وہ کراچی کے ایئر پورٹ پر ٹھہرا تو اس میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ سارے مسافروں کو ٹرانزٹ لاؤنج میں لے جایا گیا کہ جہاز کی مرمت ہونے تک انتظار کریں۔ فیض صاحب بھی اُن مسافروں میں شامل تھے۔ فیض صاحب نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور سوچا کہ چلو کراچی کے کچھ دوستوں سے فون پر بات ہی کرلیں۔ وہ ہوائی اڈے کی عمارت میں ٹیلی فون تلاش کرتے ہوئے ٹرانزٹ لاؤنج سے باہر آ گئے اور کچھ دوستوں کو فون پر بتایا کہ وہ کراچی ائیر پورٹ پر موجود ہیں اور امکان ہے کہ جہاز کئی گھنٹوں کے بعد روانہ ہوگا اس لیے اگر آ سکیں تو آ کر مل لیں۔ اُن کے کچھ احباب ملنے ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ مگر پھر کچھ اور ہی ماجرا ہوگیا۔ جب جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور فیض صاحب دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر جانے لگے تو انہیں امیگریشن والوں نے روک لیا کہ آپ اندر نہیں جا سکتے چونکہ آپ کا نام Exit Control List (ECL) پر ہے۔ فیض صاحب نے بہت سمجھایا کہ وہ تو پہلے ہی کئی سال سے ملک سے باہر ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں۔ مگر امیگریشن والوں نے ایک نہ سنی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اُن کو جانے کی اجازت صرف فیڈرل گورنمنٹ سے مل سکتی تھی اور چونکہ معاملہ فیض صاحب کا تھا لہٰذا یہ اجازت صرف چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے لی جا سکتی تھی۔ مجھے کراچی سے جو پیغام ملا وہ یہ تھا کہ میں فیض صاحب کے دوست ارباب نیاز محمد سے مل کر جو وفاقی وزیر تھے، اُن کو جانے کی اجازت کا بندوبست کراؤں۔ خدا کا شکر ہے ارباب صاحب مل گئے اور اُنہوں نے فی الفور یہ کام کرا دیا۔ ان کے احباب فیض صاحب کو اس خالی وقت میں شہر لے آئے اور ایک محفل آراستہ ہوگئی تھی۔ اسی محفل میں فیض صاحب نے پہلی بار یہ نظم سنائی۔ یار لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ اشعار فیض صاحب نے پاکستان کے حوالے سے لکھے ہیں۔ میں بھی مدتوں یہی سمجھتا رہا۔

اصل صورتِ حال اور اس نظم کا پس منظر بعد میں اشفاق حسین کی کتاب سے معلوم ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے "فیض صاحب نے

اپنے قیام بیروت کے زمانے میں فلسطین سے متعلق چھ نظمیں لکھی ہیں اور ہر نظم ایک الگ کیفیت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کہیں کسی بچے کو لوری دی جا رہی ہے تو کہیں مجاہدوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ترانہ لکھا جا رہا ہے۔ کہیں پردیس میں کام آنے والے فلسطینی شہیدوں کے پرچم کی بات کی جا رہی ہے تو کہیں اس دن کی کیفیت کا بیان ہے۔ جب فلسطینی حریت پسند یاسر عرفات کے ہمراہ بین الاقوامی نگرانی میں بیروت سے تیونس کی طرف جاتے ہیں۔ اس دن فیض نے ''عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا'' جیسی درد بھری نظم لکھی:''

اس نظم کو پڑھتے ہوئے ایک گزرتے ہوئے کارواں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

دار کی رسّیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہُوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
پائلیں بیڑیوں کی بجاتے ہُوئے
ناچنے والے دُھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اِس صف میں تھے اور نہ اُس صف میں تھے
راستے میں کھڑے اُن کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چُپ چاپ آنسو بہاتے رہے
لَوٹ کر آ کے دیکھا تو پُھولوں کا رنگ
جو کبھی سُرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلو میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انہیں کی طرح
رسن در گلو، پابجولاں ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

☆......☆......☆

میرے ملنے والے

1980ء میں فیض صاحب کو گھر چھوڑے تقریباً تین سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ضیاء الحق کے مارشل لا کے نفاذ کے بعد وہ پہلے دہلی گئے پھر لندن گئے اور آخر کار بیروت میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے جہاں ان کے ذمہ تیسری دنیا کے مشہور رسالے ''لوٹس'' کی ایڈیٹری تھی۔ لبنان اور خصوصاً بیروت شہر پر یہ قیامت کا زمانہ تھا۔ اسرائیلی حملوں نے شہر کا سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ پھر خود لبنانیوں میں بھی مختلف گروپ موجود تھے جن میں سے کچھ فلسطینیوں کے ساتھ تھے اور کچھ ان کے خلاف۔ یاسر عرفات اپنے فلسطینی ساتھیوں کے ہمراہ بیروت میں مقیم تھے۔ فیض صاحب بھی ان کے ساتھ فلسطینیوں کی محبت میں وہیں رہنے لگے اور کسی صورت ان کا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے۔ یہ فلسطین کے مجاہدین اور فدائین کے ساتھ ان کا پیمان وفا تھا جس کی تکمیل کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھے اگرچہ انہیں وہاں طرح طرح کے مسائل درپیش تھے۔

سر کوئے ناشنایاں ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا یاد وطن انہیں بری طرح ستانے لگی تھی انہیں اپنا گھر، اپنے بچے، اپنے دوستوں کی محفلیں شہر کی گلیاں اور بازار یاد آتے تھے تو ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ ملک سے آنے والی ہر خبر ان کے لئے دکھ اور تکلیف کے پیغام کے سوا کچھ نہیں لاتی تھی۔ ضیاء الحق کی مارشل لا میں عوام پر ڈھائے جانے والے جور و ستم، بھٹو کی سزائے موت، فیض صاحب کے بعض شاعر اور ادیب دوستوں کا بزدلانا رویہ۔ یہی کچھ ان دنوں ان کی شاعری کے موضوع تھے۔ وہ عالم تذبذب میں تھے۔ خود سے پوچھتے تھے ''کیا کریں:''

جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے

گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی میں راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو

یہ ہے بھی یا نہیں بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوت وہم کا بنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا بتا
بتا بتا

اب وطن سے دوری کا جبر اُن کے لئے نا قابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ وطن کی یاد کے درد سے بلبلا رہے تھے۔ مایوسی اور ناامیدی کی دبیز چادر نے انہیں ڈھانپ لیا تھا۔

اُدھر بیروت کے حالات بھی بہت سنگین ہوتے جا رہے تھے۔ شہر کی گلیوں، محلوں اور بازاروں میں مظلوم فلسطینیوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ عمارتیں تباہ ہو رہی تھیں۔ گھروں میں آگ لگی تھی۔ اسکول، کالج، اسپتال ملبوں کا ڈھیر بن گئے تھے۔ کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ فیض صاحب پر ان دنوں دو طرح کے دباؤ تھے۔ ایک موت کا خطرہ دوسرے وطن سے دوری کا عذاب۔ اس زمانے میں وہ بیحد مضطرب اور فکر مند رہتے تھے۔ یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ صبح سے شام تک ایک نامعلوم لمحے کا انتظار۔

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

وقت کچھ عجب وحشت ناک اور ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ خواب اور امید کے درمیان معلق وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام، شام سے رات۔ ایک ایک لمحہ ان کے لئے سوہان روح تھا۔ 1980ء میں لکھی جانے والی اس نظم کو پڑھ کر ان کی ذہنی اور قلبی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

وہ در کھلا میرے غمکدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے

وہ آ گئی شام اپنی راہوں میں
فرش افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے
وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے
وہ دوپہر آئی آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے
یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
پہ کون کب آیا کب گیا ہے
نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

فیض صاحب کی دوست اور سوانح نگار لد میلا وسلئیوا نے اس نظم کو ایک اور ہی نظریہ سے پرکھا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ ''یہ نظم فیض نے 1980ء میں بیروت میں ماسکو سے لوٹنے پر لکھی۔ اس میں بظاہر ماسکو کا نام ونشان تک نہیں ہے لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ روز و شام کے دکھ اور تشویش، یہ تکلیف دہ سوال جن کے جواب کا انتظار تھا اور جو ملے نہیں من کا یہ سارا بوجھ ماسکو سے لایا ہوا سامان تو نہیں تھا؟''

پھر برق فروزاں ہے

ایفروایشیائی موضوعات

پھر برق فروزاں ہے سروادی سینا
پھر رنگ پہ ہے شُعلہ رخسار حقیقت
پیغام اجل، دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدہَ بینا

- بول
- ایرانی طلباء کے نام
- AFRICA COME BACK
- سرِ وادی سینا
- ویبقیٰ وجہ ربک
- دو نظمیں فلسطین کے لیے

بول

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ میں سامراجی قوتوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کی ایک پُر زور لہر اٹھی۔ ایفروایشیائی ملکوں نے بڑے پیمانہ پر آزادی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اُن حریت پسندوں میں بڑے بڑے نامور اور حوصلہ مند راہنما شامل تھے۔

چونکہ اُن دونوں براعظموں کے مزاج میں فرق تھا اس لیے اُن کی تحریکیں بھی ایک دوسرے سے مختلف انداز لئے ہوئے تھیں۔ ایشیا میں تعلیم کا تناسب افریقہ سے بہت بہتر تھا اور یہاں کی ''لیڈر شپ'' بھی اسی سبب سے نسبتاً ''پُر امن'' تھی۔ ایشیائی ملکوں کے برخلاف افریقہ میں جہاں بھی جبر واستبداد اور ظلم و بربریت کا زور تھا وہاں اکثر اس کا مقابلہ طاقت سے کیا گیا۔ سارے سامراجی ملک افریقہ کی محکوم قوموں کے ساتھ اب تک وہی سلوک کرتے تھے جو صدیوں سے اُن پر روا رکھا گیا تھا۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ نے افریقی حریت پسندوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں۔ سیاسی سرگرمیوں کو مستقل طور پر معطل رکھا۔ سیاسی لیڈروں کو لمبے لمبے عرصہ کے لیے قید خانوں میں بند کر دیا۔ بڑی تعداد میں بہت سے رہنماؤں کو جلاوطن کیا گیا۔ عام آدمیوں کے ساتھ حکمرانوں کا سلوک حد درجہ نازیبا تھا۔ آج جب ہم ابوغریب گوانتے مالا بے کے زندانوں کا ذکر سنتے ہیں تو ہمارا خیال اُسی دور کے جور وستم کی طرف جاتا ہے۔ یہی ترقی یافتہ قومیں تھیں جنھوں نے تب بھی انسانوں کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔ غرض مغربی ملکوں کی نوآبادیاں صدیوں اُن کی چیرہ دستیوں کا شکار رہیں جہاں ذرا سی شورش ہوتی۔ یہ آمرانہ حکومتیں قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ افریقہ کو کبھی ظلم اور جبر سے نجات نہ مل سکے گی۔ لیکن وقت بدل رہا تھا، افریقہ جاگ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک جری اور مقبول حریت پسند رہنما پیدا ہوتے رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے سے آغاز ہونے والا یہ سلسلہ برس ہا برس جاری رہا اور افریقہ میں انکرما، لومبا، جوموکنیاٹا، والٹر سسلو، احمد بن بیلا، جمال عبدالناصر، کینتھ کونڈا، سی کے طورے اور نیلسن منڈیلہ جیسے پُرعزم اور باہمت لیڈر پیدا ہوئے۔ ساری دُنیا یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اگلی صدی افریقہ کی صدی ہوگی۔ افریقی ملکوں کی حمایت میں دوسرے محکوم ملکوں میں بھی بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی خاص طور پر سوشلسٹ ملکوں نے کہ جو سوویت یونین کے طرف داروں میں سے تھے، افریقہ

میں چلنے والی تحریکوں کا مکمل ساتھ دیا۔ برصغیر کے ترقی پسند شاعروں نے بھی اپنے محکوم ومظلوم افریقی بھائیوں کے حق میں آواز اُٹھائی۔ اردو کے مشہور شاعر ساحرلدھیانوی نے افریقی حریت پسند لیڈر پیٹرک لومبا کے قتل پر ایک بڑی جذباتی نظم لکھی:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سُراغ
سازشیں لاکھ اُڑھاتی رہیں ظلمت کے نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

فیض صاحب اس صورتِ حال سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے بھی سامراجیوں کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کی اُس جدو جہد میں حصہ لیا۔ ایک بار اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ ''انگریز اور دیگر سامراجی آزادی کی اس تند و تیز ہوا میں چراغ سحری کی طرح پھڑ پھڑا کے گُل ہوگئے۔ افریقہ اور ایشیا میں آزادی کی لہر دوڑ گئی۔ افریقہ اور ایشیا کے عوام جاگ اُٹھے۔ سو ہم نے بھی لکھا تھا۔''

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

ایک زمانے میں یہ اشعار جلسوں، جلوسوں اور طلباء کی محفلوں میں سنائے جاتے تھے۔ اس نظم کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس نظم کو فیض صاحب کا شعری نصب العین کہا جاتا ہے۔

☆......☆......☆
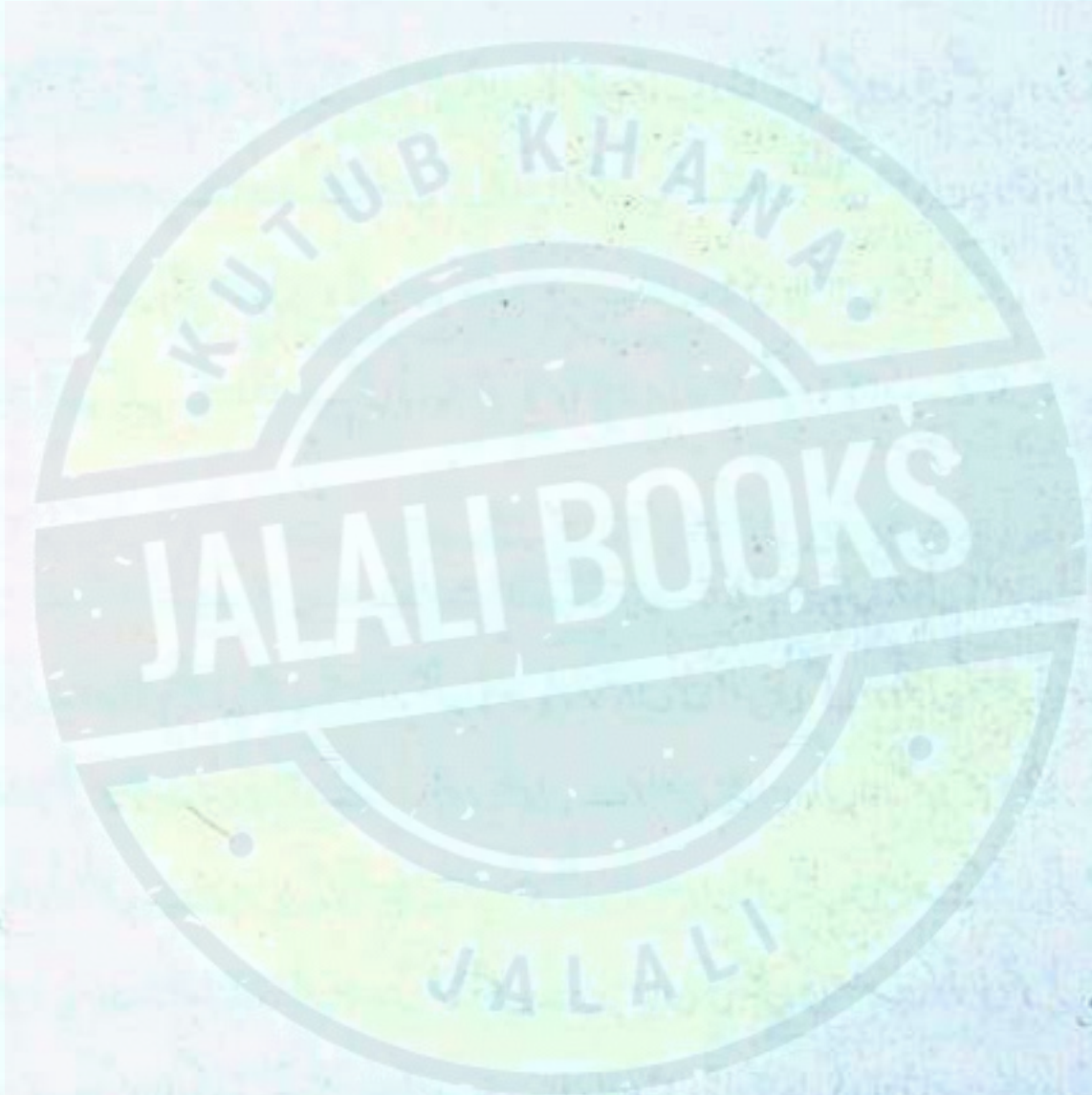
ایرانی طلباء کے نام

1950ء کا عشرہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے لئے تبدیلیوں کا عشرہ تھا۔ بادشاہتیں ختم ہو رہی تھیں اور فوجی آمریت ان کی جگہ لے رہی تھی۔ مصر، عراق، شام اور دوسرے بہت سے ملکوں میں فوجی انقلاب آئے اور مطلق العنان بادشاہوں کی جگہ مطلق العنان فوجی ڈکٹیٹر حکمران بن گئے۔ اس کھیل میں مغربی ممالک اور خاص طور پر دونوں بڑی طاقتیں شامل تھیں۔ لیکن ہر ملک میں ان کی سازشیں کامیاب نہ ہوئیں اور کہیں کہیں ایسے انقلاب بھی آئے جو سامراجیوں کے عزائم کو ناکام کرنے میں کامیاب ہوئے، جیسے مصر اور ایران میں۔

ان دونوں ملکوں کے حالات ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ جو کام مصر میں جمال ناصر نے کیا وہی کام ایران میں مصدق نے کرنے کی کوشش کی۔ دونوں ملکوں میں جابر اور عیش پسند بادشاہوں کی حکمرانی تھی، دونوں کو مغربی طاقتوں نے اپنے شکنجہ میں جکڑا ہوا تھا۔ دونوں کے معاشی حالات بہت ابتر تھے اور دونوں ملکوں کے عوام پریشان حال اور ظلم وستم کا شکار تھے۔

مصر میں برطانیہ اور فرانس سے نہر سویز کے قومیانے کی جنگ تھی اور ایران میں تیل کی صنعت کو قومی تحویل میں لینے کی۔

ایران کے اس قوم پرست رہنما کا نام محمد مصدق تھا جس کے سر ایران کی تیل کی صنعت کو قومی تحویل میں لینے کا سہرا ہے۔ ڈاکٹر مصدق 1880ء میں ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ ایران میں شاہ قاچار کی بادشاہت کا دور تھا۔ انہوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم ایران اور فرانس سے حاصل کی اور سویزرلینڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ قاچار حکمرانوں کے زمانے میں انہوں نے بہت سے اہم عہدوں پر کام کیا اور 1921ء میں ایران کے وزیر خارجہ مقرر کیے گئے۔ لیکن جب 1925ء میں رضا خاں نے اقتدار سنبھالا تو مصدق نے ان کی شدید مخالفت کی اور یوں شاہ رضا خاں کے مخالفوں میں شامل ہو گئے۔ شدید سیاسی دباؤ کی وجہ سے انہیں ریٹائرڈ ہو کر عام زندگی کی طرف لوٹنا پڑا۔ لیکن جب رضا خاں اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہو گئے تو مصدق پھر سے سیاست کی طرف لوٹ آئے۔ وہ مجلس کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے قوم پرستی کے حوالے سے زبردست مہم شروع کی۔ جلد ہی وہ عوام میں بے حد مقبول ہو گئے۔ ڈاکٹر مصدق نے ایران کے تیل کے کنوؤں کو قومی ملکیت میں لینے کی تحریک چلائی۔ دراصل تیل کی صنعت کا سارا انتظام وانصرام ایک کمپنی کے ذمہ تھا جس کا نام "اینگلو پرشین آئل کمپنی" تھا اور معاہدہ کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ آمدنی کا بڑا حصہ انگلستان کو

چلا جاتا تھا۔اس سلسلہ میں مصدق نے زبردست مہم چلائی اور عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی۔ اس طرح شاہ ایران اوران کے درمیان زبردست رسہ کشی شروع ہوگئی۔آخر کار مجبور ہوکرانہیں وزیراعظم نامزد کرنا پڑا۔مگر اقتدار کی کشمکش پھر بھی جاری رہی اور بالآخر مصدق نے شاہ کو ایران چھوڑنے پر مجبور کردیا۔لیکن شاہ ایران کی یہ جلاوطنی بڑے مختصر عرصہ کے لئے تھی۔مغربی طاقتوں خصوصاً امریکہ سے ساز باز کے نتیجہ میں مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔شاہ واپس آگیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور اپنے محبوب رہنما کے لئے حکومت کے خلاف صف آرا ہوگئے۔سارے ملک اور بالخصوص تہران میں کشت وخون کا بازار گرم ہوا جسے بہت بے رحمی سے کچل دیا گیا۔تہران کی سڑکیں انسانی خون سے سرخ ہوگئیں۔ان شہید ہونے والوں میں ایک بڑی تعداد نوجوان طالب علموں کی تھی۔

اسی سانحہ سے متاثر ہوکر فیض صاحب نے اپنی نظم ''ایرانی طلباء کے نام'' حیدرآباد جیل میں لکھی۔اس کے بارے میں فیض صاحب نے ایلس کو اپنے خط میں لکھا تھا۔

''میں گذشتہ دنوں مسلسل لکھنے میں مصروف رہا۔بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ خیال کا سلسلہ بیچ میں ٹوٹ جائے تو پھر ٹوٹی ہوئی کڑیاں دوبارہ جوڑنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔اس ہفتہ میں نے ایران اور مصر کے شہید طلباء پر ایک نظم شروع کی ہے۔جیل میں آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنی کسی چیز سے کچھ اطمینان ہوا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اظہار کی جس ہیئت اور پیرائے کی تلاش تھی اس نظم میں پہلی بار ہاتھ آئے ہیں۔یہ بالکل خلاف روایت انداز ہے۔''

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لُٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے

اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیئے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی "بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟"
"اے پوچھنے والے پردیسی
یہ طفل و جواں
اُس نور کے نورس موتی ہیں
اُس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھُوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہُوئی من من، تن تن،
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں،
جگمگ جگمگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

☆......☆......☆

AFRICA COME BACK

افریقہ کی تحریک آزادی کے حوالے سے فیض صاحب کی یہ ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ہے ''آجاؤ افریقہ''۔ یہ 1955ء کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرق وسطیٰ اور افریقہ سے بری بری خبریں آ رہی تھیں۔ فیض صاحب ابھی جیل ہی میں تھے۔ اُس دور میں انہوں نے دُنیا بھر کے اسیروں اور محکوموں کے لیے نظمیں لکھیں۔ اُن کے جیل کے ساتھی میجر اسحاق نے لکھا ہے۔ "اُن کے درد دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج وغم کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ کینیا کے لوگوں پر بے پناہ ظلم وستم اور مصائب فیض صاحب کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے۔ وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے افریقی بن گئے ہیں۔ اُن کی نظم ''آجاؤ افریقہ'' اس کی مظہر ہے۔ یہ افریقی حریت پسندوں کا ترانہ ہے جو مختلف افریقی ملکوں میں ڈھول کی تھال پر ایک مخصوص رقص کے ساتھ گایا جاتا تھا۔ اس میں ولولہ ہے، جوش ہے اور توانائی ہے۔''

میرے ایک دوست اظفر شفقت نے ایک بار فیض صاحب کو یہ ترانہ اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے ریہرسل کرتے دیکھا۔ فیض صاحب اُن دنوں کراچی کے عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج کی سالانہ تقریبات کے موقع پر انہوں نے اپنی اس نظم کو رقص کی صورت میں اسٹیج پر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں حصہ لینے والوں میں زیادہ تر طالب مکرانی یا شیدی تھے، یہ افریقی نسل کے لوگ جو کراچی میں کھڈا اور لیاری کے علاقوں میں رہتے ہیں۔ اُن کا رقص روایتی افریقی رقص ہے جس میں زور بھی ہے شور بھی ہے اور بلند آہنگی بھی۔ مجھے یقین ہے "فیض احمد فیض" کی یہ ڈرامائی پیشکش یقیناً بہت کامیاب رہی ہوگی۔ یہ نظم انتہا درجہ کی موسیقیت لیے ہوئے ہے۔ اس کو سن کر اور اسٹیج پر اس کی پرفارمنس نے یقیناً دیکھنے والوں کا لہو گرما دیا ہوگا اور افریقی ڈھول کی تال نے انہیں مست کر دیا ہوگا۔

آجاؤ میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ

آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال

''آجاؤ ایفریقا''

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھالیا

آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑالیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
''آجاؤ   الفریقا''
پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
''آجاؤ   الفریقا''
جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
''آجاؤ   الفریقا''
دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ الفریقا"
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں الفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تُو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
''آجاؤ   الفریقا''
آؤ ببر کی چال
''آجاؤ   الفریقا''

☆......☆......☆

سرِ وادیٔ سینا

میں ذاتی طور پر اس نظم کو فیض صاحب کی بہترین نظموں میں شمار کرتا ہوں۔ اس کا آہنگ، اس کے الفاظ کا زیرو بم، اس کا پیغام اسقدر جاندار اور اثرانگیز ہے کہ سننے والا یا پڑھنے والا دیر تک اس کے سحر میں گرفتار رہتا ہے۔ یہ نظم ان بڑی نظموں میں سے ایک ہے جس نے خصوصی طور پر قارئین اور سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز کیا اور جسے ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں قبول عام کا درجہ ملا۔

نظم کا موضوع 1956ء کی عرب اسرائیل جنگ ہے۔ یہ جنگ جس میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل ایک طرف تھے اور عرب دنیا کے ملکوں نے مصر کا ساتھ دیا تھا۔ اس جنگ کا سبب ''نہر سویز کا بحران'' تھا اور اسے تاریخ میں پہلی عرب اسرائیل جنگ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

نہر سویز دنیا کی ایک لمبی نہر ہے، جو بحیرۂ روم کو بحیرۂ احمر سے ملاتی ہے۔ اس کو عربی زبان میں ''قناۃ السویس'' کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر کے بعد یورپ سے ایشیائی ملکوں کے سمندری سفر کا فاصلہ بہت گھٹ گیا اور اس طرح تجارتی نقطۂ نظر سے یہ ایک بے حد سودمند منصوبہ ثابت ہوا۔ نہر سویز کی تاریخ کچھ اس طرح ہے۔

1854ءمیں ایک فرانسیسی سفارت کار نے مصر کے حاکم محمد سعید پاشا سے جو خلافت عثمانیہ کی جانب سے مصر کے وائسرائے تھے، ایک معاہدہ کیا جس کے تحت مصر نے ایک فرانسیسی کمپنی کو نہر سویز کی کھدائی کا کام سپرد کیا۔ اس کی تعمیر میں چند برس لگے جس کے بعد نہر کو بحری جہازوں کی آمدورفت کے لئے کھول دیا گیا ''نہر سویز کمپنی'' کے نام سے قائم ہونے والی اتھارٹی کو جسے نہر کے علاقہ پر اختیار دیا گیا تھا، فرانس اور مصر کی مشترکہ کمپنی تھی مگر 1922ء میں مالی دشواریوں کے سبب مصر کے خدیو اسماعیل نے برطانیہ کو اپنے حصص فروخت کردیے اور اس طرح سویز کمپنی برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ ملکیت میں آگئی۔ ایک معاہدہ کے تحت برطانیہ اور فرانس کو 1956ء تک اس ملکیت کے حقوق حاصل تھے اس کے بعد نہر کا انتظام وانصرام مصر کی حکومت کے سپرد ہو جانا تھا۔ مگر 1956ء میں جب مصر کی حکومت نے یہ مطالبہ کیا تو انگریز اور فرانسیسی دونوں نے اس معاہدے کی پاسداری کرنے سے انکار کردیا۔ ان مغربی طاقتوں کا خیال تھا کہ ماضی کی طرح وہ اب بھی مصر کے حکمرانوں کو دھونس دھاندلی کے ذریعہ اپنی بات منوانے پر مجبور کرلیں گے۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ مصر میں 1952ء کے انقلاب نے ملک کو بادشاہت سے نجات دلادی تھی۔ مصر کا آخری بادشاہ فاروق اپنا بوریا بستر سمیٹ

کر ملک سے چلا گیا تھا۔ چند برس پہلے مصر کی فوج کے دو جرنیلوں کی قیادت میں انقلاب آیا جس کے بعد جنرل محمد نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ پھر چند برسوں بعد جمال عبدالناصر عوامی مقبولیت کی بنا پر ایک عظیم قائد کے طور پر ابھرے اور مصر کے صدر منتخب ہو گئے۔

مصر کی نئی حکومت پر فرانس اور برطانیہ کا سخت دباؤ تھا کہ مصر ان کی شرائط تسلیم کر لے اور نہر سویز کے انتظامات بدستور ''برطانیہ اور فرانس'' کے پاس رہیں۔ لیکن جواں سال اور بلند حوصلہ جمال عبدالناصر نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ خون کا آخری قطرہ بہنے تک مصری قوم اپنے اس قومی اثاثے سے دستبردار نہیں ہوگی۔ ساتھ ہی ناصر نے نہر سویز کو قومیانے کا اعلان کر دیا۔ یہ باقاعدہ جنگ کا آغاز تھا۔ برطانیہ اور فرانس نے چھاتہ بردار فوج نہر سویز کے علاقے میں اتار دی۔ اُدھر اسرائیل نے بھی موقع غنیمت جان کر مصر پر حملہ کر دیا اور صحرائے سینائی کے بہت بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے۔ اقوام متحدہ میں مصر کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اور اسرائیل کا دباؤ نہ صرف مصر بلکہ مشرق وسطیٰ کے دوسرے اسلامی ملکوں پر بھی بڑھتا گیا۔ شاید حالات مزید تشویشناک صورت اختیار کر لیتے مگر ''سوویت یونین'' نے برطانیہ اور فرانس کو دھمکی دے دی کہ اگر انہوں نے اپنی چھاتہ بردار فوجیں فی الفور واپس نہ بلائیں اور اسرائیل نے مصر کے علاقے خالی نہ کیے تو ان ملکوں کے بڑے شہروں کو روسی راکٹوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس طرح سامراجی طاقتوں کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اسرائیل کو بھی منہ کی کھانا پڑی اور اس کا اصل مقصد جو جمال عبدالناصر کی عزت اور شہرت پر ضرب لگانا تھا، ناکام ہو گیا۔

وہ ایک عظیم لیڈر تھے۔ 1918 میں مصر کے شہر اسکندریہ کے قریب ایک گاؤں ''بنی مور'' میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ وہ خود کہا کرتے تھے ''مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں مصر کے ایک غریب گاؤں کا باشندہ ہوں۔ اور اس سے بھی زیادہ فخر مجھے اس پر ہے کہ میں ایک بہت ہی مفلس گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔'' تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے مصر کے ایک فوجی اسکول میں داخلہ لیا۔ تربیت کی تکمیل کے بعد فوج کی پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ نہر سویز کو قومیانے کے فیصلے کے بعد جمال عبدالناصر کی شہرت نہ صرف عرب ممالک بلکہ ساری دنیا میں پھیل گئی اور انہیں ایک عظیم لیڈر کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔

جمال عبدالناصر کی مقبولیت سے مشرق وسطیٰ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جسے ''عرب نیشنل ازم'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلی بار عرب ملکوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ متحد ہوں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ ناصر کی قد آور شخصیت نے عرب دنیا کے عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور عرب بادشاہوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ مصر کے فوجی انقلاب کے بعد دوسرے عرب ملکوں میں بھی یکے بعد دیگرے انقلاب آنا شروع ہوئے۔ شام، عراق، یمن، لیبیا یہاں تک کہ دور دراز واقع دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک پاکستان تک میں فوجی انقلاب کے ذریعہ حکومت بدل گئی۔

جمال عبدالناصر کی کوششوں کے باوجود عرب ملکوں میں اتحاد قائم نہ ہو سکا۔ اس نااتفاقی کا سب سے زیادہ فائدہ اسرائیل نے اُٹھایا۔ اس نے فلسطین پر اپنے ناجائز قبضہ کو مضبوط تر کر لیا اور 1956ء کی اخلاقی شکست کا بدلہ لینے کے لئے باقاعدہ جنگ کا آغاز

کر دیا۔ جمال عبدالناصر کی مقبولیت اور ان کے عرب اتحاد کی پالیسی اسرائیل کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ نتیجتاً جون 1967ء کی جنگ میں اس نے عرب ملکوں کو عبرتناک شکست دی اور عرب اتحاد ایک بار پھر پارہ پارہ ہو گیا۔

اسرائیل کی فتح نے عربوں پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ پھر اس سے سنبھل نہ سکے۔

حالات تھے جن سے متاثر ہو کر فیض صاحب نے اپنی یہ مشہور نظم لکھی تھی۔

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادی سینا
اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیاں کوئی اُترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

☆......☆......☆

ویبقیٰ وجہ ربک

1979ء کے موسم گرما میں مَیں نے ایک سینئر آرمی جنرل کے ساتھ جرمنی اور انگلستان کا سفر کیا۔ ابھی بھٹو صاحب کی پھانسی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پاکستان اُداس تھا۔ میں بھی اُداس تھا اور میں نے محسوس کیا میرے ہمسفر آرمی جنرل جو ضیاء الحق کی ''کچن کیبنٹ'' کے ممبر تھے وہ بھی اُداس تھے۔ سانحہ ہی کچھ ایسا تھا۔

جرمنی میں ہفتہ گزارنے کے بعد جب ہم لندن پہنچے تو مجھے معلوم ہوا کہ فیض صاحب لندن میں ہیں اور زہرہ نگاہ کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اپنے لندن قیام کے دوران میں نے ایک شام اُن کے ساتھ گزاری۔ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا وہ بڑے ملول اور مضطرب ہیں۔ کھانے کے بعد جب لوگ جانے لگے تو اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ٹھہر جاؤں۔ میں نے افتخار عارف کو بتایا جن کے ساتھ میں آیا تھا تو اُنہوں نے کہا آپ ٹھہریں میں انتظار کرلوں گا۔

فیض صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور ڈیسک کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگے۔ جب انہوں نے یہ کام ختم کرلیا تو ایک کاغذ پر لکھی ہوئی دو نظمیں مجھے عنایت کیں اور کہا ''پاکستان لے جاؤ، دوستوں میں تقسیم کردینا۔ ان میں سے ایک نظم ہم نے ایران کے انقلاب پر لکھی ہے۔'' نظم کا عنوان تھا۔

ویبقیٰ باسم ربک

بعد میں انہوں نے اس کا عنوان تبدیل کر کے ''ویبقیٰ وجہ ربک'' کردیا تھا۔ امام خمینی کی واپسی اور انقلاب ایران کو ابھی چند ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔

میں نے سوال کیا فیض صاحب ایران کا انقلاب تو اسلامی انقلاب ہے۔ پھر آپ نے اس پر نظم کیوں لکھی۔ بولے ''بھئی انقلاب اسلامی اور غیر اسلامی نہیں ہوا کرتے۔ جب لوگ تخت وتاج کو الٹنے اور بادشاہی کو تاراج کرنے کے لیے سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئیں تو پھر یہ عوامی انقلاب بن جاتا ہے۔''

دُنیا کی تاریخ میں اور خصوصاً ایشیا کی تاریخ میں 1979ء ایک بہت یادگار سال ہے۔ اس سال کے آغاز میں امام خمینی پندرہ برس کی جلاوطنی کے بعد وطن واپس لوٹے اور ایران میں ڈھائی ہزار سالہ پُرانی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا۔

احمد فراز، زہرہ نگاہ، فیض صاحب، گوپی چند نارنگ، شہرت بخاری، جمیلہ دہلوی اور افتخار عارف

امام آیت اللہ روح اللہ خمینی 1902ء میں وسطی ایران کے شہر خمین میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور جوانی کا دور خمین میں گزارا اور 1922ء میں مستقل طور پر شہر قُم میں آ کر آباد ہو گئے۔ آپ نے راہِ خدا میں قیام کو واجب قرار دیتے ہوئے قوم کو استعماری حکومت کے خلاف مقابلہ کی دعوت دی۔

شہنشاہِ وقت پہلوی خاندان کے بانی محمد رضا خان نے اپنے ایجنٹوں کو حکم دیا کہ امام خمینی کی سرگرمیاں محدود کر دیں مگر انہوں نے رُشد و ہدایت کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور ملوکیت کے خلاف یہ جہاد شاہ ایران کے بیٹے رضا شاہ پہلوی کے دور میں بھی جاری رہا۔ عوام نے تہران اور دوسرے شہروں میں حکومت کے خلاف زبردست مظاہرے کیے اور شدید احتجاج کا راستہ اختیار کیا۔ 1963ء میں شاہ کی فوج نے ٹینکوں کی مدد سے تحریک کو کچلنے کی کوشش کی اور امام خمینی کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایران سے نکل کر پہلے عراق گئے۔ بعدازاں ایران کے احتجاج پر وہاں کی حکومت نے بھی امام کو نکال دیا۔ اُن کا اگلا ٹھکانہ فرانس تھا جہاں انہوں نے وطن واپسی تک ایک چھوٹے سے گاؤں ''نوفل ناشو'' میں قیام کیا۔ اُن کے زیرِ قیادت برپا ہونے والے انقلاب کے نتیجے میں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کو ملک چھوڑنا پڑا اور یکم فروری کو اس انقلاب کے بانی امام خمینی نے فاتحانہ انداز میں تہران کے مہرآباد ائیر پورٹ پر قدم رکھا۔ اس آمد کا احوال صاحبِ طرز نثر نگار مختار مسعود نے بڑے موثر اور دل پذیر انداز میں اپنی کتاب ''لوحِ ایام'' میں قلم بند کیا ہے۔

> ''جس دن ایران میں بادشاہیت کا خاتمہ ہوا میں اُس روز وہاں موجود تھا۔ اس بیداری کے ساتھ سائرس کی جرأت و حکمت کے بل پر تعمیر کی ہوئی سلطنت سے لے کر خود ساختہ پہلوی خاندان کی حکومت تک، ایران میں بادشاہت کا جو طویل تسلسل تھا وہ بالآخر اڑھائی ہزار سال کے بعد اچانک ختم ہو گیا۔ سائرس ایران کا پہلا بادشاہ تھا اور رضا شاہ آخری۔''
>
> مصنف کے روزنامچے سے چند اقتباسات۔
>
> ''یکم فروری 1979ء کا دن ہے۔ جلاوطن آیت اللہ خمینی وطن واپس آ رہے ہیں۔ پندرہ دن پہلے جو شخص بے بسی اور نامقبولی کے عالم میں تخت اور ملک چھوڑ کر چلا گیا وہی شخص تھا جس نے پندرہ سال پہلے بادشاہ وقت کی حیثیت سے ایک شخص کو جلاوطنی کی سزا سنائی تھی۔ سزا یافتہ کی سزا بالآخر ختم ہو گئی۔ وہ آج واپس آنے والا ہے۔ سزا دینے والے کی جلاوطنی اب جا کے شروع ہوئی ہے اور عمر بھر کے لیے ہے۔ جانے والا شہنشاہ اور آنے والا درویش۔''
>
> ''4 فروری 1999ء خانہ جنگی شروع ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ تھانوں اور چھاؤنیوں پر عوامی قبضے سے بات چلی اور دور تک نکل گئی۔ عوام نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن پر قبضہ کر لیا۔ عوام نے وزیراعظم کے دفتر پر قبضہ کر لیا۔ عوام نے گلستان پیلس پر قبضہ کر لیا۔ عوام نے

تہران کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو گرفتار کر لیا۔ ریڈیو بولتا ہے ''توجہ بفرمائید'' ''توجہ بفرمائید''، ''ایں صدائے انقلاب۔'' ٹیلی ویژن پر نیا ترانہ بجایا گیا۔ اس نئے ترانہ کے ساتھ نیا ایران وجود میں آ گیا۔ اس وقت شام کے سات بجے ہیں۔ بادشاہت کا سورج غروب ہو گیا ہے۔ میں نے اسے غروب ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

یہ تھا انقلاب ایران کا احوال جو مختار مسعود نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اور فیض صاحب کو یقین تھا کہ دنیا کی ہر مظلوم اور محکوم قوم کبھی نہ کبھی ایسا دن ضرور دیکھے گی۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی

جو منظر بھی ہے ناظر بھی

گونجے گا انا الحق کا نعرہ

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلقِ خدا

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

کافی وقت گزر جانے کے بعد فیض صاحب سے ایک شاعر صحافی مرحوم حسن رضا نے انٹرویو کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ ایرانی انقلاب کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

فیض صاحب نے جواب دیا تھا۔

''یہ اپنی قسم کا بڑا انقلاب ہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد اس قسم کا انقلاب دنیا میں نہیں آیا۔ روس، چین، ویت نام وغیرہ کے انقلابوں میں طرفین کی فوجوں کے درمیان جنگ تھی۔ ایران میں براہ راست عوام کی فوج اور حکومتی اداروں سے لڑائی ہوئی ہے۔ یہاں پر عوام نے فوج کو ہرایا ہے۔''

☆......☆......☆

دو نظمیں فلسطین کے لیے

فلسطین فیض صاحب کے دل سے بہت قریب تھا۔ انہوں نے کہیں کہا تھا کہ فلسطین سے مجھے ایسی ہی محبت ہے جیسے اپنے وطن سے۔ فلسطین میں آزادی کی تحریک کے رہنما یاسر عرفات سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ انہیں کے اصرار پر انہوں نے لوٹس (Lotus) کی ایڈیٹری قبول کی۔ یہ ایفرو ایشین (Afro-Asian) ایشین جریدہ یاسر عرفات کی سربراہی میں نکلتا تھا۔ ان دنوں جب بیروت PLO کا ہیڈ کوارٹر تھا فیض صاحب نے اس شہر میں اپنا ڈیرہ جمایا۔ اس طرح وہ براہ راست فلسطینی مجاہدین کی صف میں شامل ہو گئے۔ بیروت ان دنوں فلسطینیوں کی جنگ کا مرکزی مقام اور یاسر عرفات کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ فیض صاحب نے بڑی دل جمعی کے ساتھ اس رسالے کے فروغ اور ترقی کے لیے کام کیا اور جلد ہی خاطر خواہ نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ فیض صاحب اس کے باوجود کہ فلسطینیوں سے ربط ضبط میں زبان کا مسئلہ درپیش تھا، اپنے خلوص اور Commitment کی بنا پر مجاہدین میں بے حد مقبول ہو گئے۔ فروری 1981ء میں فیض صاحب کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ''لوٹس'' میں ان کے بارے میں ایک بڑا عمدہ مضمون شایع ہوا اور اس موقع پر ان کو تحریک آزادی کی جانب سے ایک تمغہ بھی دیا گیا۔ ان کو مبارکباد کے طور پر خود یاسر عرفات نے ایک خط لکھا۔

شاعر بزرگ و مجاہد برادر فیض احمد فیض

سلام انقلابی کے بعد عرض گزار ہوں کہ ہمیں آپ کی سترویں سالگرہ کی خبر ملی ہے۔

میں اس موقع کو غنیمت جان کر اپنی اور تنظیم آزادی فلسطین کی سربراہ کونسل کے اراکین کی طرف سے اور عرب اور فلسطینی عوام کی جانب سے آپ کے لیے دلی تمناؤں کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو صحت اور خوش بختی نصیب ہو۔

فلسطینی عوام نے آپ کی ذات میں ایک ترقی پسند اور امن کے لیے جدوجہد کرنے والا شاعر پایا ہے۔ آپ ایک عوام دوست انسان ہیں جو عوامی بہبود، ترقی اور آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ دنیا کی امن اور سلامتی کے حامی ہیں۔ فلسطینی عوام آپ کی عوام دوستی اور فلسطین کے مسئلہ پر آپ کی جدوجہد اور کوششوں کے لیے آپ کے جذبہ اور عمل پر فخر کرتے ہیں۔

فیض صاحب، یاسر عرفات کے ساتھ

آپ کی مخلصانہ اور صداقت پر مبنی شاعری جس میں فلسطینی عوام کا ذکر ہے اور خاص طور پر ان کے بچوں اور انقلابیوں کا تذکرہ ہے عدم آباد تک ایک ایسا نمونہ پیش کرتی رہے گی جس سے برادرانہ صداقت اور مخلصانہ محبت اُجاگر ہوتی ہے۔

ہم آپ کے لیے خوش بخت زندگی اور درازی عمر کے متمنی ہیں۔ آپ کی خدمت میں بہترین تمناؤں اور احترام کے ساتھ اور اس نعرے کے ساتھ ''انقلاب فتح تک''

آپ کا مخلص

یاسر عرفات

فیض صاحب تقریباً تین سال بیروت میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران میں انہوں نے فلسطین کے موضوع پر شاعری بھی کی۔ مضامین بھی لکھے اور مختلف مقامات اور موقعوں پر انٹرویو بھی دیے۔ اُن کی طبیعت پر اس تجربہ کا گہرا اثر تھا۔ بیروت سے واپس آجانے کے بعد بھی PLO کی جنگ، اسرائیل کی جارحیت اور فلسطینیوں کی تحریک آزادی سے انہوں نے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنا دل وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ ایک بار انہوں نے فلسطینیوں کے عزم اور حوصلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کی جرأت اور ان کا حوصلہ ناقابل تسخیر ہے۔ انہوں نے اپنی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اگر عزم و ہمت ہو تو بڑی سے بڑی طاقت سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کسی انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

''پہلے ہی دن جب بیروت پر ہوائی حملہ ہوا تو اس میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ پھر اسرائیل نے لبنان میں اپنی فوج اُتار دی اور اس کے بعد کبھی صبح کبھی شام اسرائیل کی طرف سے ہوائی حملے ہوتے رہے، مگر فلسطینی بڑی بے جگری سے لڑے۔ ان کا حوصلہ اور جرأت قابل داد ہے۔ فلسطینی قیادت کے لوگ خاص طور پر یاسر عرفات ایک گلی سے دوسری گلی، ایک مکان سے دوسرے مکان منتقل ہوتے رہے اور بمباری ان کا تعاقب کرتی رہی۔''

فیض صاحب نے ایک چشم دید گواہ کے طور پر یہ احوال بیان کیا ہے۔

یہ صورتِ حال طویل عرصہ تک رہی۔ سڑکوں پر لوگ تڑپ تڑپ کر جان دیتے رہے۔ مکان، بازار اور بلند و بالا عمارتیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ لوگوں نے فیض صاحب کو بیروت چھوڑنے کا مشورہ دیا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ان کی اس محبت کو دیکھتے ہوئے یاسر عرفات نے فیض صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ ''وہ بھی ہم میں سے ہیں۔''

اشفاق حسین نے اپنی کتاب ''فیض حبیب عنبر دوست'' میں لکھا ہے کہ فیض نے اپنے قیام بیروت کے زمانے میں فلسطین سے متعلق چھ نظمیں لکھیں اور ہر نظم ایک مختلف کیفیت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کہیں کسی بچے کو لوری دی جارہی ہے تو کہیں مجاہدوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ترانہ لکھا جارہا ہے، کہیں پردیس میں کام آنے والے فلسطین شہیدوں کے پرچم کی بات کی جارہی ہے تو کہیں

اس دن کی کیفیت کا بیان ہے جب فلسطینی حریت پسند یاسر عرفات کے ہمراہ بین الاقوامی نگرانی میں بیروت سے تیونس کی طرف جاتے ہیں۔ اس دن فیض صاحب نے ''عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا'' جیسی درد بھری نظم لکھی۔

فیض صاحب کو فلسطین کے کاز سے جو خاص تعلق تھا وہ سب پر عیاں ہے۔ اشفاق احمد کے ساتھ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا۔ ''جب تک ایک فلسطینی باقی ہے۔ فلسطین باقی ہے۔''

فیض صاحب فلسطینیوں کی دلیری اور بلند حوصلگی سے بے حد متاثر تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ اس سارے وقت انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی صبر اور دانشمندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ بڑے تحمل کے ساتھ جنگ کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرتے رہے۔ اس دوران میں شہر میں کھانے پینے کی اشیا ملتی رہیں۔ ضروریاتِ زندگی اور ادویات کی دوکانیں کھلی رہیں۔ اس سارے عرصے میں ایک دن کے لئے بھی فلسطین کا ریڈیو یا اخبار بند نہیں ہوئے۔ اس زمانے کی یہ دو نظمیں ہمیشہ ان کو ان حالات کی یاد دلاتی رہیں۔ پہلی نظم خراجِ تحسین ہے ان فلسطینی مجاہدوں کے لئے جو پردیس میں کام آئے۔

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت، تیری یادوں کی کسک ساتھ گئی
تیری نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
سارے اَن دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا
دُور پردیس کی بے مہر گزر گاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمیں پر بھی کُھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

دوسری ایک لوری جو اپنے اندر سارے درد اور سارے غم سمیٹے ہوئے ہے۔ فلسطینی بچے کے لئے لکھی جانے والی یہ لوری

ساری دنیا کے ان بچوں کے لئے ہے، جو ظلم و جور کا نشانہ بنتے ہیں جو اپنے وطن سے دُور اپنے خوابوں کی تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں

مت رو بچّے
رو رو کے ابھی
تیری امّی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچّے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچّے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دُور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچّے
تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے
مت رو بچّے
تیرے آنگن میں
مردہ سُورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچّے
امّی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے

تو مسکائے گا تو شاید

سارے اِک دن بھیس بدل کر

تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

فیض صاحب نے یہ دونوں نظمیں 1981ء میں جون کے مہینے میں لکھیں جب بیروت میں فلسطینیوں پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔
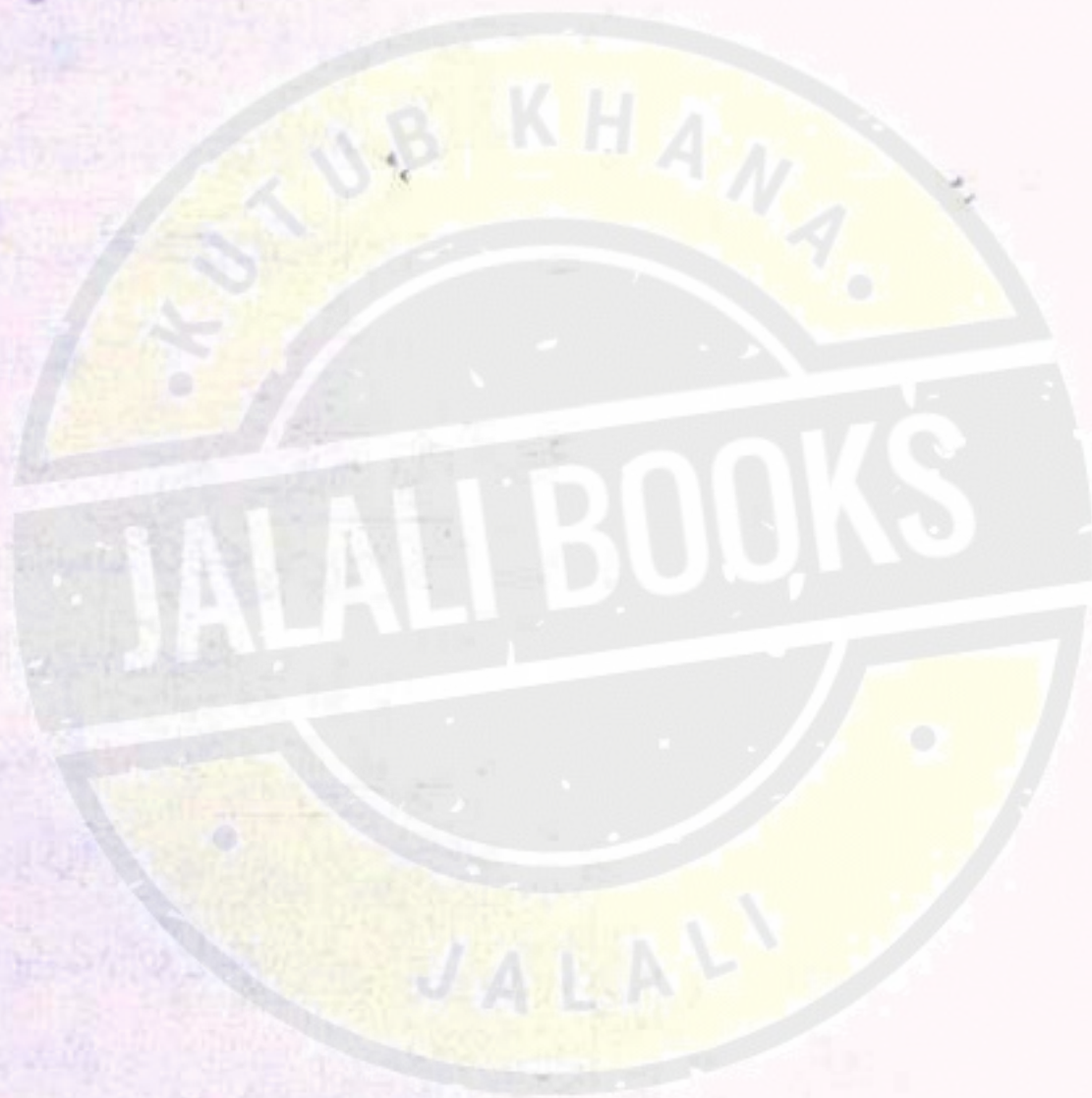
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

عہدِ استبداد

یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

- آج اک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
- لاؤ تو قتل نامہ
- تین آوازیں
- یہ ماتم وقت کی گھڑی ہے
- ہم تو مجبورِ وفا ہیں
- قوالی
- ستم سکھلائے گا رسمِ وفا
- پھول مسلے گئے

آج اک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

4 اور 5 جولائی 1979ء کی درمیانی شب ملک میں تیسرا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اس سے قبل 1958ء میں اور 1969ء میں جنرل ایوب خاں اور جنرل یحییٰ خان مارشل لا نافذ کرنے کے بعد تادیر حکمرانی کرتے رہے تھے لیکن اس تیسرے مارشل لا کا پس منظر اور اغراض و مقاصد پہلے کے دو مارشل لاؤں سے مختلف تھے۔

یہ ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت کا زمانہ تھا۔ 1971ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ملک میں جسے بھٹو صاحب ''نیا پاکستان'' کہہ کر پکارا کرتے تھے اسمبلی کے منتخب اراکین نے 1973ء میں ایک دستور متفقہ طور پر منظور کیا۔ گزشتہ چار پانچ برسوں سے اسی آئین کے تحت ملک کا نظام چلایا جا رہا تھا۔

اگر چہ جمہوریت کے نقطہ نظر سے یہ حالات بہت قابل اطمینان تو نہیں تھے مگر بڑی حد تک وہ ساری ضروریات پوری کی جا رہی تھیں جو ایک جمہوری حکومت کے لئے لازم ہوتی ہیں۔ قومی اسمبلی کے اجلاس میں گرما گرم بحث مباحثے ہوتے تھے اور اسمبلی کے باہر مخالف سیاسی کارکنوں کو احتجاج اور مظاہروں کی اجازت تھی۔ اخبارات خاصی حد تک آزاد تھے مگر الیکٹرانک میڈیا پر مکمل طور پر سرکار کا قبضہ تھا۔ بھٹو صاحب کی شخصیت یقیناً متنازعہ تھی۔ ایک بڑی اکثریت ان کی پُر زور حمایت کرتی تھی لیکن خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو انہیں ملک دشمن کہتے تھے اور پاکستان توڑنے کی تمام تر ذمہ داری ان پر ڈالتے تھے۔ غرض ایسے ہی سرد و گرم حالات میں وقت گزر رہا تھا جب اچانک بھٹو صاحب نے مارچ 1977ء کے آغاز میں نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اگر چہ اسمبلیوں کو اپنی مدت ختم کرنے میں ابھی وقت باقی تھا۔ مگر وزیر اعظم کو یہ مشورہ دیا گیا کہ اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کی مقبولیت کا گراف بہت اونچا ہے لہٰذا عام انتخابات کا انعقاد پارٹی کو بڑی کامیابی دلا سکے گا۔ انتخابات کے اعلان کے دوسرے ہی دن ساری اہم مخالف سیاسی جماعتوں نے ایک متحدہ حزب اختلاف کے قیام کا اعلان کر دیا جسے ''متحدہ قومی اتحاد'' کا نام دیا گیا۔ یہ اتحاد عوام میں ''نوستاروں'' کے نام سے مشہور ہوا۔

اگر چہ حکومت نے اور خود ذاتی طور پر بھٹو صاحب نے اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ انتخابات منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے۔ مگر مارچ میں جب قومی اسمبلی کے نتائج سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ بڑے پیمانے پر دھاندلی کی گئی ہے۔ اس کے

برعکس اپوزیشن کی صفوں میں حیرت انگیز سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ان جماعتوں نے پُر زور انداز میں حکومت کی دھاندلیوں کے خلاف احتجاج کیا اور تین روز بعد منعقد ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔یہ اس احتجاج کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس کے بعد بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں نے گلیوں، بازاروں، سڑکوں پر نکلنے والے عوام کے جذبات کو اس قدر بھڑکایا کہ حکومت کے لئے حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

بھٹو صاحب کو اپنے مقرر کردہ فوجی سربراہوں کی وفاداری پر اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ ''نیک دل، نیک سیرت اور وفادار شخص''، جس کا نام ضیاء الحق تھا اور جسے انہوں نے بہت سے سینئر جرنیلوں پر Super Seat کر کے آرمی چیف بنایا تھا ان کا ساتھ دے گا مگر زیرک اور چالاک جنرل نے انہیں آخر تک دھوکے میں رکھا اور بالآخر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

یہ فیصلہ فوجی قیادت نے اس وقت کیا جب بھٹو صاحب اور حزبِ اختلاف کے راہنما مذاکرات میں مصروف تھے اور عام افواہ تھی کہ مذاکرات کامیابی سے ہمکنار ہونے والے ہیں۔

سارے ملک میں عدم تحفظ اور بے یقینی کی فضا تھی۔ایک ہیجانی ڈرامے کی طرح حالات کلائمکس کی طرف بڑھ رہے تھے اور آخر کار وہ لمحہ آن پہنچا جس کے سب منتظر تھے۔اس ڈرامے کے ڈراپ سین کا احوال مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "اور لائن کٹ گئی" میں اپنے مخصوص پیرائے میں لکھا ہے۔

''4 جولائی کی شام کابینہ کا اجلاس تھا جس میں اتحاد کے پیش کردہ نکات زیرِ بحث آئے۔جنرل ضیاء الحق بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔اجلاس ختم ہوا تو ہم دو چار لوگ کیبنٹ روم کے باہر کھڑے ہو کر گفتگو کرنے لگے۔مسٹر بھٹو جنرل ضیاء الحق کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔تقریباً دس منٹ بعد جنرل ضیاء الحق کمرے سے باہر نکلے تو ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔''

بھٹو صاحب نے شام کے بعد پریس کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اپنے سارے قریبی ساتھیوں کو وزیرِاعظم ہاؤس بلوا لیا تھا۔انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''آج میں معاہدے پر دستخط کر کے اس کھیل کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' کہانی کا آخری منظر بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے۔'' آرمی کے دستوں نے ٹھیک دو بجکر تیس منٹ پر حرکت کی۔ جرنیلوں کو شاید وزیرِاعظم ہاؤس سے غیر متعلقہ لوگوں کے جانے کا انتظار تھا۔رات کو ڈھائی بجے ممتاز بھٹو کا فون آیا کہ انہوں نے اسلام آباد کی سڑکوں پر آرمی کے دستے گشت کرتے دیکھے ہیں۔بھٹو صاحب نے فون اٹھا کر اپنے ملٹری سیکریٹری سے بات کرنا چاہی تو آپریٹر نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ جی ایچ کیو جا چکے ہیں۔''مسٹر بھٹو نے حکم دیا کہ ''جنرل ضیاء الحق سے بات کراؤ۔'' آرمی ہاؤس سے بھی یہی جواب ملا کہ جنرل صاحب جی ایچ کیو گئے ہوئے ہیں۔''مسٹر بھٹو سمجھ گئے کیا ہونے والا ہے۔انہوں نے آپریٹر سے کہا ''جی ایچ کیو میں جنرل ضیاء الحق سے ملاؤ'' کافی تاخیر سے جنرل ضیاء الحق لائن پر آئے تو بھٹو صاحب نے کہا ''یہ کیا ہو رہا ہے۔میں نے سنا ہے آرمی حرکت میں آچکی ہے۔کیا یہ درست ہے؟''

جنرل ضیاء الحق نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا" آپ نے درست سنا ہے سر۔ مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

اس رات آخری فون جو مسٹر بھٹو نے سنا وہ غلام مصطفےٰ کھر کا تھا جنہیں وہ رات گئے تک تلاش کراتے رہے تھے۔ شاید کھر کو اپنے ذرائع سے آرمی ٹیک اوور کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ شہر میں کسی نامعلوم مقام سے بول رہے تھے۔ انہوں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا۔

"سر میں نے سنا ہے کہ.........

اور پھر ٹیلی فون کی لائن کٹ گئی.........جرنیلوں کی رات کا آغاز ہو چکا تھا۔"

آج اک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

فیض صاحب نے یہ نظم مارشل لا کے نفاذ کے صرف چند روز بعد لکھی۔ وہ ملکی صورت حال سے بہت ملول تھے۔ اگر چہ بھٹو صاحب کی پالیسیوں سے بھی وہ کوئی خاص خوش نہیں تھے۔ لیکن فوجی حکومت کی آمد کے بعد رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ اس سانحہ کے بعد فیض صاحب نے جو سات مہینے پاکستان میں گزارے وہ ان کی زندگی کے بڑے پریشان کن تھے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں حالات کا شکوہ کرتے رہے۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خارِ گلو بنا جو اٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی وہ وقارِ دستِ دعا گیا

اور بسا اوقات انہوں نے واشگاف انداز میں بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا

پوچھو تو ادھر تیر فگن کون ہے یارو
سونپا تھا جسے کام نگہبانیٔ دل کا

اور یہ ہیں وہ اشعار جنہیں انہوں نے خود مارشل لا کے موضوع پر اپنی پہلی نظم قرار دیا تھا۔

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مدھ بھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
حرفِ الفت کوئی دلدار نظر ہو جیسے
جس سے ملتی ہے نظر بوسۂ لب کی صورت

اتنا روشن کہ سرِ موجۂ زر ہو جیسے
صحبت یار میں آغازِ طرب کی صورت
حرفِ نفرت کوئی شمشیر غضب ہو جیسے
تا ابد شہرِ ستم جس سے تباہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے
لب پہ لاؤں تو مرے ہونٹ سیاہ ہو جائیں

(۲)

آج ہر سُر سے ہر اک راگ کا ناتا ٹوٹا
ڈھونڈتی پھرتی ہے مطرب کو پھر اُس کی آواز
جوششِ درد سے مجنوں کے گریباں کی طرح
چاک در چاک ہُوا آج ہر اک پردۂ ساز
آج ہر موجِ ہَوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ، کوئی صوت، تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی،
صورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی،

☆......☆......☆
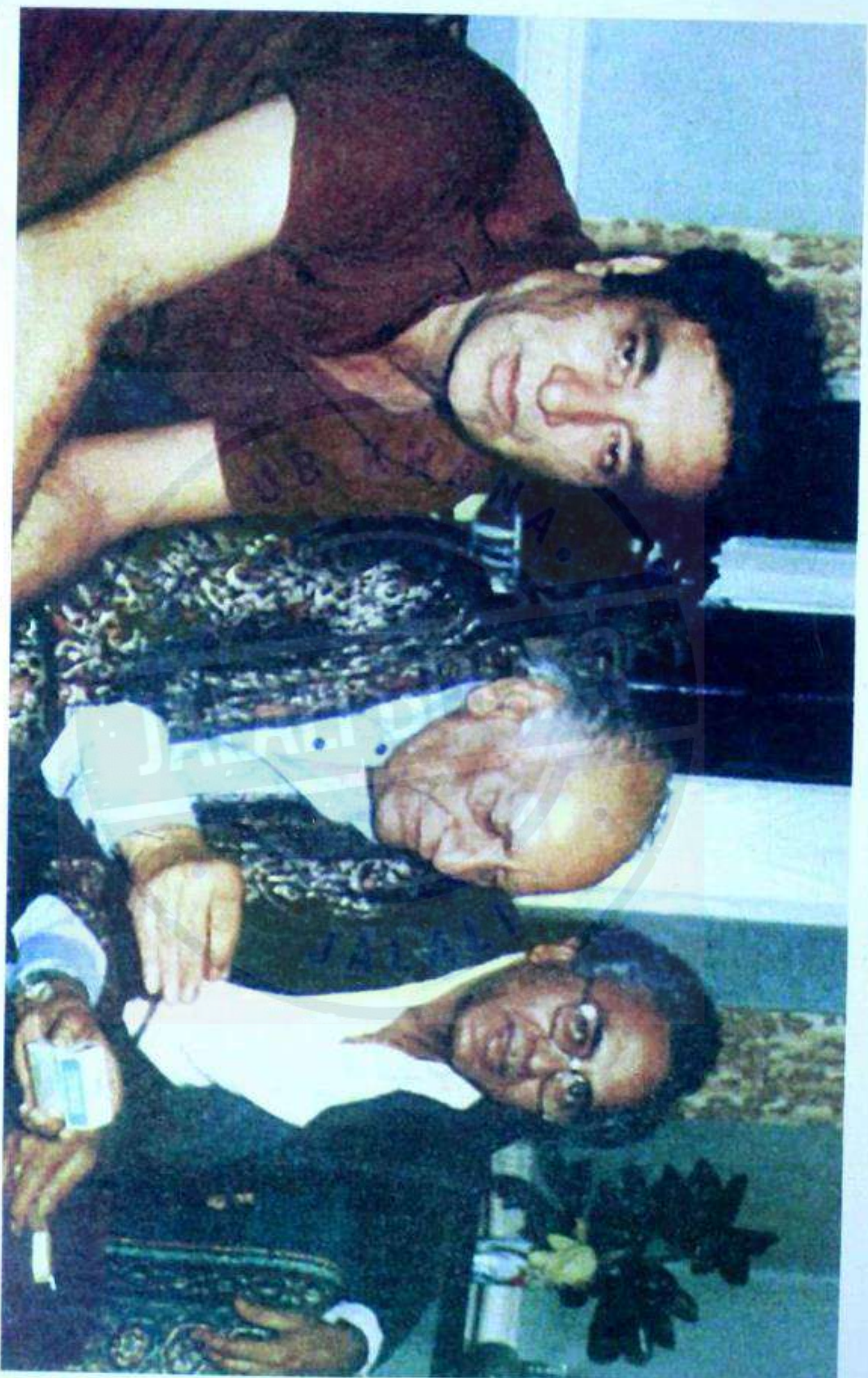
ساقی فاروقی ،فیض احمد فیض اور احمد فراز

لاؤ تو قتل نامہ

1977-78ءمیں ضیاء الحق کے مارشل لا کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور ایک ایسے جج نے جسے بھٹو سے ذاتی عداوت تھی، انہیں سزائے موت سنا دی۔ بھٹو پر نواب محمد احمد قصوری کے قتل کا الزام تھا اس لیے کہ انہوں نے اپنی پارٹی کے ایک رکن کی کسی فائل پر لکھا تھا۔ ''اسے راستے سے ہٹا دو'' مگر جب حملہ ہوا تو وہ صاحب بچ گئے اور اُن کے والد گولی کا نشانہ بن گئے۔ اس طرح نہ وہ شخص ہلاک ہوا جسے بھٹو ہلاک کرانا چاہتے تھے اور نہ بھٹو کے ہاتھوں یہ جرم سرزد ہوا۔ مگر کورٹ کچہری کے معاملات مختلف ہوتے ہیں۔ وکیلوں کے دلائل کے بعد وہ قانون کی نظر میں مجرم ٹھہرے اور عدالت نے انہیں موت کا حکم سنا دیا۔ سپریم کورٹ میں ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کے خلاف اپیل ہوئی مگر جنرل ضیاء الحق نے منصفوں کی تعداد میں ردوبدل کر کے ایسے ججوں کی اکثریت پیدا کر دی جو اُن کی حسب منشا فیصلہ کریں۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ تین کے مقابلے میں چار ججوں نے پھانسی کی سزا کو برقرار رکھا۔

اس کے بعد ''رحم کی اپیل'' کا حق صرف صدرِ پاکستان کو تھا۔ ساری دنیا کے بڑے لیڈروں نے ملت اسلامیہ کی برگزیدہ شخصیتوں نے اور پاکستان میں قومی سطح کے سیاستدانوں نے معافی کی درخواستیں دیں مگر کسی کی نہ سنی گئی اور سزا برقرار رہی۔

ایک جیتا جاگتا شخص، جو منتخب وزیر اعظم تھا، جو اسلامی کانفرنس کا صدر تھا، اور عوام میں بہت مقبول تھا 4 اپریل کی منحوس صبح تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ بھٹو کے آخری الفاظ یہ تھے ''اللہ میری مدد کر، میں بے گناہ ہوں۔''

ہمارے ایک مقبول کالم نگار عباس اطہر نے اس کالی صبح رونما ہونے والے واقعہ کا احوال بڑی دردمندی کے ساتھ یوں تحریر کیا ہے۔

''بھٹو کے قتل پر ملک کے لاکھوں گھروں میں روٹی نہیں پکی۔ بچے، عورتیں، نوجوان اور بوڑھے آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے دیکھے گئے۔ ملک بھر کے آنسو ایک جگہ جمع ہو سکتے تو لاہور سے گڑھی خدا بخش کے قبرستان تک آنسوؤں کی ایک چھوٹی ندی بن جاتی۔''

احمد فراز نے اسی شام یہ شعر کہا تھا۔

سفر طویل جو درپیش تھا مسافر کو
تو نصف شب سے بھی پہلے جگا دیا تھا اُسے

بھٹو کی موت سے سارے پاکستان اور دوست ممالک میں صف ماتم بچھ گئی۔ ملک میں اس سانحہ پر کچھ کہنے اور لکھنے کی پابندی تھی۔ مارشل لا کے سخت قوانین کے سامنے سب بے بس تھے۔

فیض صاحب ان دنوں جلاوطنی کے دور سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے پردیس میں یہ افسوسناک خبر سنی اور اس سانحہ کے چندروز کے بعد یہ اشعار لکھے جو بعد میں ''لاؤ تو قتل نامہ مرا'' کے زیرِ عنوان شائع ہوئے۔

ایک دلچسپ پہلو اس نظم نما غزل کا یہ بھی ہے کہ اس کا آخری شعر فیض صاحب کا نہیں ہے۔ یہ شعر اردو کے کسی پُرانے شاعر کا ہے۔ فیض صاحب کبھی کبھی ایسی تضمین کیا کرتے تھے۔

مشفق خواجہ کا خیال ہے یہ شعر واجد علی شاہ اختر کا ہے۔ کہتے ہیں واجد علی شاہ کو تخت سے ہٹانے کے لیے کچھ لوگوں نے انگریزوں کو جو درخواست دی تھی۔ اس پر واجد علی شاہ کے چھوٹے بھائی مرزا سلیمان قدر کے بھی دستخط تھے۔ جب واجد علی شاہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

مگر فیض صاحب کا خیال تھا کہ شعر داغ یا امیر مینائی کا ہے۔

بہر کیف شعر جس کا بھی ہو بھٹو کی سزائے موت پر لکھی جانے والی نظم کے لیے شاید اس سے بہتر عنوان نہیں مل سکتا تھا۔

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
زندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سُو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازیِ میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
''لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہُوئی''

☆......☆......☆

تین آوازیں

فیض صاحب کی یہ نظم جس کا عنوان ہے ''تین آوازیں'' لب ولہجہ کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی ایک ہی نظم ہے۔ جلال کی جو کیفیت اس نظم میں ہے وہ میں نے فیض صاحب کے اشعار میں پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ وہ ہمیشہ بہت مدہم، نرم خو اور دھیمے انداز میں اپنی بات کرتے ہیں۔ دھیرج ان کے مزاج کا ایک لازمی حصہ ہے مگر اس نظم میں جو تلخی، تیزی اور شدت ہے وہ پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

لگتا ہے وہ بہت طیش میں ہیں اسی لیے اس نظم میں الفاظ کا انتخاب ان کے عام اسلوب سے مختلف ہے۔

فیض صاحب نے یہ نظم بھٹو صاحب کی سزائے موت کے بعد لکھی۔ جب وطن عزیز میں یہ سانحہ پیش آیا تو فیض صاحب ملک سے باہر تھے۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد انہوں نے ملکی حالات پر چار پانچ بہت جاندار نظمیں لکھیں جن میں وہ مختصر سی نظم بھی شامل ہے جو بھٹو کی پھانسی کے فوراً بعد لکھی گئی تھی۔

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی

1979ء کا زمانہ پاکستان کی تاریخ کا ایک بڑا المناک دور تھا۔ یہ وہ سال تھا جب اپریل کے مہینے میں ایک کالی صبح ملک کے منتخب وزیر اعظم، اسلامی کانفرنس کے چیئرمین اور عوام کے محبوب لیڈر کو ایک فرد واحد کی خواہش پر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ بڑا پُر آشوب دور تھا۔ ملکی حالات دگرگوں تھے اور تیزی کے ساتھ مزید تباہی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چالاک اور شاطر حکمران نے رفتہ رفتہ حالات پر قابو پا لیا تھا۔ مخالفتیں کم ہوتی جارہی تھیں۔ عام لوگ سہمے ہوئے تھے، صحافیوں میں پھوٹ ڈلوادی گئی تھی اور عام شہری خاموش تماشائی کی طرح اس بدلتی ہوئی صورت حال کو دیکھ رہا تھا۔ کسی میں ظلم اور جور کے خلاف آواز اُٹھانے کا حوصلہ نہ تھا۔

مارشل لا کے نفاذ اور بھٹو کی سزائے موت کے درمیان کا عرصہ بڑا صبر آزما تھا۔ ان اکیس مہینوں میں داخلی اور خارجی صورت حال تیزی سے تبدیل ہو چکی تھی۔ مارشل لا کا بہانہ بنا کر جنرل ضیاء الحق نے نئے نئے قوانین کا اجراء کیا تھا جس نے زندگی کی ساری اقدار کو مسخ کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کی خوش قسمتی یہ بھی ہوئی کہ ہمسایہ ملک افغانستان میں تشویشناک صورت حال پیدا ہو گئی جس

نے امریکہ کو علاقہ میں دخل اندازی کا موقع فراہم کر دیا اور اس طرح پاکستان کے ڈکٹیٹر کو سامراجی طاقتوں کی معاونت بھی حاصل ہوگئی۔
حالات کے اس پس منظر میں فیض صاحب نے یہ نظم لکھی جسے انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''ظالم کی آواز'' دوسرا ''مظلوم کی آواز'' تیسرا اور آخری حصہ ''غیبی آواز''۔

''ظالم کی آواز'' کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ یہ کسی جابر حکمران کی آواز ہے بلکہ میرے بزرگ دوست ڈاکٹر آفتاب احمد نے تو واضح طور پر اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے کہ ''ظالم کی آواز دراصل جنرل ضیاء الحق کی آواز ہے۔ جو پکار پکار کر اعلان کر رہا ہے۔''

جشن ہے ماتمِ اُمید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے
میرا مسلک بھی نیا راہِ طریقت بھی نئی
میرے قانوں بھی نئے میری شریعت بھی نئی
اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سرو قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے
فرش پر آج درِ صدق صفا بند ہوا
عرش پر آج ہر ایک بابِ دعا بند ہوا

ایسی تلخی اور خفگی فیض صاحب کے اشعار میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ان کا غیظ وغصہ صاف عیاں ہے۔

ظالم کے بعد مظلوم کی آواز ہے جو خود شاعر کی آواز ہے۔ مگر یہ تنہا آواز نہیں ملک کے ان گنت محروم ومحکوم لوگوں کی آواز بھی اس میں شامل ہیں۔ اس آواز میں جو درد وکرب ہے اور اپنے پروردگار سے فریاد کا جو لہجہ ہے وہ پہلی بار فیض صاحب کے ہاں نظر آتا ہے۔ اس میں اپنے خالق سے ایک طرح کا گلا بھی۔

رات چھائی تو ہر ایک درد کے دھارے چھوٹے
صبح پھوٹی تو ہر اک زخم کے ٹانکے ٹوٹے
دوپہر آئی تو ہر رگ نے لہو برسایا
دن ڈھلا خوف کا عفریت مقابل آیا
یا خدا یہ مری گردان شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

نظم کے تیسرے حصہ میں آخری آواز کو فیض صاحب نے ندائے غیب کہا ہے۔ دراصل یہ غیبی آواز وقت یا تاریخ کی آواز ہے جس میں فیض صاحب اپنے آدرش کی کامیابی کی اُمید دلاتے ہیں۔ نظم کا یہ بند چند برس پہلے اُس وقت لکھا گیا تھا جب 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران فیض صاحب کو وادیٔ سینا میں برق فروزاں نظر آ رہی تھی۔ شاید بیروت میں مقیم فیض احمد فیض کو 1979ء میں پاکستان کے حالات میں بھی اسی دور کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ آمریت کے لیے واشگاف الفاظ میں تنبیہ ہے۔

ہر ایک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچالے

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شور محشر
یہیں پہ روز حساب ہو گا
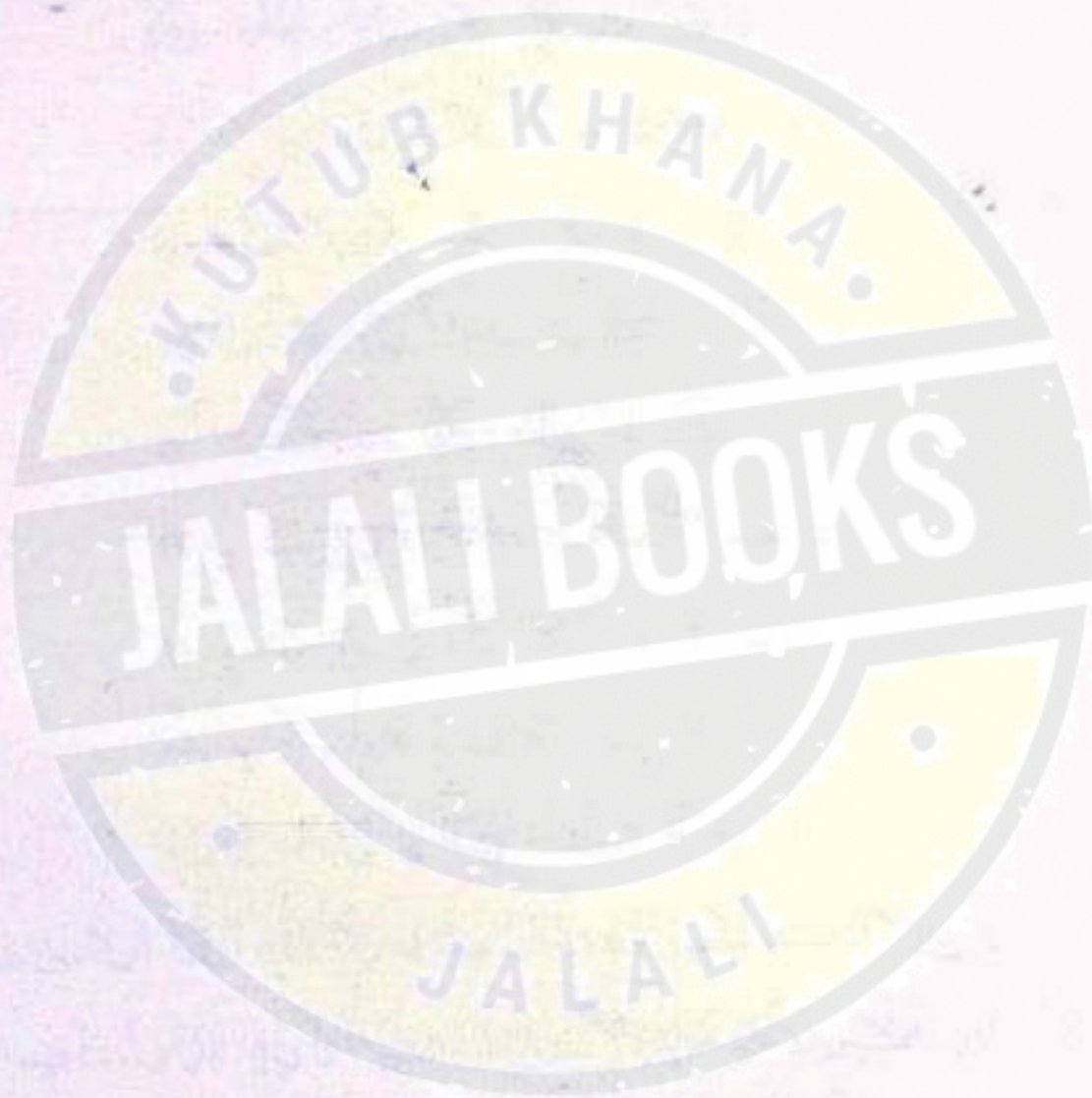
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

فیض صاحب پر زندگی میں دو بار جلاوطنی کی واردات گزری۔ پہلی بار 1962ء میں جب وہ ماسکو سے لنین امن ایوارڈ لے کر لندن چلے گئے تھے اور وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ ایوب خان کے مارشل کا زمانہ تھا۔ دوسری بار 1978ء میں یہ جنرل ضیاءالحق کی مارشل لا کا زمانہ تھا۔

زیرِ نظر نظم دوسری جلاوطنی کے زمانے کی ہے جو جنرل ضیاءالحق کے دورِ استبداد میں لکھی گئی۔ جلاوطنی کے ہر دو ادوار میں فیض صاحب نے بہت جاندار نظمیں کہیں۔

پہلی جلاوطنی نسبتاً آسان اور کم دورانیہ کی تھی۔ انہوں نے لندن کے ایک متوسط علاقہ میں گھر لے لیا تھا اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ یہ جلاوطنی بھی انہوں نے اپنی مرضی سے اختیار کی تھی۔ دراصل پاکستان میں وہ ایوب خان سے زیادہ ان کے گورنر نواب کالاباغ کی وجہ سے ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ نواب کالاباغ انتہائی طاقتور آدمی تھے۔ فیض صاحب کے لئے ان کے دل میں سخت نفرت تھی۔ فیض صاحب ان دنوں پاکستان آرٹ کونسل کے ڈائریکٹر تھے۔ اس ضمن میں ایوب خاں کے معتمدِ خاص قدرت اللہ شہاب نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

''جس زمانے میں فیض صاحب آرٹ کونسل سے منسلک تھے کونسل کے چیئرمین جسٹس رحمان نے مجھے کہا کہ اگر صدرِ مملکت آرٹس کونسل کی وزٹ پر راضی ہو جائیں تو اس سے ہمیں درپیش بہت سی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ صدر ایوب تو شہاب صاحب کے کہنے سے بخوشی مان گئے لیکن گورنر کالاباغ نے خود آنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں منانے کی کوشش کرنے شہاب صاحب خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت ان کے پاس پنجاب پولیس کا ایک نامی گرامی پولیس افسر بھی بیٹھا تھا۔ نواب صاحب نے دوٹوک جواب دیا کہ ''وہ ان کنجر خانوں میں جانا پسند نہیں فرماتے۔ صدر صاحب کو بھی وہاں مت لے جاؤ۔'' فیض صاحب کے بارے میں اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار فرمانے کے بعد انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے پولیس افسر کی طرف اشارہ کر کے کہا ''فیض کے لئے تو میں نے یہ السیشن پال رکھا ہے صدر کے دورے کے بعد اسے چھوڑ دوں گا۔''

ظاہر ہے ان حالات میں فیض صاحب کا اس صوبے میں قیام کہ جس کا سخت گیر گورنر ان کے اسقدر خلاف تھا مشکل تھا لہٰذا

وہ جب لنین امن ایوارڈ لینے گئے تو وطن واپسی کی بجائے ماسکو سے لندن چلے گئے اور پھر تقریباً دو برس جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ایوب آمریت کا دورِ غربت ضیاء الحق کے زمانے میں جلاوطنی کی نسبت کم اذیت ناک تھا۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے دور میں اہل خاندان کی رفاقت میسر تھی۔ پھر روس، الجیریا، مصر، لبنان وغیرہ کی سیر و سیاحت بھی اس زمانے میں ہوتی رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ امید ابھی تک تر و تازہ تھی۔

دشتِ شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقیِ صبحِ طرب نغمہ بلب ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقامِ منصب و جاہ و شرف

لیکن پردیس بہرحال پردیس ہے۔ لندن کی فضا میں احتساب کا کھٹکا ٹل جانے اور زندگی کی بیشتر راحتیں میسر ہونے کے باوجود فیض سوزِ تنہائی میں گھلتے رہے۔ وطن اور یارانِ وطن کی جدائی نے انہیں سراپا اضطراب بنائے رکھا۔ زنداں کے عدم آباد جدائی کی مانند یہاں بھی انھوں نے صبا کی وساطت سے سلام و پیام کا سلسلہ جاری رکھا۔

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آجکل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

چنانچہ فیض صاحب نے لندن کو خیر آباد کہا اور لیلائے وطن سے آملے۔''

یہ تو تھا احوال پہلی جلاوطنی کا۔۔ دوسری بار جب

ہوا پھر سے حکم صادر کہ وطن بدر ہوں ہم تم

تو وطن عزیز پر نت نئی قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ 1977ء کی جولائی میں ملک کا غالباً سب سے زیادہ ہولناک مارشل لا نافذ کیا گیا۔ یہ کام ایک ایسے جنرل نے کیا تھا، جسے وزیر اعظم بھٹو نے بطور خاص اس عہدے کے لئے خود منتخب کیا تھا۔ 1977ء کے الیکشن کے بعد جب پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان نیشنل الائنس کے مذاکرات کامیاب ہونے کے قریب تھے اور سارے مسائل اور شکایتوں کا حل نکالا جا چکا تھا تو اچانک ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب پاک آرمی حرکت میں آگئی۔ سارے سیاسی رہنماؤں کو جو مذاکرات میں مصروف تھے گرفتار کر لیا گیا اور جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔

دیکھو تو ادھر تیر فگن کون ہے یارو
سونپا تھا جسے کام نگہبانیِ دل کا

گرفتار کیے جانے والے سب لیڈر کچھ عرصہ بعد رہا کر دیئے گئے مگر بھٹو صاحب کو قتل کے ایک ایسے مقدمے میں ملوث کر لیا گیا جس کا کسی کو سان و گمان بھی نہیں تھا۔ نواب محمد احمد قصوری جو پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے ایک رکن کے والد تھے۔ انہیں لاہور میں کچھ عرصہ پہلے قتل کیا گیا تھا۔ اس جرم میں بھٹو صاحب کو ملزم گردانا گیا اور پہلے سے تیار شدہ گواہوں، وکیلوں اور ججوں کے گٹھ جوڑ کے ذریعہ انہیں پھانسی کی سزا سنادی گئی۔

فیصلے کے خلاف عدالت عالیہ میں اپیل کی گئی۔ بھٹو صاحب کے قریبی دوست اور سیاسی حلیف یحییٰ بختیار ان کے وکیل صفائی تھے۔ مقدمہ چلا، دلائل ہوئے اور فیصلہ سنا دیا گیا۔ سزا برقرار رہی۔ اس کے بعد صرف صدرِ مملکت ہی اپنے خصوصی اختیار کے ذریعے سزا میں تبدیلی کر سکتے تھے۔ دنیا بھر کے سیاستدانوں نے بھٹو صاحب کے دوستوں نے، خاندان والوں نے بہت کوششیں کیں مگر کچھ نہ ہوا۔ فیصلہ برقرار رہا اور آخر کار اپریل کی چار تاریخ کو بھٹو صاحب کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

فیض صاحب نے جلاوطنی کے دنوں میں یہ خبر سنی اور پھانسی کے کچھ عرصے بعد یہ نظم لکھی۔ یہ مادرِ وطن پر کڑا وقت تھا۔ ہر جانب تاریکیوں اور ظلمتوں کا بسیرا تھا۔ آئین کو مسخ کیا جا رہا تھا۔ مذہب کے نام پر معصوم عوام کو بہکایا جا رہا تھا۔ نہ کوئی سمت تھی نہ کوئی منزل، لوگوں کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئی تھیں۔ حیران و پریشان قوم دہشت زدہ اور گزرتے ہوئے وقت پر ماتم کناں تھی۔ تب فیض صاحب نے کہا۔

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے افق کنارے
اُداس رنگوں کی چاندنیا
اُتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویا
تمام تارے
اکھڑ گئی سانس پتیوں کی
چلی گئیں اونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکمِ خامشی کا
تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر

اور اس کے بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رُخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیر روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

اس نظم کے بعد والے حصہ میں ایک ایسی کیفیت بیان کی گئی ہے جس کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے خود یہ حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں۔ نظم کے اس حصہ میں فیض صاحب نے اپنی ذات کو بھی اس تجربہ میں شامل کر لیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے نظم کا یہ حصہ پڑھتے وقت شیکسپئر کے ڈرامہ جولیس سیزر کا وہ ٹکڑا یاد آتا ہے جب ہلاکت کے بعد اس کے دوست مارک انتھونی نے سیزر کی لاش سے لبادہ ہٹا کر اس کے زخم دکھائے تھے۔

You all do know this mantle, I remember first time ever.Ceasar put it on.
Look, in this place...Cassius dagger through;
See what a rent the envious Casca..made;
Through this the well beloved Brutus stabbed
This was the most unkindest cut of all

شیکسپئر کے الفاظ کو ذہن میں رکھیں اور فیض صاحب کے یہ مصرعے پڑھیں۔
یہ وقت آئے تو بے ارادہ

کبھی کبھی میں بھی سوچتا ہوں

اُتار کر ذات کا لبادہ
کہیں پہ گُل بُوٹے اُلفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خونِ جگر کے دھبّے
یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا
یہ مُہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل لب ہائے مہوشاں کے
یہ مرحمت شیخِ بدزباں کی
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہن دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ اُلفت
کہ چُوم کر پھر گلے لگالوں

☆......☆......☆

ہم تو مجبورِ وفا ہیں

یہ درد انگیز نظم جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کے ابتدائی دور میں لکھی گئی۔ فیض صاحب ان دنوں عالمِ جلاوطنی میں تھے۔ 1979ء کا المناک سال شروع ہو چکا تھا۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔

اس دور کو مارشل لا کا تیسرا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ جس کا آغاز جنرل ضیاء الحق نے قوم سے اپنے خطاب سے کیا۔ اُنہوں نے نومبر میں ہونے والے عام انتخابات کو غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی کرنے کا اعلان کیا۔ مارشل لا کو اور زیادہ کڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں۔ اُن کے دفاتر سر بمہر کر دیے گئے، مخالف اخبارات پر پابندیاں لگا دی گئیں، سینسر شپ کو اور زیادہ سخت کر دیا گیا۔ 1973ء کے آئین میں ترامیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ تعلیمی درسگاہوں میں طلباء یونینوں پر باپندیاں لگا دی گئیں اور سارے ملک میں بڑے پیمانے پر اپنی مرضی کا نظام مسلط کرنے کے لیے دور رس عملی اقدامات کا انعقاد کیا گیا۔ مارشل لا نے اب اپنا اصل چہرہ دکھایا تھا جو انتہائی بھیانک اور خونخوار تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کمال ہوشیاری کے ساتھ اپنے بنیادی مقاصد حاصل کر لیے تھے اور اب اُسے سیاسی رہنماؤں کے تعاون کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

پروفیسر غفور نے اُن فیصلوں کے دو اسباب بیان کیے ہیں ''اول تو یہ کہ اُس عرصہ میں سیاسی جماعتیں غیر مؤثر ہو چکی تھیں۔ ''پاکستان قومی اتحاد'' منتشر ہو کر اس طرح تحلیل ہو گیا تھا جیسے پانی میں نمک۔ پاکستان پیپلز پارٹی بھی شکست و ریخت سے دوچار تھی۔ اس کے بعض افراد ٹوٹ گئے تھے۔ پھر 4 اپریل کو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد اُس کی رہی سہی قوت بھی مضمحل ہو گئی تھی۔ ملک کی دینی جماعتوں نے ان بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر مارشل کے ساتھ تصادم کو لاحاصل سمجھا اور اپنی توجہ غیر سیاسی سرگرمیوں کی جانب منتقل کر دی۔''

ساری قوم مایوسی کا شکار تھی۔ غربت اور بے روزگاری بڑھتی جا رہی تھی اور سیاسی کارکنوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ احتجاج کرنے والوں پر تشدد عام تھا۔ اپنے لیڈر کی موت کے بعد پیپلز پارٹی کے بہت سے جیالے خود کو نذرِ آتش کر کے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔

کچھ آزادی کے متوالے جاں کف پہ لیے میدان میں گئے
ہر سو دشمن کا نرغہ تھا کچھ بچ نکلے کچھ کھیت رہے

وطنِ عزیز کے حالات نے جو روش اختیار کرلی تھی اب اس میں بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ساری توقعات، ساری آرزوئیں سارے خواب جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تُربتیں

اُن دنوں تواتر کے ساتھ فیض صاحب پر اشعار کا نزول ہو رہا تھا۔ وہ وطن سے دور اجنبی ماحول میں اجنبی آسمان کے نیچے غالباً اس دور کی مؤثر ترین احتجاجی اور مزاحمتی شاعری تخلیق کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اس ایک سال میں بہت سی نظمیں لکھیں جن میں سے اکثر کا موضوع یہی ہے مگر اُسلوب اور طرزِ ادا مختلف ہے۔

فیض صاحب کی یہ نظم بھی حزن و ملال کے اسی موسم میں لکھی گئی۔ اس میں تلخی بھی ہے، طنز بھی ہے، شکایت بھی ہے اور شاید مایوسی بھی۔ ایسا پیرایہ فیض صاحب نے کم ہی اپنی شاعری میں اختیار کیا ہے۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو ترے صحراؤں کو گلزار کریں

تیرے ایوانوں میں پُرزے ہُوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہُوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شہ راہوں میں سنگسار ہُوئے

بلا کشانِ محبت پہ جو ہُوا سو ہُوا
جو مجھ پہ گزری مت اس سے کہو، ہُوا سو ہُوا
مَبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہو کے داغ تو دامن سے دھو، ہُوا سو ہُوا

ہم تو مجبور وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

☆......☆......☆
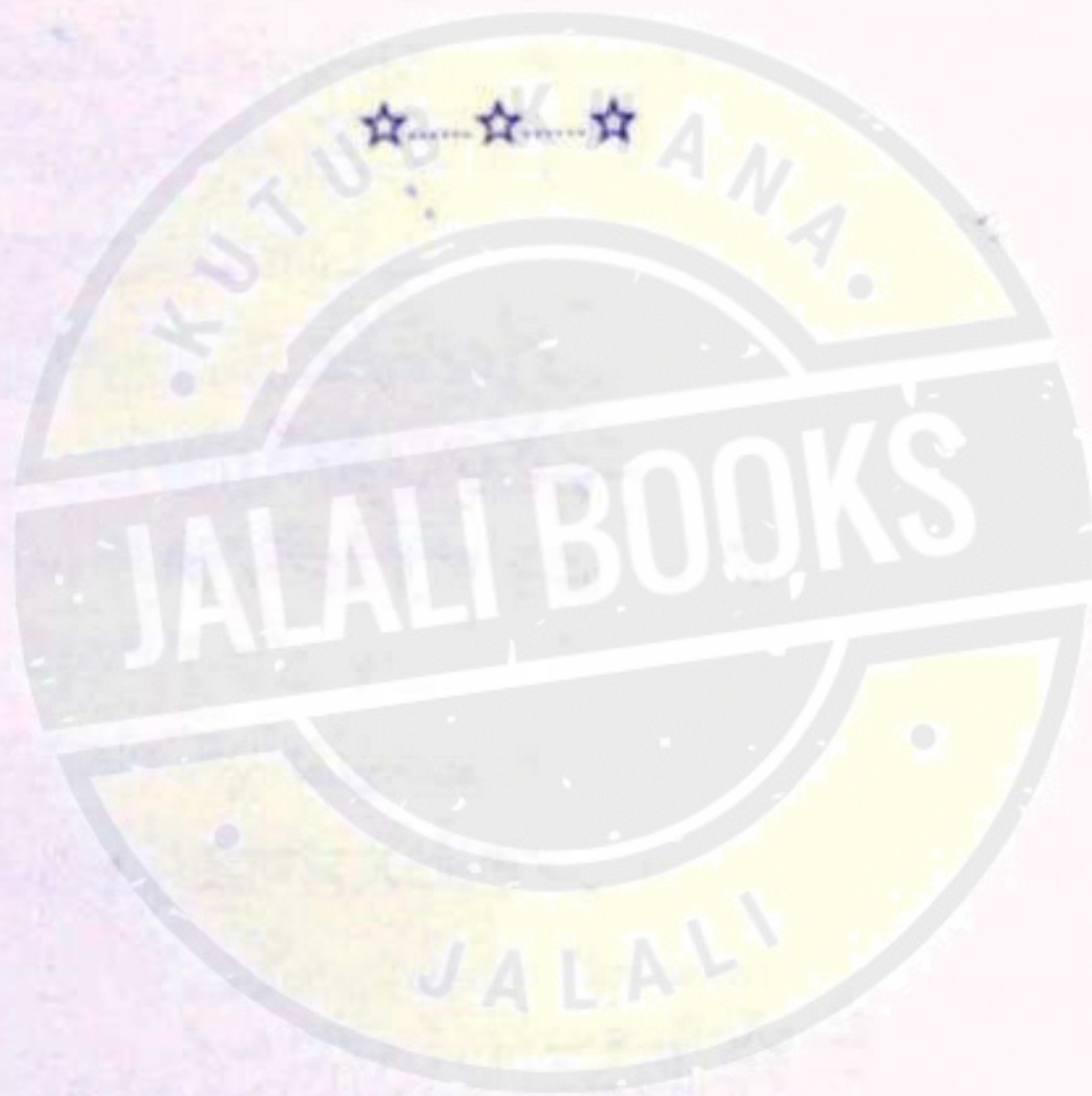
قوالی

فیض صاحب نے یہ نظم اہل قلم کانفرنس سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ ۱۱ جولائی 1979ء کو بھٹو کی پھانسی کے چند دن بعد جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد میں ایک اہل قلم کانفرنس بلائی، جس میں ادب، ثقافت اور فلم سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا گیا۔ مقصد اس کانفرنس کا یہ تھا کہ بھٹو کی موت کے بعد جبکہ راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو چکی تھی فنکاروں اور دانشوروں کو اپنا ہمنوا بنایا جاسکے۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنی تقریر میں حاضرین سے اپیل کی کہ وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے مخاطب بطور خاص ایسے ادیب، شاعر اور صحافی تھے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

فیض صاحب نے یہ تقریر پاکستانی اخباروں میں پڑھی اور اپنے بعض احباب کی زبانی بھی انہیں اس کانفرنس کا حال معلوم ہوا۔ وہ اس کی روئیداد سن کر بہت افسردہ خاطر ہوئے چونکہ کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کی فہرست میں بہت سے ایسے لوگوں کے نام بھی تھے جو فیض صاحب کو بہت عزیز تھے۔ میں نے خود کانفرنس میں جنرل ضیاء الحق کی تقریر کے بعد کئی ترقی پسند سوچ رکھنے والے شاعروں اور اہل قلم کو ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے دیکھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار میں نے زندگی میں ایسا منظر دیکھا تھا جب ضیاء الحق کے پیش رو فوجی حکمراں جنرل ایوب خاں نے اپنے مشیروں کے کہنے پر پاکستان بھر کے دانشوروں اور لکھنے والوں کو جمع کیا تھا اور کراچی میں منعقد ہونے والے اس اجلاس میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس تحریک کے روحِ رواں صدر ایوب کے سکریٹری قدرت اللہ شہاب تھے جو پاکستانی ادیبوں میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

اپنی ادبی اور ثقافتی پالیسیوں کو کامیاب بنانے کے لئے صدر ایوب نے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا جسکا نام ''بیورو آف نیشنل ریکنسٹرکشن تھا'' اس ادارہ کے لئے خاصی بڑی رقم مختص کی گئی تھی۔ بہت جلد اس ادارے نے ضرورت مند ادیبوں، تھیٹر والوں اور فنکاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شاید ایسا ہی کوئی خیال جنرل ضیاء الحق کے ذہن میں بھی آیا کہ اگر ایوب خاں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی کامیاب نہ ہوں۔ مگر اب زمانہ بدل چکا تھا۔ ملک میں مارشل لا حکومتوں کے طویل ادوار نے اہلِ علم اور اہلِ قلم کو آمریت سے بدظن کر دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جتنی بڑی تعداد میں اس بار صحافی، شاعر اور ادیب ملک چھوڑ گئے اس سے پہلے کبھی نہیں گئے تھے۔ یہ ملک کے سخت ترین مارشل لا کا دور تھا۔ کسی کو ضیاء الحق اور حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت نہ

تھی۔مگر لکھنے والوں نے پھر بھی لکھا مثلاً اہلِ قلم کانفرنس کے دعوت نامہ کے جواب میں احمد فراز نے اپنی شہرہ آفاق نظم "محاصرہ" لکھی۔

تُم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمان ہُنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اِک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں

اشفاق حسین نے اپنی کتاب میں فیض صاحب کے ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''اہلِ قلم کے دربار کا حال 'جنگ' اخبار میں پڑھ لیا۔اچھا ہے کہ ہم وہاں نہیں تھے ورنہ وہاں جانے پر بھی انگلیاں اٹھتیں اور نہ جانے پر بھی۔انہی تماشوں کی وجہ سے گھر جانے سے وحشت ہوتی ہے۔'' لیکن دور رہ کر بھی انہوں نے اس موضوع پر ایک نظم لکھی جسے انہوں نے ''قوالی'' کا عنوان دیا ہے۔

جلا پھر صبر کا خرمن پھر آہوں کا دھواں اٹھا

قوالی فیض صاحب کی پسندیدہ صنفِ شاعری ہے۔انہوں نے بہت سے موقعوں پر قوالی کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔سب سے پہلے تو انہوں نے گرفتاری کے بعد جیل میں ایک قوالی نُما ترانہ لکھا۔جو بے حد مقبول ہوا۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے

اس سے بھی پہلے 1949ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں فیض صاحب نے بطور خاص اپنی مشہور قوالی سنائی تھی جس کا عنوان تھا 'سرِ مقتل'

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

اہل قلم کانفرنس میں بڑی تعداد میں شاعروں اور ادیبوں کی شرکت سے فیض صاحب بہت آزردہ ہوئے خاص طور پر جب انہوں نے اس فہرست میں ایسے نام دیکھے جن کو وہ بہت محترم سمجھتے تھے۔زندگی کے آخر تک فیض صاحب کو یہ غم ستاتا رہا اور ان کی شاعری میں اس کی ہوک سنائی دیتی رہی۔

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنف کا قلم ہے

****

کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشم نم کیا ہے

اور خاص طور پر ان کی نظم ''اُدھر نہ دیکھو'' جس میں انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ اپنے یارانِ دیرینہ، اور ہم خیال دوستوں کے راہ بدل لینے پر شکوہ کیا ہے۔

اِدھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمت کے مدعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں صدق و ایماں کی
آزمودہ پرانی تلوار مڑ گئی ہے
جو کج کلہ صاحبِ حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پُر پیچ راستوں میں
کلہ کسی نے گرُو ہے رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے

''قوالی'' کے عنوان سے ان کی اس نظم پر ڈاکٹر آفتاب احمد نے لکھا ہے۔

''کیا ان اشعار کا اشارہ صاف جنرل ضیاء الحق کی طرف نہیں ہے؟ یاد کیجئے کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے ایک ہفتہ بعد 11 اپریل 1979ء کو منعقد ہونے والی ادیبوں کی کانفرنس میں جنرل موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنے ہموطنوں سے کنارہ کشی کرنے والے ادیبوں پر پاکستان کی سرزمین کا رزق، اس کا پانی، اس کی چھاؤں اور چاندنی حرام ہونے کی بشارت دی تھی۔ فیض بھی انہیں ادیبوں میں شامل تھے''..... یہ تھے وہ حالات جنھوں نے فیض صاحب کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا انہیں حالات نے ایسی نظم لکھنے پر اکسایا۔

جلا پھر صبر کا خرمن، پھر آہوں کا دھواں اٹھا
ہُوا پھر نذرِ صرصر ہر نشیمن کا ہر اک تنکا
ہُوئی پھر صبحِ ماتم آنسوؤں سے بھر گئے دریا
چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا
ہر اک جانب فضا میں پھر مچا کہرامِ یارب ہا

اُمڈ آئی کہیں سے پھر گھٹا وحشی زمانوں کی
فضا میں بجلیاں لہرائیں پھر سے تازیانوں کی
قلم ہونے لگی گردن قلم کے پاسبانوں کی
کُھلا نیلام ذہنوں کا، لگی بولی زبانوں کی
لہو دینے لگا ہر اک دہن میں بخیۂ لبہا
چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا

ستم کی آگ کا ایندھن بنے دل پھر سے، واولہا
یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں خداوندا
بنا پھرتا ہے ہر اک مدعی پیغام بر تیرا
ہر اک بُت کو صنم خانے میں دعوٰی ہے خدائی کا
خدا محفوظ رکھے از خداوندانِ مذہب ہا
چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شب ہا

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور سیاسی پارٹیوں پر پابندیاں لگا دینے کے بعد اور ناراض بیرونی ملکوں کو کسی حد تک راضی کر لینے کے بعد جنرل ضیاء الحق، چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدرِ مملکت اب حالات پر کافی حد تک کنٹرول حاصل کر چکے تھے۔ ہر روز ایک نیا فرمان جاری ہوتا، نئے نئے قوانین نافذ کیے جاتے، طرح طرح کے احکامات صادر ہوتے۔ اُنہوں نے ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی ذمہ داری لے لی تھی تا کہ اُس کی تکمیل کے بعد وہ امیر المومنین کا لقب اپنے نام کے ساتھ لگا سکیں۔ مگر اس کے حصول کے لیے جو طرزِ عمل انہوں نے اختیار کیا وہ سراسر شعائرِ اسلام کے خلاف تھا۔

اسلام ایک روشن خیال دین ہے اس کی تشہیر اور اس کی تعلیمات پر عمل درآمد طاقت کے زور پر نہیں ہوتا۔ یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا غلط بیانی پر مبنی ہے۔ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے لہٰذا اس میں ہر کسی کے ساتھ نرم برتاؤ اور ہمدردانہ سلوک کی تلقین کی گئی ہے۔ مگر جنرل ضیاء الحق نے جو راہ اختیار کی وہ ظلم و جبر اور زبردستی کی راہ تھی۔ وہ جو قانون بنانا چاہتے، بنا لیتے اور بعد میں اپنے مخصوص ہم خیال علماء کے ٹولے سے اس کے اسلامی ہونے کی سند حاصل کر لیتے۔ اس میں نہ اُن کو اسلامی اصولوں کا پاس تھا نہ عالمی انسانی حقوق کا۔ اپنی بات منوانے کے لیے اور اپنی طاقت بڑھانے کے لیے انہوں نے 1973ء کے متفقہ آئین میں اپنی من پسند ترمیمات کر لی تھیں اور مارشل لا کا سہارا لے کر ملک میں ملٹری سمری عدالتیں قائم کر دی تھیں جہاں چھوٹے درجے کے فوجی افسر اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ سیاسی کارکنوں کو اور صحافیوں کو سرِ عام کوڑے لگائے جاتے تھے۔ جنرل صاحب کا اصرار تھا کہ جب کسی کو کوڑوں کی سزا دی جائے تو کسی چوراہے پر یا کسی کُھلے میدان میں اس کا انتظام ہوتا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے "لطف اندوز" ہو سکیں اور عبرت حاصل کر سکیں۔ ابتدا میں ان سزاؤں کو اسلامی شریعت کے مطابق قرار دیا جاتا رہا لیکن جب بہت سے دینی حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کہ اسلام میں سیاسی اختلافات کی بنا پر کوڑے لگانا جائز نہیں ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر اُن کی سزاؤں کو جاری رکھا کہ یہ "اسلامی شریعت نہیں مارشل لا قوانین" کے تحت ہیں۔ عوام مجبور اور لاچار تھے اور خود سوزیاں کر رہے تھے۔

جنرل صاحب کی توجہ سب سے زیادہ ابلاغِ عامہ کے اداروں پر تھی خاص طور پر ٹیلی وژن۔ ہمیں پاکستان ٹیلی ویژن میں

ہر روز نئے نئے احکامات ملتے تھے۔ کبھی یہ کہ عورتیں سر پر دوپٹہ لئے بغیر کیمرے کے سامنے نہ آئیں، کبھی یہ کہ گانا گاتے ہوئے گلوکار بالکل ساکت رہے، مرد اور عورت کے ایک ساتھ گانا گانے پر بھی پابندی تھی۔ نازیہ حسن اور اُس کے بھائی ذوہیب حسن تک کو دوگانہ پیش کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جنرل صاحب نے کسی میٹنگ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا ''مجھے علم ہے کہ وہ سگے بھائی بہن ہیں مگر سارے ناظرین تو یہ نہیں جانتے۔ لہٰذا ان کے ساتھ مل کر گانے پر بھی پابندی ہے۔ اس سے فحاشی پھیلتی ہے۔''

حکومت کی مداخلت عام زندگی میں اس قدر بڑھ گئی تھی کہ رہن سہن، گفت وشنید، لباس، گھریلو تقریبات غرض زندگی کے ہر شعبہ میں سرکار اور جنرل صاحب کی پالیسیوں کا عمل دخل تھا۔ پھر مزہ یہ کہ ان سب خود ساختہ ضوابطِ اخلاق کی تشہیر اسلام کے نام پر کی جاتی تھی۔

یہ صورت حالات تھی جب 1969ء میں فیض صاحب نے یہ نظم نما غزل لکھی۔ مجھے یہ اشعار اُنہوں نے زہرہ نگاہ کے گھر پر لندن میں خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے تھے۔ جو میرے پاس بطورِ ''سوینئر'' آج بھی محفوظ ہیں۔

ستم سِکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا
گِنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا
جہانِ دل میں کام آتی ہیں، تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا
رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

☆......☆......☆

پھول مسلے گئے

یہ فیض صاحب کے آخری زمانے میں لکھی گئی چھوٹی سی نامکمل نظم ہے۔ اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فیض صاحب کے قریبی دوست آئی اے رحمان نے بتایا کہ ان دنوں فیض صاحب علیل تھے اور وہ اپنے کسی دوست کے ہمراہ ان کی مزاج پرسی کے لئے گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں بلدیاتی انتخابات ہو چکے تھے اور حکومت زور وشور سے ان انتخابات کو اپنی زبردست کامیابی سے تعبیر کر رہی تھی۔

دراصل چھ سال سے زیادہ حکمرانی کرنے کے بعد اب ضیاء الحق پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بار بار عام انتخابات کرانے کے وعدے کئے لیکن ان وعدوں کی تکمیل نہ ہو سکی۔ لہٰذا وطن عزیز میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باوجود سیاستدانوں کی طرف سے ان پر انتخابات کرانے کے لئے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ موومنٹ فار ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی یعنی MRD کے نام سے قائم ہونے والا سیاسی پارٹیوں کا اتحاد بہت فعال ہو گیا تھا۔ خود جنرل ضیاء الحق کے ہم خیال سیاستدانوں نے بھی مختلف انداز میں یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ عام انتخاب کے انعقاد کے بنا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ عوام میں شدید اضطراب تھا۔ وکلا کنونشن ایک بڑی تحریک کی نشاندہی کر رہا تھا۔ بڑے شہروں میں طالب علموں اور پولیس کے درمیان تصادم کا خطرہ محسوس کیا جانے لگا تھا۔ عوام نے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرکٹ میچوں میں ہنگاموں کے ذریعہ بھی کیا اور تاجروں کے ساتھ ہڑتالوں میں یکجہتی کا مظاہرہ کر کے بھی، حالات بے قابو ہوتے جا رہے تھے۔

جنرل صاحب کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ مگر وہ اپنی سات سال کی محنت کو اکارت نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ اگر مجبوراً انتخابات کرائے بھی جائیں تو ہر سطح پر ایسے لوگ منتخب ہو کر آئیں جو ان کی بنائی ہوئی پالیسیوں کے حامی ہوں۔ وہ ایسے انتخابات کے لئے ''مثبت نتائج'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے انہوں نے جو لائحہ عمل تیار کیا وہ کچھ اس طرح تھا کہ سب سے پہلے ''غیر جماعتی'' بنیاد پر بلدیاتی انتخابات کرائے جائیں اور اس کے کچھ عرصہ بعد صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے الیکشن ہوں۔ اس کے علاوہ خود کو ایک ''منتخب صدر'' بنانے کے لئے انہوں نے ریفرنڈم کرانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا جو بلدیاتی انتخابات اور قومی اسمبلیوں کے الیکشن کے درمیان کسی وقت کیا جانا تھا۔ انتخابات کی اس اسکیم میں ان کا سب

سے بڑا پتہ بلدیاتی الیکشن تھے۔ ان کا خیال تھا اس طرح عام لوگوں کا ووٹ ڈالنے کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور حکومت کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ قومی سطح کے انتخابات میں ''مثبت نتائج'' کس حد حاصل ہو سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے ستمبر 1983ء میں بلدیاتی انتخابات کرائے جو ملک میں ''جمہوری فضا'' پیدا کرنے کی ایک کوشش تھی۔ عوام کے خلاف سرکار کی یہ سازش کافی حد تک کامیاب ہوئی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں رحمان صاحب نے فیض صاحب کو اپنی ملاقات میں یہ مشورہ دیا کہ انہیں بلدیاتی الیکشن پر ضرور کچھ لکھنا چاہیے۔ فیض صاحب خود حالات سے بڑے افسردہ خاطر اور فکر مند تھے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان کے بہت سے جاننے والے ہم خیال دوستوں نے ان انتخابات میں شرکت کر کے ان کے جذبات کو شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ اپنی ناسازیٔ طبع کے باوجود انہوں نے یہ نظم لکھ دی جو نا تمام ہی رہی۔

پھول مسلے گئے فرشِ گلزار پر
رنگ چھڑکا گیا تختۂ دار پر
بزم برپا کرے جس کو منظور ہو
دعوتِ رقص، تلوار کی دھار پر
دعوتِ بیعتِ شہ پہ مُلزم بنا
کوئی اقرار پر، کوئی اِنکار پر

☆......☆......☆

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

سیاسی حالات

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

- سرِ مقتل
- شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
- دست تہہ سنگ آمدہ
- خوشا ضمانتِ غم
- ایک شہر آشوب کا آغاز
- یہاں سے شہر کو دیکھو
- درِ اُمید کے دریوزہ گر
- لہو کا سراغ
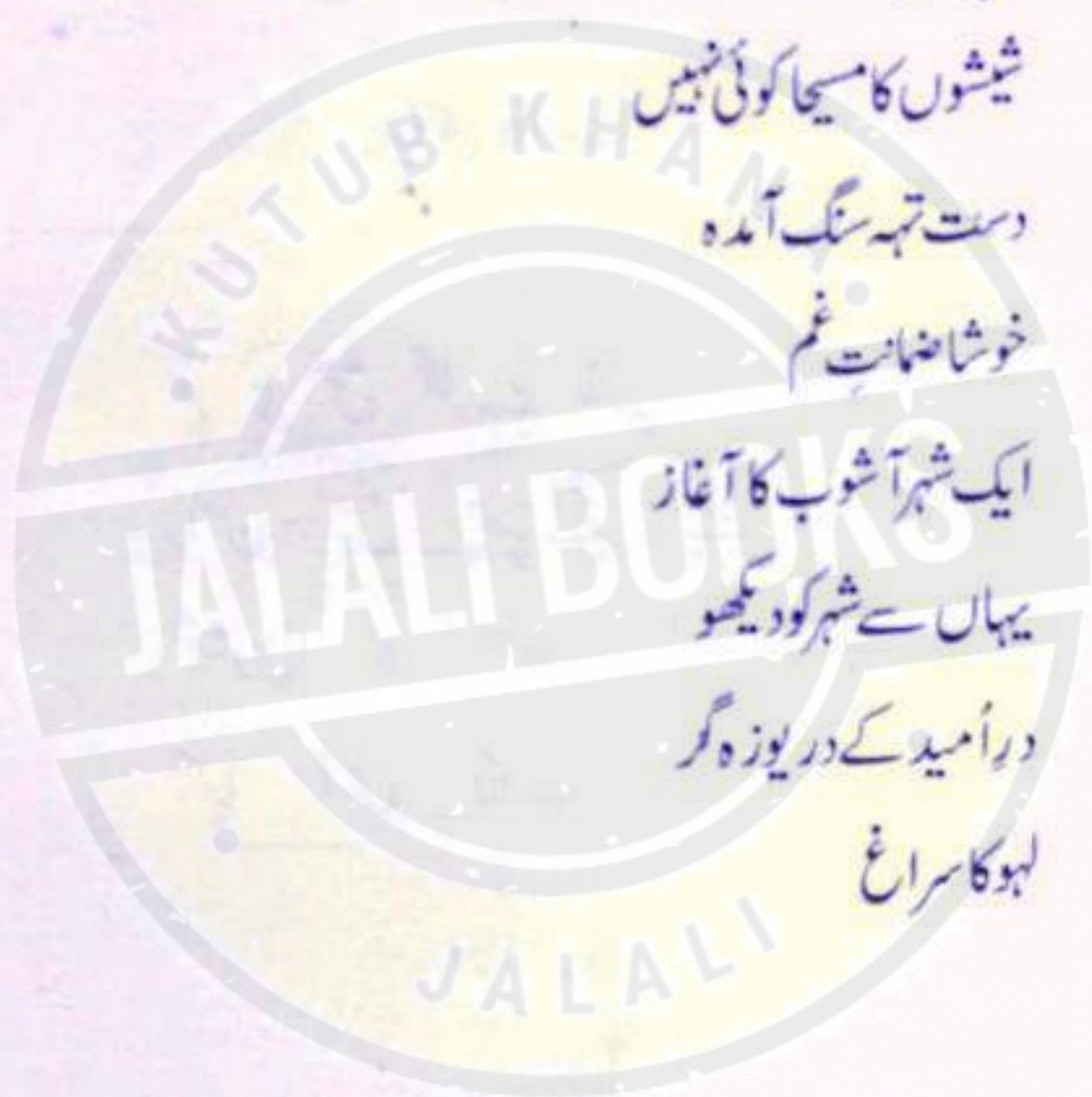
سرِ مقتل

فیض صاحب نے لکھا ہے ''جب ہم امرتسر میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ہمارے رفیق کار محمود الظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں بھی وہاں ہوتے تھے۔ ایک دن محمود الظفر نے کہا ''ہم نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم ہو جائے۔ تو کیا تمہیں اس کام میں دلچسپی ہے۔'' ہم نے کہا ''ہاں ہم ضرور اس میں کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا دور تھا۔''

یوں فیض صاحب نے بالکل ابتدائی زمانے میں ادیبوں کی اس انجمن میں شمولیت اختیار کر لی۔ بلکہ ایک طرح سے وہ اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اسی زمانے میں سید سجاد ظہیر کے کہنے پر لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انجمن ترقی پسند کا بالواسطہ تعلق کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھا۔ اس لیے بعض حلقوں میں اس کی سخت مخالفت کی گئی مگر بقول عزیز حامد مدنی فکری اُفق پر ترقی پسند مصنفین کی تحریک نئی نسل کی آواز تھی جو فکری اعتبار سے توانا اور شاداب تھی۔ اس تحریک میں شامل قلم کار یہ جانتے تھے کہ تہہ بہ تہہ جمنے والی تن بہ تقدیر اندیشوں کی دنیا کے پیچھے ایک بے سکت مفلسی آباد ہے جس کا وجود دل و دماغ پر گراں ہے۔ اس میں ملکی افلاس اور بدحالی کے منظر ہیں۔ ترقی پسند تحریک سارے ہندوستان میں بڑی تیز رفتاری سے پھیل گئی۔ اس دور کے نامور مقبول شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کی رُکنیت اختیار کر لی۔ پاکستان میں فیض صاحب کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، فارغ بخاری، ظہور نظر، اختر حسین رائے پوری، سبط احمد، ممتاز حسین وغیرہ اس کے پُر زور حامی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس جیسے نامور قلمکار اس کے ممبر بن گئے۔

ترقی پسند ادیبوں نے "ادب برائے زندگی" کا نعرہ لگایا اور عوامی موضوعات کو اپنی تحریروں اور شاعری کا موضوع بنایا۔

فیض صاحب کے نزدیک ترقی پسندی کوئی نئی ایجاد نہیں تھی۔ ان کا نظریہ تھا کہ جب سے ادب وجود میں آیا ترقی پسندی کا رجحان ہر دور اور ہر ماحول میں موجود رہا۔ تمام جان دار ادب لکھنے والوں اور قابل قدر عوامی شاعری کرنے والوں کا نظریہ وہی ہے جو ترقی

پسندوں کا ہے خواہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن ہوں یا نہ ہوں۔ پاکستان کے قیام کے بعد کیمونسٹ پارٹی اور اس انجمن کا بھی بٹوارہ ہو گیا مگر پاکستان میں اس کو بہت زیادہ مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت وقت کے ہاتھوں بھی اور شاعروں اور ادیبوں کے باہمی اختلافات کے باعث بھی۔

1949ء کے موسم سرما میں لاہور میں کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں انجمن کا منشور پیش کیا گیا اور اراکین کی منظوری حاصل کی گئی۔ اس اجلاس کی صدارت کرنے والے پینل میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔

یہ جلسہ لاہور کے اوپن ائیر تھیٹر میں منعقد ہوا تھا۔ اگرچہ کچھ مخالفین نے کانفرنس کے دوران کافی ہنگامہ کیا مگر انہیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور مجموعی طور پر یہ کانفرنس کامیاب رہی۔ اس کی آخری نشست میں فیض صاحب نے اپنی یہ نظم سنا کر محفل کو لوٹ لیا۔ قوالی کے انداز میں لکھی گئی یہ نظم انہوں نے پہلی بار اسی جلسہ میں سنائی تھی۔

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہرا اے دل، جمالِ رُوئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اُس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

☆......☆......☆

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

یہ نظم فیض صاحب کی چند بہت ہی خوبصورت نظموں میں سے ہے۔ اس کا سن تخلیق 1952ء ہے جب ملکی اور بین الاقوامی حالات میں قابلِ ذکر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اکتوبر 1951ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں اس وقت شہید کر دیا گیا جب وہ ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد وزیر خزانہ ملک غلام محمد گورنر جنرل اور مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ہو گئے۔ خواجہ صاحب نہایت شریف اور نیک انسان تھے۔ لہٰذا ملک غلام محمد کے ٹولے نے ابتدا سے ہی ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ 1952ء کا سال ایک طرح سے درباری سازشوں کا سال تھا۔ ملک میں ہر طرف بے چینی تھی اور سیاسی افراتفری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ملک میں سیاسی بے راہ روی اور نظریاتی اختلافات نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اندیشوں اور مایوسی کی فضا تھی۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

عالمی سطح پر بھی نئی نئی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ مشرق وسطیٰ کے بہت سے ملکوں میں انقلاب کے بعد بادشاہتیں ختم ہو گئی تھیں۔ عالمی سطح پر نئے رہنما نمودار ہو رہے تھے۔ فیض صاحب جیل کی دیواروں کے پیچھے بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ذاتی طور پر بھی اس زمانہ میں فیض صاحب کو کئی صدمات سے گزرنا پڑا۔ ان کے محبوب بھائی طفیل اچانک دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ ان کی سیاسی تربیت کرنے والی دانشور ڈاکٹر رشید جہاں انتقال کر گئیں۔ ایک اور غم انہیں مولانا حسرت موہانی کی وفات کا تھا جن سے فیض صاحب کو دلی لگاؤ تھا۔

فیض صاحب نے ان سارے سانحات اور واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ''ایرانی طلباء'' کی شہادت پر جو معرکتہ الآرا نظم انہوں نے لکھی اس نے نہ صرف قبولِ عام کا درجہ حاصل کیا بلکہ خود فیض نے بھی اسے بہت سراہا۔

یہ کون سخی ہیں جن کے لہو کی اشرفیاں چھن چھن چھن چھن

دھرتی کے پیہم پیاسے کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں۔ کشکول کو بھرتی جاتی ہیں

''شیشوں کا مسیحا'' اس نظم کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تصنیف کی گئی اور اس میں ایرانی طلباء والی نظم کی گونج سنائی دیتی

ہے۔دونوں نظموں کا تاثر ملتا جلتا ہے۔

عزیز حامد مدنی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "شیشوں کا مسیحا" ان کی بہت خوبصورت نظم ہے اور ان کے کلام میں فصاحت کی مثال ہے۔اس نوع کی نظم ہونے کے باوصف اس کا لب ولہجہ غیر متوقع طور پر نرم ہے۔یہ نظم بڑی گہرائی لیے ہوئے ہے۔ اپنے آدرش کا اظہار اس میں فیض صاحب نے الفاظ کے موزوں انتخاب اور اشعار کی مترنم بندشوں سے اس طرح کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے قاری ایک ملکوتی فضا میں پہنچ جاتا ہے۔"

اسی نظم کے حوالے سے میجر اسحاق نے "روداد قفس" کے زیر عنوان لکھا ہے کہ اب فیض صاحب کے مشاہدہ اور مجاہدہ کے تناسب میں مجاہدہ کا پلڑا ابھاری ہو رہا تھا۔ وہ پکار رہے تھے کہ کارگہ ہستی میں جو رن پڑ رہا ہے اُس میں حق و باطل کے لشکروں کو پہچانو۔ ناداری، دفتر، بھوک اور غم نے جو تمہارے پتھراؤ کر کے تمہارے ساغر دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور تمہاری عزت و ناموس خاک میں ملادی ہے۔یہ سارا ماجرا اس وقت کا ہے جب اُنہوں نے یہ نظم لکھی اور یہ ماجرا آج کا بھی ہے جب اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں۔اسی لیے میرے خیال میں یہ ایک ایسی نظم ہے جو زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہے۔اس کی کوئی تاریخ تصنیف نہیں ہے۔جو کل تھا، وہی آج بھی۔ نہ حالات بدلے ہیں نہ رویوں میں تبدیلی آئی ہے۔ یہ نظم اس سارے وقت پر محیط ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ رہنے والا نغمہ ہے۔ ہمیشہ گائے جانے والا گیت ہے۔

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہادی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزّت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رُلواتے ہیں

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو
یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اِک بخیہ اُدھیڑا، ایک سِیا
یوں عمر بسر کب ہوتی
اس کار گہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے، یاور ہے یہاں
جو آنکھ اُٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

کب لُٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں

یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رَن پڑتا ہے
نِت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
یہ کالک بھرتے رہتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رَن سے بلاوے آتے ہیں

☆......☆......☆

دست تہہ سنگ آمدہ

اپریل 1955ء میں فیض صاحب تقریباً چار سال کی قید کاٹ کر رہا ہوئے۔ اگرچہ ان کی مدت پوری نہیں ہوئی تھی مگر ملک کے حالات نے کروٹ لی اور سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو گیا۔ اس وقت کے گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی۔ محمد علی بوگرہ وزیر اعظم بن گئے۔ وہ سہروردی کے ساتھ فیض صاحب کے مقدمے کی پیروی میں بھی شریک ہوتے رہے تھے اور اُن کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اسمبلی کے توڑنے کے جو نقصانات جمہوریت کو ہوئے سو ہوئے مگر ایک فائدہ راولپنڈی سازش کیس کے مجرموں کو ہو گیا۔ ان کے وکیلوں نے یہ نکتہ اُٹھایا کہ جب وہ اسمبلی ہی ختم ہو چکی جس نے وہ ''خصوصی'' بل پاس کیا تھا جس کے تحت مقدمہ چلایا گیا تو پھر وہ قانون بھی کالعدم ہو جانا چاہیے۔ اُن کی یہ بات مان لی گئی اور سارے مجرموں کو رہا کر دیا گیا۔ ان میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ لیکن اُنہیں رہائی کے فوراً بعد پھر گرفتار کر لیا گیا اور چند دن مزید جیل میں گزارنے پڑے۔ اپنے آخری خط میں فیض صاحب نے ایلس کو لکھا تھا۔

''ملاقات غنیمت تھی لیکن تمہیں اسقدر دل برداشتہ دیکھ کر رنج ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ نئی دل شکنی بہت تکلیف دہ تھی لیکن بہتری کی اُمید کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہمارے لیے تو یہ اختیاری بات نہیں امرِ مجبوری ہے۔ اگرچہ ہماری عمر کے چند بیش قیمت سال برباد ہو گئے لیکن زندگی میں پھر بھی بہت کچھ دیکھنے کو باقی ہے۔ تو آؤ دل کو سنبھالیں اور اگلی فصلِ گل کا اس وقت تک انتظار کریں جبکہ ہجوم گل پر سے خزاں کا سایہ نہ اُٹھ چکا ہو''

پھر اگلی فصل گل کی تلاش میں فیض صاحب جیل خانہ سے باہر آ گئے۔ اگرچہ یہ ملک میں جمہوریت کا دور تھا مگر دراصل جمہوریت کے ساتھ سنگین مذاق کیا جا رہا تھا۔ آئے دن حکومتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ راتوں رات نئی نئی سیاسی پارٹیاں اور دھڑے بندیاں وجود میں آ رہی تھیں۔ تین سال کے مختصر عرصہ میں چار پانچ وزیر اعظم تبدیل ہوئے۔ ملک کی اسمبلیاں سیاست کا اکھاڑا بنتی جا رہی تھیں۔ ایک طوائف الملوکی کی فضا تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن میں فیض صاحب نے جیل سے باہر قدم رکھا۔ وہ جن تکلیفوں سے گزر کر آئے تھے ابھی تک اس تھکاوٹ اور افسردگی کے اثرات باقی تھے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد کے خیال کے مطابق اُن دنوں فیض صاحب بہت اُکھڑی اُکھڑی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جیل سے رہائی

اور مارشل لا کے آغاز کا یہ درمیانی عرصہ بڑا جان لیوا تھا۔ اُن احساسات کے حوالے سے انہوں نے ان اشعار کے بارے میں لکھا تھا۔

''یہ نظم یا مسلسل غزل جس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے فیض نے اپنی طویل اسیری کے بعد اور ایوب خاں کے مارشل لا میں ایک بار پھر نظر بندی کے درمیانی عرصہ میں کہی تھی۔ اس نظم کی مجموعی فضا میں جو ذہنی کیفیت جھلک رہی ہے وہ اسی زمانے کی یادگار ہے۔ فیض صاحب پر اُن دنوں ایک قسم کی ناخوشی اور اُداسی طاری تھی۔ اُن دنوں اُنہیں کچھ ضرورت سے زیادہ فرصت بھی تھی جس کی وجہ سے کچھ بیزار سے نظر آتے تھے۔ خود سے خفا ہونے کے علاوہ وہ اپنے ان احباب سے بھی ناراض تھے جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات میں یا خوف اور مجبوری کے تحت فیض صاحب سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔''

رہائی کے بعد کہی جانے والی یہ پہلی غزل ہے جس میں بیتے ہوئے دنوں کی کلفت اور حال کی بے رونقی کا اظہار بہت صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ غزل کا ایک ایک شعر نئی سمت اور نئے راستے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تاریکی اور لاچاری کا راستہ ہے۔

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہراک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصود رہِ شوقِ وفا ہے نہ جفا ہے
احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اس حسن کا احساس ہے جو تری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں

ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے

ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم

ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک

ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی جفا ہے

وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے

زندانِ رہِ یار میں پابند ہُوئے ہم

زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

''مجبوری و دعوئ گرفتاریٔ اُلفت

دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے''

☆......☆......☆

خوشا ضمانتِ غم

1958ء میں وطن عزیز میں پہلا مارشل لا آیا۔ یہ مارشل لا بعد میں آنے والے مارشل لاؤں سے بڑا مختلف تھا۔ ایک تو اہل وطن کو ایسا کوئی تجربہ اس سے پہلے نہیں تھا دوسرے اس کی شان ہی کچھ اور تھی۔ یہ بڑے شوکت و احتشام کے ساتھ وارد ہوا۔ اس کا سربراہ بھی ایک نہایت وجیہ و جمیل جنرل تھا جو ایک عظیم عسکری سپہ سالار کی طرح شان و شکوہ کو جلو میں لیکر چلتا تھا۔ لوگ اس مارشل لا سے خائف بھی تھے اور حیرت زدہ بھی۔ جنرل ایوب خان کے لیے عوام میں خوف اور احترام کا ملا جلا ردعمل تھا۔ شاید خود ایوب خان بھی اس بات سے حیرت زدہ تھے کہ پاکستانی عوام نے اُن کا خیر مقدم کیوں کیا۔

محمد ایوب خان 1907ء میں ہزارہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔ 1926ء میں اُن کا انتخاب رائل ملٹری اکیڈمی سینڈ ہرسٹ میں ہو گیا جہاں سے وہ گریجوایٹ ہو کر نکلے اور انڈین آرمی میں کمیشن پا کر افسر بن گئے قیام پاکستان کے بعد وہ مختلف فوجی عہدوں پر تعینات رہے۔ اُنہیں 1951ء میں لیفٹیننٹ جنرل بنا کر پاکستان کا پہلا کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا۔ 1958ء میں انہوں نے ملک میں مارشل لا نافذ کرنے کے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایوب خان اور ان کے ٹولے نے حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا۔ چند سال قبل یہی کوشش اُن کے کچھ اور فوجی ساتھیوں نے میجر جنرل اکبر خاں کی قیادت میں بھی کی تھی۔ مگر اُن کی کوشش کو ''راولپنڈی سازش'' کا نام دیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔ سازش کیس کے مجرموں کی فہرست میں کچھ سویلین بھی شامل تھے جن میں فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر قابل ذکر ہیں۔ یہ کتنی دلچسپ بات ہے کہ حکومت تبدیل کرنے کی کوشش اگر ناکام ہو جائے تو ''بغاوت'' اور اگر کامیاب ہو جائے تو ''انقلاب'' کہلاتی ہے۔ ایوب خاں کا مارشل لا انقلاب کے نام سے جانا گیا۔

جب اکتوبر 1958ء کا مارشل لا نافذ ہوا تو فیض صاحب ایفرو ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے ماسکو گئے ہوئے تھے۔ اُن کے دوستوں نے اُن کو مشورہ دیا کہ وہ اِن بدلے ہوئے حالات میں پاکستان واپس نہ آئیں۔ اُن کے ایک بہت عزیز دوست مجید ملک تھے جو اُن دنوں پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے اور حکومت کے اندرونِ خانہ فیصلوں کے واقف کار تھے۔ اُنہوں نے بھی یہ پیغام بھجوایا بہتر یہ ہو گا کہ وہ کچھ عرصہ بیرونِ ملک ہی قیام کریں۔ مگر فیض صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ وہ واپس آ گئے اور

حسبِ توقع گرفتار کر لیے گئے۔

ماسکو سے روانگی سے قبل اُن کے روسی دوستوں نے بھی کہا کہ آپ پاکستان کی بجائے کسی اور ملک چلے جائیں اور حالات کے بدلنے کا انتظار کریں۔ مگر فیض صاحب نے مخصوص، پُرسکون انداز میں جواب دیا کہ ''اگر دنیا میں جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہے تو ملک کی خاطر اور اُن جیالوں کی خاطر جو مارشل لا کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں مجھے وہ قبول ہے۔'' اُن کا کہنا تھا کہ ''وہ جانتے ہیں ایسے حالات میں سر قلم ہوں گے، بازو کٹیں گے مگر ایسے مقابلوں میں فرد کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ "لندن میں بھی طلبہ کے ایک وفد نے اُن سے ملاقات کی اور اصرار کیا کہ وہ واپس وطن جانے کے اپنے فیصلہ پر نظرثانی کریں۔ پاکستان کے سادہ لوح عوام پر آمرانہ نظام مسلط کیا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جنرل ایوب خاں اور اُن کے ساتھیوں نے ملک پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ فوج، پولیس، سرکاری ملازمین، صنعت کار، اہلِ قلم، صحافی یا تو اُن کے ساتھ تھے اور یا خاموش تماشائی بن کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سیاستدانوں پر ایوب خاں نے سب سے سخت ہاتھ ڈالا تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں کو ایک مارشل لا حکم نامہ کے ذریعہ سیاست کے میدان سے رُخصت کر دیا گیا اور ملک میں سیاسی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی قربانیوں سے حاصل کیا جانے والا وطن تاراج ہو رہا تھا۔ چمن اُجڑ رہا تھا۔ ہر گھر اور ہر مسکن تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ ایسے میں فیض صاحب نے اپنے اُس درد کو اِس مختصر سی نظم میں یوں بیان کیا۔

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقیں تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو
جمالِ خون سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِدار کو نظر نہ لگے

☆......☆......☆
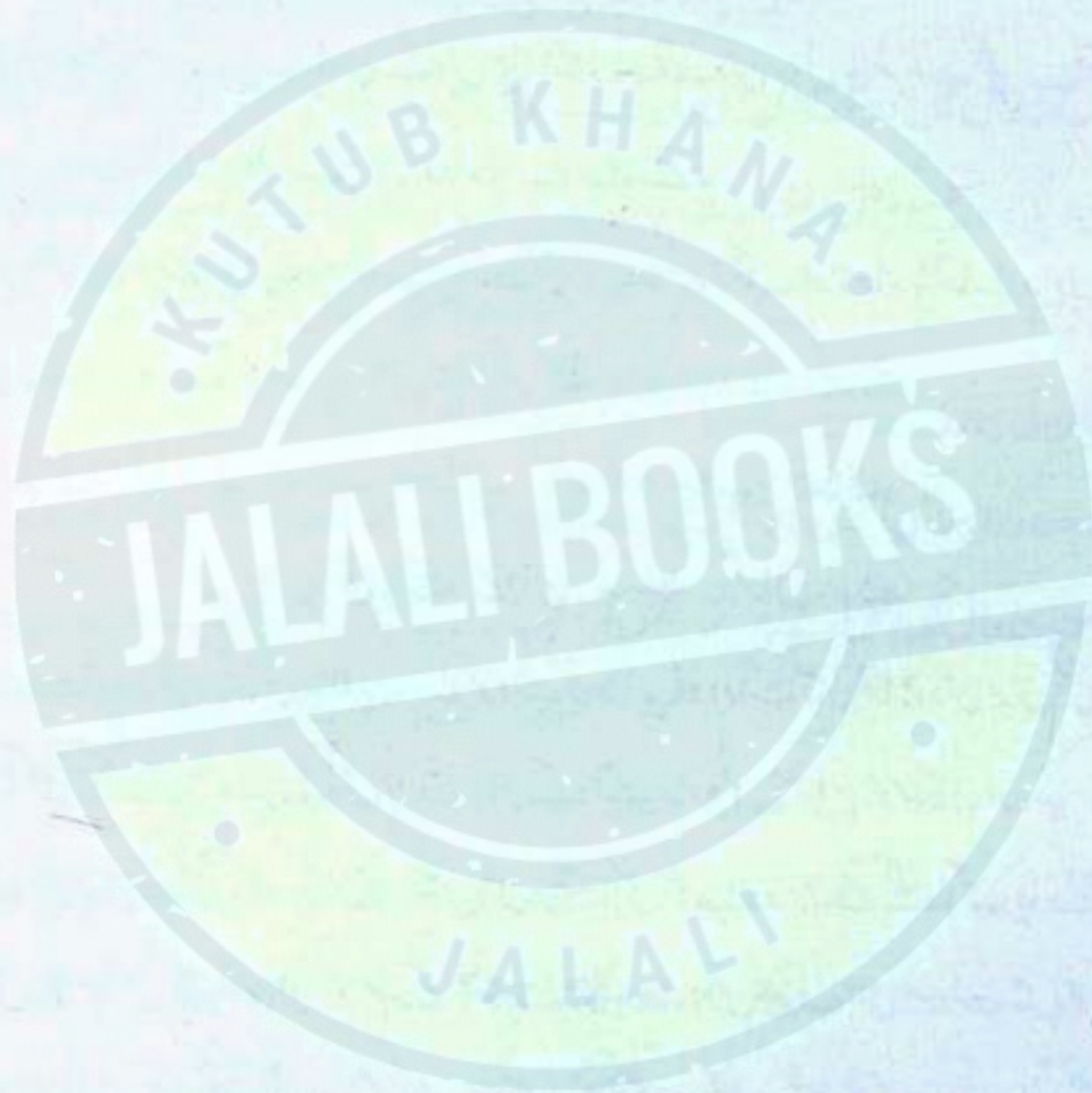
ایک شہر آشوب کا آغاز

1966ء کے بعد کا زمانہ صدر ایوب خان کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ دس سال بلاشرکتِ غیرے حکمرانی کرنے کے بعد اب اُن کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ زوال کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

اُن کے چاروں طرف خوشامدیوں اور مطلب پرست مشیروں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اور یوں رفتہ رفتہ ایک اولوالعزم، دانشمند اور حوصلہ مند حکمران بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ نام اس کا تھا مگر فیصلے کہیں اور ہونے لگے تھے۔

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مُہر اس کی ہے میزان بدستِ دگراں ہے

کچھ عالمی صورت حال بدلی، کچھ ملکی حالات نے کروٹ لی۔ اب وہ وقت نہیں تھا جو دس برس قبل تھا جب ایوب خان نے عنان حکومت سنبھالی تھی۔ اکتوبر 1958ء میں مارشل لا کے نفاذ کے وقت سادہ لوح عوام جو مہنگائی اور سیاست دانوں کی بدعنوانیوں سے عاجز آ چکے تھے اس تبدیلی پر بہت خوش ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت بھی سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگ جانتے تھے کہ آمریت بہرحال آمریت ہے۔ ایسا کوئی بھی نظام جس میں حکمران عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہوں صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ حاکم دیانت دار، عوام دوست اور خدا ترس ہو۔ ابتدائی دور میں ایوب خان میں کسی حد تک یہ خصوصیات پائی جاتی تھیں مگر رفتہ رفتہ بے ایمانی اور بدعنوانی کرنے والے پھر سے لوٹ آئے اور ایک بار پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے بلکہ اب ایسے لوگوں کی فہرست میں سیاستدانوں کے علاوہ افسر شاہی اور فوجی بیوروکریسی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

1965ء کی جنگ کے بعد اعلان تاشقند سے حالات یک دم بدل گئے۔ اس اعلان سے ایوب خاں کی مقبولیت کو سخت دھچکا لگا۔ خود اُن کے قابل اعتماد وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اُنہیں چھوڑ کر چلے گئے اور عوام کو ایوب خاں کے خلاف بھڑکانے میں مصروف ہو گئے۔ "تاشقند کی بلی" جو تھیلے میں بند تھی اس نے صدر پاکستان کی راتوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔ اگر دیکھا جائے تو اعلان تاشقند وہ مرحلہ تھا جو ایوب دور کے زوال کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ لیکن اس کے علاوہ اُن کی نامقبولیت کی اور وجوہات بھی تھیں مثلاً آمرانہ دستور، صدارتی انتخاب میں دھاندلی، صدر کے صاحبزادوں کا طرز عمل اور سیاسی مخالفین پر سختی وغیرہ۔ رفتہ رفتہ حکومت کے خلاف عوامی تحریک

نے شدت اختیار کرلی۔ مغربی پاکستان میں بھٹو اور ائیر مارشل اصغر خاں نے ان کا ناطقہ بند کیا ہوا تھا۔ اُدھر مشرقی پاکستان کے عوامی لیڈر مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمان نے قیامت مچائی ہوئی تھی۔ ملک تباہی کی طرف بڑھ رہا تھا اور قوم ابتری اور افراتفری کا شکار تھی۔ فیض صاحب نے اُنہی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

نہ یہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گلا کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے
کف باغباں پر بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

ایوب خان کے زوال میں دو اور عوامل بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک تو "جشن دس سالہ" کی تقریبات کا انعقاد۔ حکومت نے اس جشن کے دوران ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات اور تعلیمی اداروں کے ذریعہ خوب خوب ایوب خان کی تعریف کے گُن گائے۔ جیسے جیسے یہ زور بڑھا ان کی نامقبولیت اور نفرت میں عوامی سطح پر اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حکومت کو یہ جشن درمیان ہی میں منقطع کرنا پڑا۔ دوسرا سبب ایوب خان کی بیماری نے اُن کے قویٰ مضحمل کر دیے تھے اور اُمورِ حکومت پر اُن کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔

اُن کے ہمدرد اور وفادار ساتھی اُنہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور وہ تنہا رہ گئے تھے۔ شاید اب اُنہیں آنے والے وقت کی سنگینی کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ یہ وہ صورتِ حال تھی جس کے زیرِ اثر فیض صاحب نے یہ نظم تخلیق کی یہ اُن کے نزدیک ایک شہر آشوب کا آغاز تھا۔

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
پیوند رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوس ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے
یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے
اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مُہر اُس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

☆......☆......☆

یہاں سے شہر کو دیکھو

1964ء سے 1972ء تک فیض صاحب کراچی میں مقیم رہے۔ انہوں نے وہاں "عبداللہ ہارون کالج" میں ملازمت اختیار کر لی تھی، جو شہر کے ایک بے حد پس ماندہ علاقہ میں واقع تھا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء بھی مفلوک الحال اور غریب تھے۔ فیض صاحب نے یہ ذمہ داری ایک چیلنج سمجھ کر قبول کی تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کے شب و روز کی انتھک محنت نے اس کالج کو کراچی شہر میں ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب کر دیا۔ فیض صاحب نے یہ زمانہ بہت آسودگی سے بسر کیا۔ تعلیمی ادارے سے وابستگی اُن کی زندگی کی ایک بڑی آرزو تھی۔

یہ پاکستان کے پہلے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان کے عروج کا دور تھا۔

اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی چند برس انہوں نے بڑی دلجمعی کے ساتھ کام کیا۔ دور رس فیصلے کیے۔ طرح طرح کی اصلاحات متعارف کیں جن میں عائلی قوانین، زرعی اصلاحات، صنعتی اصلاحات، تعلیمی اصلاحات اسلام آباد میں نئے دارلحکومت کی تعمیر اور بنیادی جمہورتیوں کا نظام اور صدارتی طرزِ حکومت شامل تھے۔ مگر اُن کی یہ تمام کوششیں اور کامیابیاں 1965ء کی پاک بھارت جنگ کی نذر ہو گئیں۔ اس جنگ کے نتیجے میں اُن کے قدم ایسے اُکھڑے کہ پھر سنبھل نہ سکے۔

لیکن جس زمانے میں فیض صاحب نے یہ نظم لکھی تھی، ایوب خاں ان دنوں ایک جابر اور مطلق العنان آمر کی حیثیت سے اپنے اقتدار کو طول دینے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ انھوں نے خود کو "جنرل" کی بجائے فیلڈ مارشل کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے گرد خوشامدیوں کا ایک ایسا ٹولہ جمع ہو گیا تھا جو ہمہ وقت اُن کی مدح سرائی میں مصروف رہتا۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ اُن کی سخت گیری اور تند مزاجی کے سبب خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور سہمے سہمے رہتے تھے۔ یہ ظلم و استبداد کا دور تھا۔

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُن کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

فیض صاحب کراچی میں اپنے ہاؤسنگ سوسائٹی والے گھر کے بلند ٹیرس پر بیٹھے کراچی شہر کی گلیوں، سڑکوں اور بازاروں کو دیکھا کرتے ۔انہیں احساس تھا سارا ملک ایک زنداں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اپنے انہیں احساسات کو انہوں نے اشعار کے قالب میں اس نظم کی صورت میں ڈھالا ہے۔

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی؟

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیِ ہوش
ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

جو سائے دُور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبُو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کُھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

☆......☆......☆

درِ اُمید کے دریوزہ گر

مارچ 1977ء میں سارے ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ اس سے تقریباً تین ماہ قبل وزیراعظم بھٹو نے قومی اسمبلی میں الیکشن کے انعقاد کا اعلان کیا تھا حالانکہ ابھی اسمبلی کو اپنی معینہ مدت پوری کرنے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ باقی تھا۔ وزیراعظم کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اس وقت پیپلز پارٹی کی مقبولیت کا گراف بہت اونچا ہے اور اگر بلا کسی توقف کے انتخابات کرائے جائیں تو ان کی پارٹی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

عوامی سطح پر بھٹو صاحب عام انتخابات کا اعلان پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس ضمن میں پاکستان پیپلز پارٹی نے راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک بڑے جلسہ عام کا اہتمام کیا۔ میں نے خود یہ جلسہ دیکھا چونکہ میں اسٹیج پر موجود تھا۔

دراصل بھٹو صاحب کے حکم پر ان کی پارٹی کے لئے ایک ترانہ تیار کیا گیا تھا، جس کی دھن موسیقار سہیل رعنا نے بنائی تھی اور اس کی ریکارڈنگ کراچی میں پی ٹی وی کے اسٹوڈیو میں کی گئی تھی۔ وزیراعظم کے معاون اطلاعات یوسف بچ اس پراجیکٹ کے نگران اعلیٰ تھے۔ میرے ذمہ پی ٹی وی کی طرف سے یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ لیاقت باغ کے جلسہ عام میں حاضرین کو اس نغمہ کی ریکارڈنگ سنواؤں۔ عام خیال تھا کہ یہ ترانہ اس روز جلسہ کی High Light ثابت ہوگا۔ مگر بھٹو صاحب نے ان خواہشات پر پانی پھیر دیا اور اپنی تقریر میں اچانک عام انتخابات کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے پارٹی ترانے کے بول نعروں کی گونج میں دب کر رہ گئے۔

یہ پارٹی عوام کی قائد عوام کی
اپنی پاکستان پیپلز پارٹی

جلسہ میں لوگوں کا جوش وجذبہ دیکھنے کے قابل تھا۔ بھٹو صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹیج پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے وہ آج ہی الیکشن جیت چکے ہوں۔

الیکشن کے اعلان نے ملک کے سارے سیاسی حلقوں میں جیسے آگ سی لگا دی، حکومت کو یقین کامل تھا کہ اب الیکشن میں سرکاری پارٹی کی کامیابی کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اُن کا خیال تھا کہ حزب اختلاف غیر متحد ہے اور ان کا یکجا ہونا ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ الیکشن کے اعلان کے فوراً ہی بعد ساری مخالف پارٹیاں یک جا ہو گئیں اور اُنہوں نے مفتی محمود کی
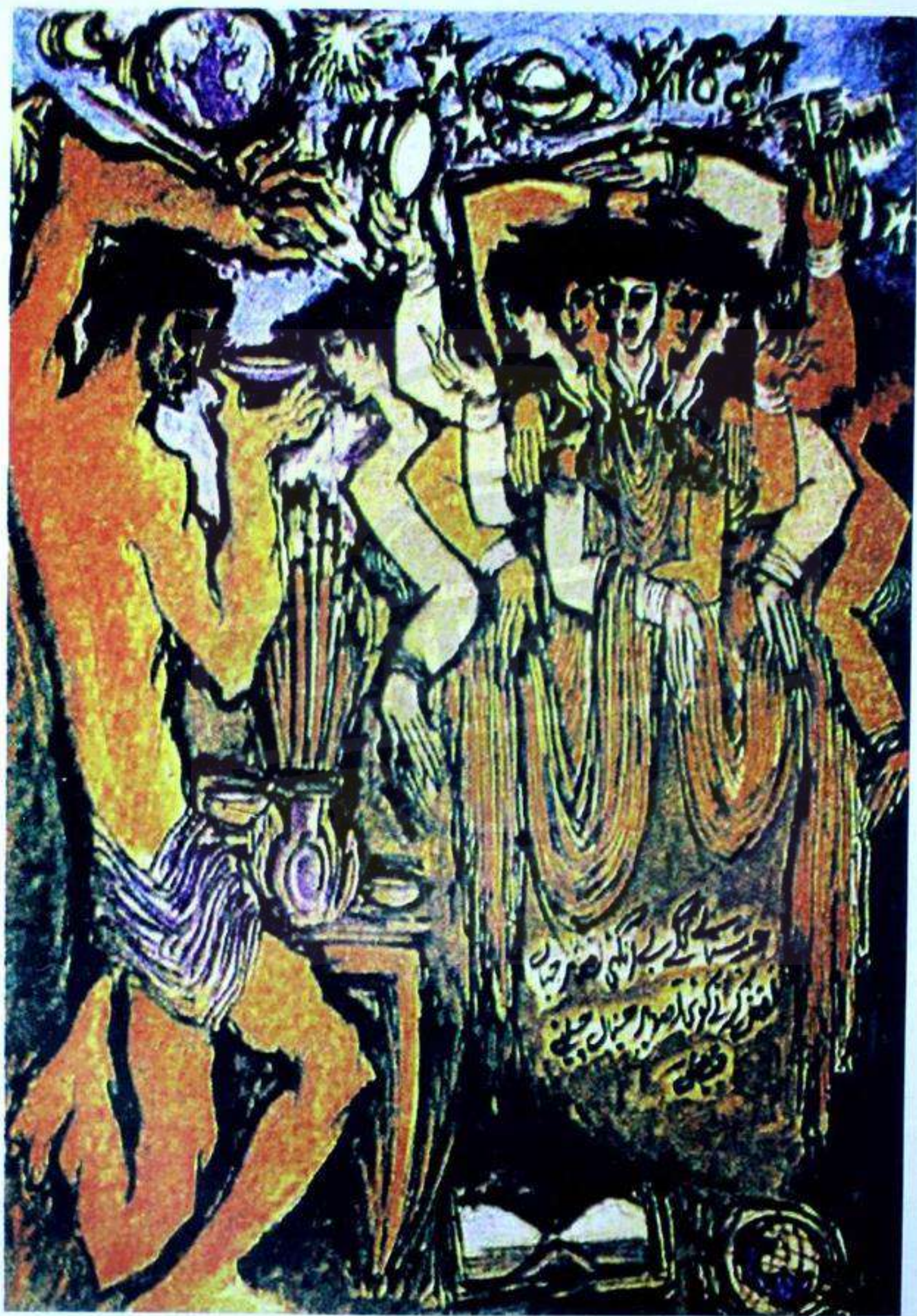
صادقین کی پینٹنگ

قیادت میں ''پاکستان قومی اتحاد'' کے نام سے، ساتھ مل کر الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کے قائدین کو اس کی اُمید نہیں تھی۔

مولانا کوثر نیازی نے جو بھٹو صاحب کی کابینہ میں وزیر تھے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ " مجھے بھٹو صاحب کی ایک شدید خواہش کا علم تھا، جس کا اظہار انہوں نے پیشتر مواقع پر میرے سامنے کیا تھا اور وہ یہ کہ وہ انتخابات میں دو تہائی اکثریت سے جیتنے کے خواہش مند تھے اور اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لئے انہوں نے دھونس اور دھاندلی سے دو تہائی اکثریت حاصل کر لی۔ دراصل یہی اس شورش اور احتجاج کا نقطہ آغاز تھا جو بلآخر بھٹو صاحب کے زوال کا سبب بنا۔''

1972ء سے 1977ء تک بھٹو راج کا زمانہ تھا۔ لیکن فیض صاحب اس دور میں بھی حالات سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ ابتدا میں جب پاکستان پیپلز پارٹی ''روٹی کپڑا اور مکان'' کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئی تو فیض صاحب نے اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سارے خواب مسمار ہوتے گئے۔ سیاست کے بدلتے ہوئے رنگ فیض صاحب کے لئے دکھ کا باعث تھے۔ اپنی اس مایوسی اور افسردگی کا اظہار گاہے گاہے اُن کے اشعار میں ہوتا رہتا تھا۔

یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے
اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

جیسے جیسے انتخابات کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ ملک میں اضطراب اور انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔ حکومت مخالفین کو خاموش کرانے کے لئے نئے نئے حربے استعمال کر رہی تھی۔

فیض صاحب نے ان حالات میں ''خود کلامی'' کا سہارا لیا۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

بھٹو صاحب کی شخصیت اور ان کی پارٹی کی پالیسوں پر اس سے زیادہ صاف اور مؤثر تبصرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

انتخابات کے اس دنگل سے فیض صاحب ناخوش بھی تھے اور کچھ کچھ خوف زدہ بھی۔ ایک بڑے شاعر کی طرح کہ جو ہمیشہ مستقبل میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انہیں بڑی حد تک اندازہ ہو چکا تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟

پھر پُھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے
دردمندِ عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے
پھر دُہل کرنے لگے تشہیرِ اخلاص و وفا
کشتۂ صدق و صفا کا دل دکھانے کے لیے

ہم کہ ہیں کب سے درِ اُمّید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چُن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

فیض صاحب نے اپنی یہ نظم 1977ء کے الیکشن سے چند روز قبل پہلی بار مجھے راولپنڈی کلب میں سنائی تھی۔ اُس شام وہ بہت اُداس تھے۔

☆......☆......☆

لہو کا سراغ

1964ء ایوب خان کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی دانست میں سارے سیاست دانوں کا زور توڑ دیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کی مشاورت سے اپنی سیاسی پارٹی بنالی تھی جسکا نام ویسے تو مسلم لیگ تھا مگر اسے کنونیشن مسلم لیگ کے نام سے پہچانا جاتا تھا چونکہ وہ کراچی کے ساحلی علاقے میں قایم ایک "مچھلی گھر" میں منعقد ہونے والے کنونیشن کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔ سرکارِ وقت کے خوشہ چیں جوق در جوق اس پارٹی میں شمولیت حاصل کر رہے تھے۔ دوسری جانب اصلی مسلم لیگ تھی جو کونسل مسلم لیگ کہلاتی تھی کم وبیش سارے پرانے سیاستدان جن کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اسی میں شامل تھے۔ سابق وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کونسل لیگ کے صدر تھے ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ کونسل لیگ کے علاوہ اور بھی بہت سی سیاسی پارٹیاں تھیں جو ساری دشواریوں اور پابندیوں کے باوجود کسی نا کسی طرح چل رہی تھیں۔ مشاہیر سیاسی رہنماؤں میں مولوی فضل الحق، مولوی فرید الدین، مولانا بھاشانی، شیخ مجیب الرحمان، مفتی محمود، میاں افتخار الدین، ولی خان، ممتاز دولتانہ، ایوب کھوڑو۔ مولانا مودودی، نوابزادہ نصر اللہ خان، خان عبدالقیوم خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

چھ سات برسوں میں ایوبؔ خاں نے بہت سی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں اور ملکی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سے کام کیئے تھے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ ملک میں، خصوصاً مغربی پاکستان میں کافی حد تک مقبول تھے۔ حالات کو مکمل طور پر قابو میں سمجھتے ہوئے ہر فوجی ڈکٹیٹر کی طرح ایوب خاں کو بھی "جمہوریت" نافذ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ پہلے ہی بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کرا چکے تھے اور ملک کے دونوں حصّوں میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات کرانے کے بعد کونسلوں کے چالیس چالیس ہزار چیرمینوں پر مشتمل انتخابی ادارے یعنی electoral collage تشکیل دیے جا چکے تھے۔ اُنھوں نے سمجھا تھا کہ اب فضا ہر طرح ہموار ہے اور ان کے ایک "عوامی صدر" بننے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ لہذا اُنھوں نے الیکشن کا اعلان کر کے زور شور سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کر دیا۔ حزبِ اختلاف نے ان کے خلاف یکجا ہو کر ایک متفقہ مدِ مقابل کھڑا کرنے کی کوشش کی اور آخر کار بڑی منت سماجت کے بعد بانیِ پاکستان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو الیکشن لڑنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1965 میں صدارتی

الیکشن ہوئے اور کمال دھاندلی کے بعد ایوب خاں مادرِ ملت کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئے۔ اگر چہ ملک کے بڑے صوبے یعنی مشرقی پاکستان کے شہروں میں اُن کو محترمہ فاطمہ جناح سے کم ووٹ ملے۔ بہر حال اس کامیابی کے بعد سرکاری حلقوں میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور ایوب خاں نے خود کو ایک "عظیم فاتح" سمجھنا شروع کر دیا کہ اُنھوں نے قائداعظم کی بہن کو شکست دی ہے۔ جلسے جلوس چراغاں اور جشنِ فتح کے مناظر میں نے کراچی شہر میں خود دیکھے اگر چہ وہاں بھی ووٹوں کے لحاظ سے مادرِ ملت کو ایوب خاں پر برتری حاصل تھی، اور الیکشن کی دھاندلیوں کے خلاف لوگوں میں بڑی بے چینی اور اضطراب پایا جاتا تھا۔ حالات کے بگڑنے کا اندازہ کرتے ہوئے مقامی حکام نے شہر میں جلوس نکالنے پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی۔ لیکن پابندیوں کے باوجود فتح کے نشہ میں چور سرکاری مسلم لیگ نے جلوس نکالا اور اپنے مخالفین کے خلاف نعرے بازی کی۔ میرے ایک صحافی دوست نے یہ جلوس "تین ہٹی" کے پُل سے لالوکھیت (حال لیاقت آباد) کی طرف خود جاتے دیکھا۔ اس میں ایک بڑے کُھلے ٹرک پر ساٹھ ستر ہیجڑے ہاتھوں میں لالٹینیں لئے سوار تھے جو فاطمہ جناح کا الیکشن کا نشان تھا۔ اِن ہجڑوں کے بال سفید کئے گئے تھے تا کہ ان میں مادرِ ملت سے مشابہت پیدا ہو سکے۔ ایسے جلوسوں میں "ہوائی فائرنگ" بھی ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا جب یہ جلوس ہوا میں بندوقیں چلاتا ہوا لالوکھیت کے علاقہ میں داخل ہوا اور وہاں مادرِ ملت کے حامیوں نے ایوب خاں کے خلاف نعرے لگائے تو "ہر آول" دستے میں جیپ پر سوار کارکنوں نے مجمع پر گولی چلا دی۔ کہتے ہیں اس کی قیادت صدرِ مملکت کے صاحبزادے کر رہے تھے۔ فائیرنگ کے نتیجہ میں ایک نوجوان ہلاک ہو گیا۔ ہجوم بھڑک اُٹھا اور حالات بگڑ گئے۔

ساری رات مقتول نوجوان کے ورثا اور عزیز رشتہ دار اس کی لاش لئے علاقے کے مختلف تھانوں کے چکّر لگاتے رہے مگر "اوپر کی" ہدایت کے سبب پولیس والوں نے "ایف آئی آر" درج کرنے سے انکار کر دیا اس طرح اس مظلوم نوجوان کی لاش بغیر کسی لکھا پڑھی کے دفنا دی گئی۔ نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا۔ فیض صاحب نے اس واقعہ کو بڑی دردمندی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیٔ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبّا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانہ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا

کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا، بے آسرا، یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدّعی، نہ شہادت، حساب پاک ہُوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہُوا

☆......☆......☆
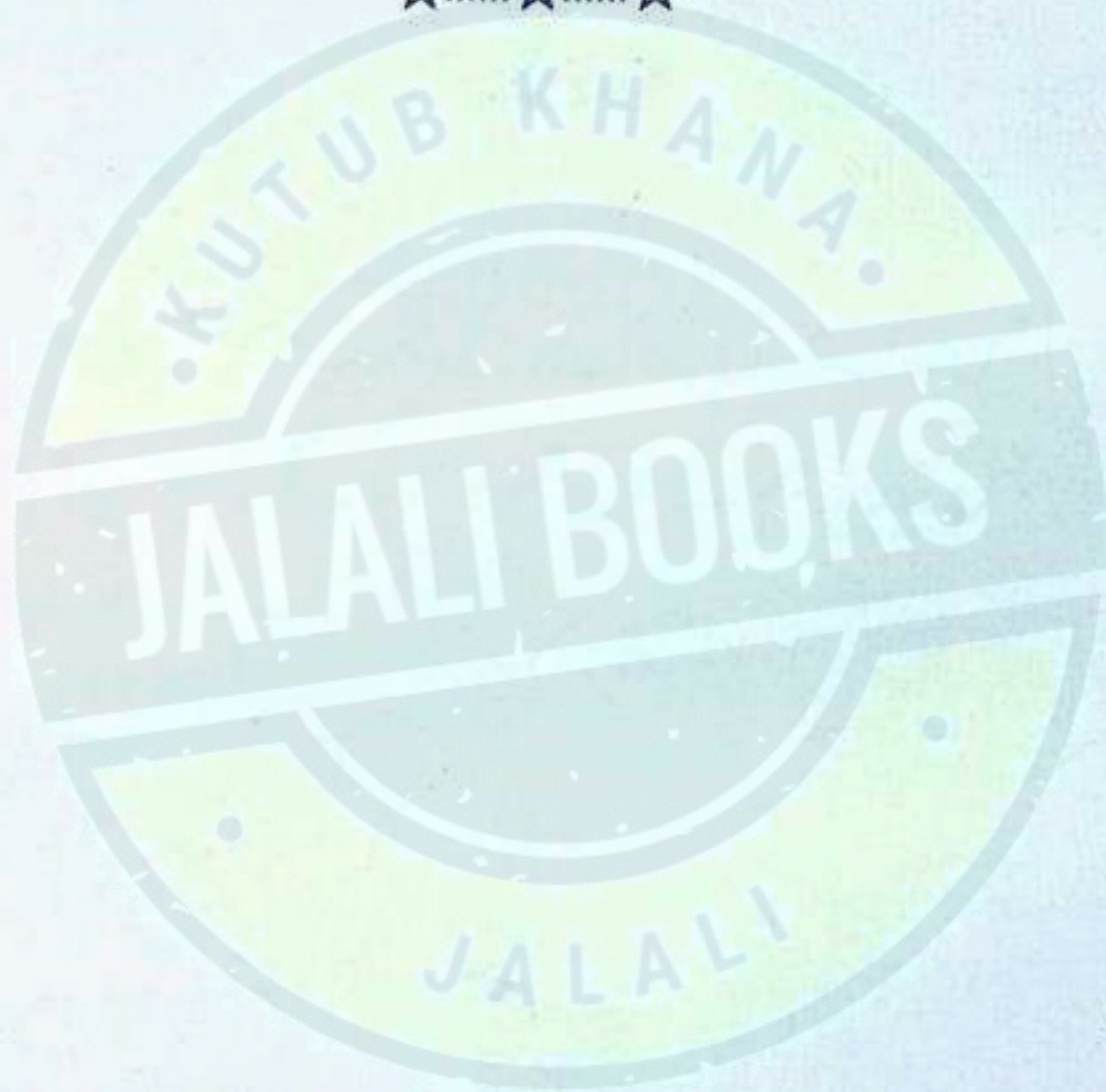
وا میرے وطن

عرصہ جنگ

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا ہمرنگِ گل طنّاز کیا
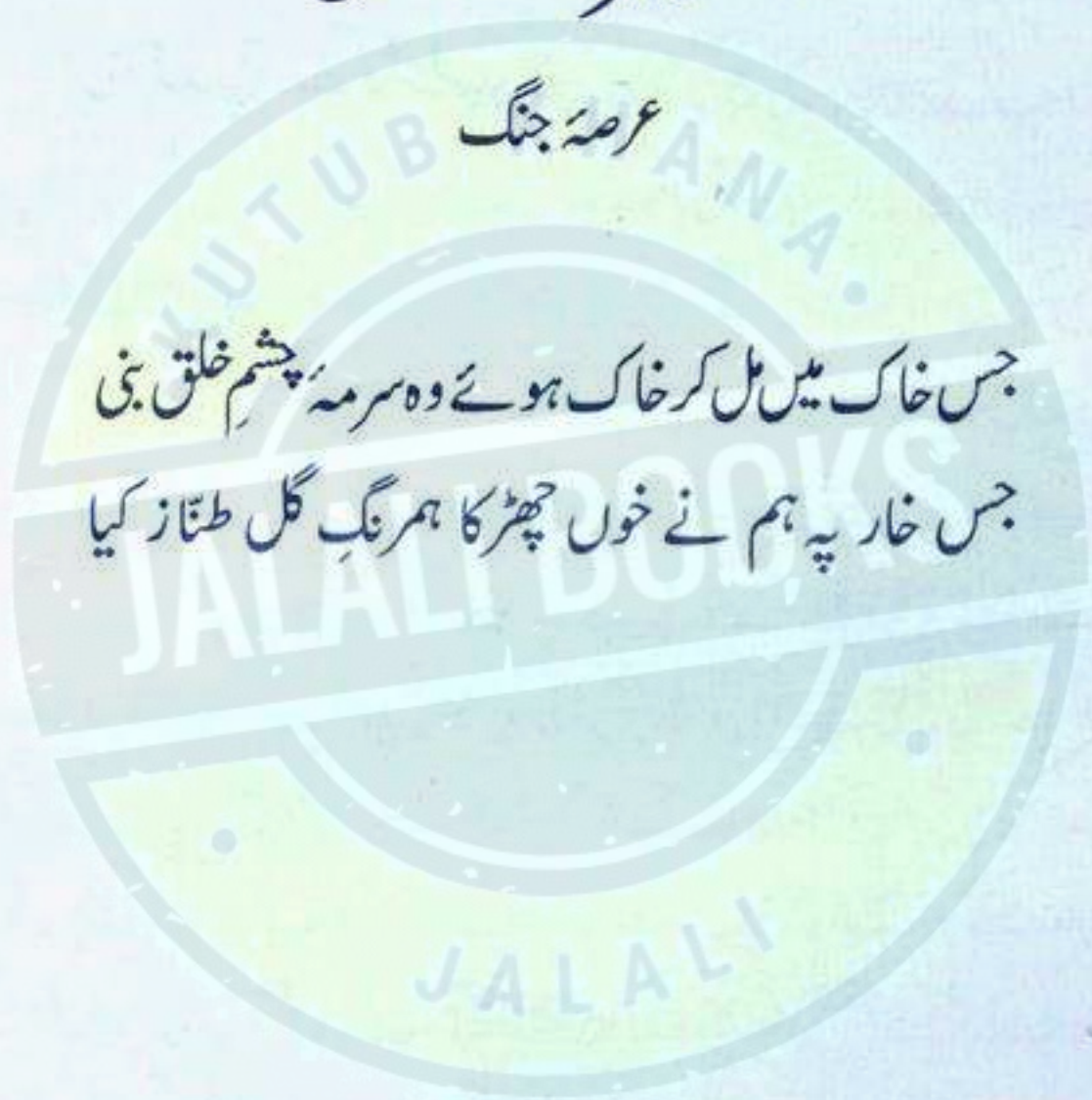
کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب

سپاہی کا مرثیہ
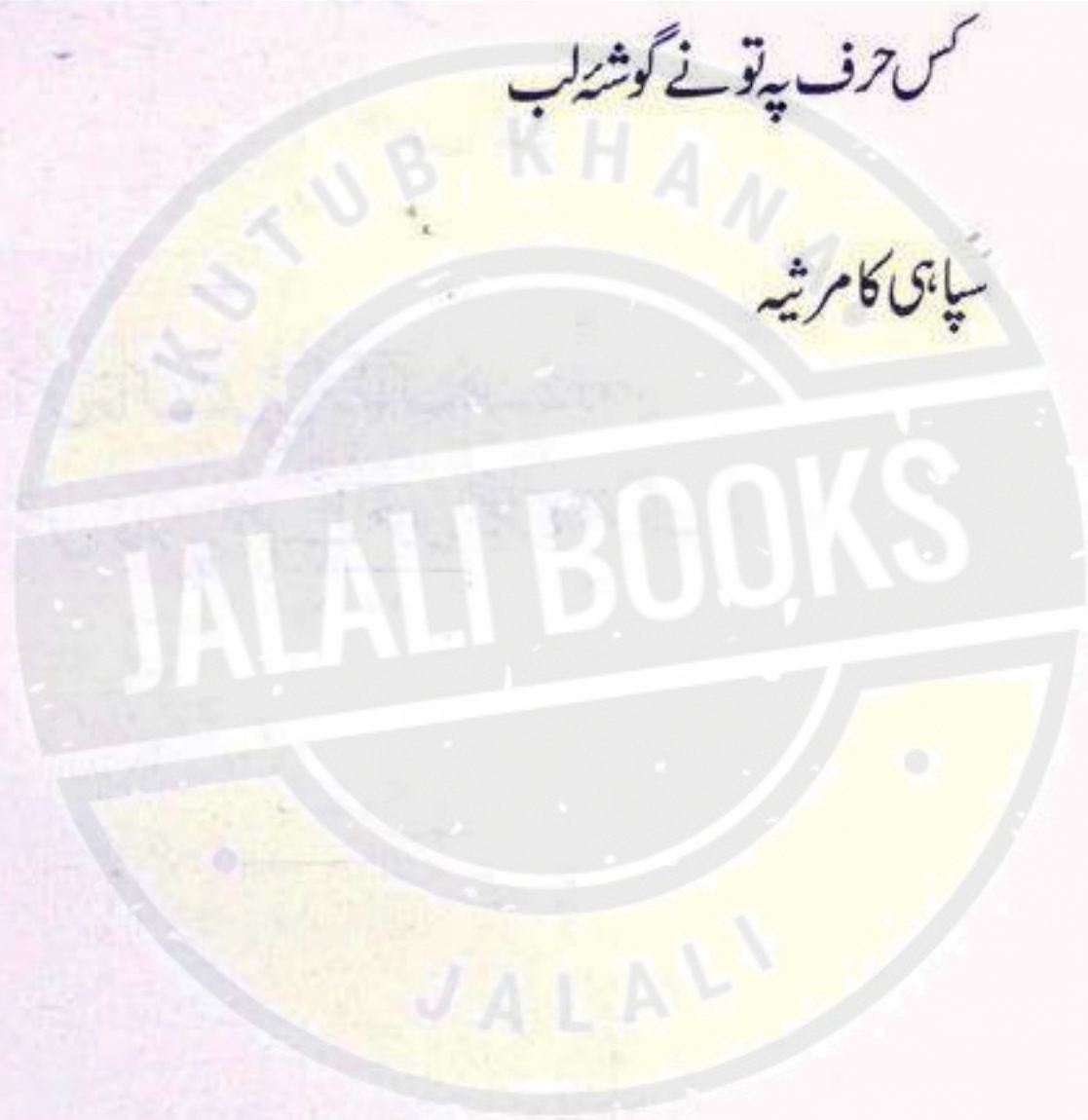
کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب

یہ نغمہ فیض صاحب نے 1965ء کی جنگ کے دوران لکھا۔

یہ پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلی باقاعدہ اور باضابطہ جنگ تھی۔ اس سے قبل جو چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی وہ چھوٹے موٹے معرکوں کی شکل تھی مگر ایسی صورتحال اس سے قبل کبھی پیش نہیں آئی تھی کہ دونوں ملکوں کی بری، بحری اور فضائی افواج بڑے پیمانے پر ایک دوسرے کے مدِ مقابل صف آرا ہوں۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سب سے بڑا تنازعہ اور ہر جنگ کا سبب کشمیر ہی رہا ہے۔ یہ تنازعہ برطانوی حکمران برصغیر سے رخصت ہوتے وقت ''آخری تحفہ'' کے طور پر دے گئے تھے۔ انگریز کے سازشی ذہن کی یہ کامیاب ''تخلیق'' دونوں ملکوں کی سرحدوں سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔ اس دستاویز پر ان دو نوزائیدہ ملکوں کی سرحدوں کا فیصلہ اور تعین کرنے والے انگریز منصف سر ریڈکلف کے دستخط ہیں۔ ان دستخطوں کے نتیجے میں گذشتہ نصف صدی میں جتنی جانیں ضائع ہوئیں، جتنے بچے یتیم ہوئے، جتنی عورتیں بیوہ ہوئیں اور جتنے گھر، محلے اور بستیاں نیست و نابود ہوئے اس کا جواب شاید ایک روز تاریخ کی عدالت میں کسی کو دینا ہی ہوگا۔ ماضی میں ہونے والی ہر لڑائی، ہر چپقلش اور تنازعہ کی طرح 1965ء کی جنگ کا سبب بھی کشمیر ہی تھا۔

یہ وہ زمانہ جب ایوب خان پاکستان کے صدر، ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ تھے۔ اصل جنگ شروع ہونے سے کافی دن پہلے سے آسمان پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے اور دونوں ملکوں کی سرحدوں پر، خصوصاً کشمیر کی جنگ بندی لائن پر مسلسل جھڑپوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ مگر شاید یہ خیال کسی کو نہ تھا کہ بھارت بلا اعلان ایک بڑی اور باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دے گا لیکن ایسا ہی ہوا۔ 6 ستمبر کی صبح منہ اندھیرے دشمن نے چوروں کی طرح پاکستان کے تاریخی شہر لاہور پر تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ بے خبری میں بھارت کی فوج لاہور کے سرحدی گاؤں ''واہگہ'' کی ایک چوکی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بھارتی فوج لاہور پر قبضہ کرنا چاہتی تھی، لیکن پاک فوج کی مداخلت سے یہ پیش قدمی رک گئی اور بعد ازاں صبح کا اجالا ہوتے ہی پاک فضائیہ بھی جنگ میں شریک ہوگئی۔۔۔ لاہور کے شہریوں کو اس جنگ کا علم صبح سویرے پاکستان ایئر فورس کے F104 طیاروں کی پروازوں سے ہوا جنہوں نے شہر کے آسمان پر پرواز کرتے ہوئے Sound Barrier عبور کیا اور ایک زبردست دھماکہ ہوا جسے سن کر سب لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ میں

ان دنوں لاہور میں تھا اور میں نے 17 دن کی اس جنگ کا نظارہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

دن چڑھے صدر ایوب خان کی تقریر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی جس نے اہلیانِ پاکستان کے لہو کو گرما دیا۔ میرا خیال ہے اس سے بہتر تقریر ایوب خان نے اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہیں کی۔ انہوں نے اپنی گرجدار آواز میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے عزیز ہم وطنو۔ دس کروڑ پاکستانی شہریوں کے لئے آزمائش کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ آج صبح لاہور کے محاذ پر بھارتی فوجوں نے پاکستانی علاقہ پر حملہ کیا۔ یہ بھارت کی جارحانہ سرگرمیوں کی ایک کڑی ہے جس میں وہ گذشتہ پانچ ماہ سے مصروف تھا۔'' تقریر ختم کرتے کرتے انہوں نے کہا ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم انہیں دندان شکن جواب دیں جو سامراجیت میں بھارت کی مہم جوئی کو ختم کردے۔ دشمن کا پہلا مقابلہ کرنے کے لئے لاہور کے جن دلاوروں کو منتخب کیا گیا ہے تاریخ میں انہیں ان بہادروں کا مقام حاصل ہوگا جنہوں نے دشمن کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔ پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دل لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی آواز پر دھڑکتے ہیں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارت کی توپیں خاموش نہیں ہو جاتیں۔ انہیں پتہ نہیں کہ انہوں نے کس قوم کو للکارا ہے۔''

صدرِ پاکستان کے ''اعلان جنگ'' نے سارے ملک میں آگ لگا دی۔ مسلح افواج، شہری، دیہاتی، مزدور، کسان، طالب علم، عورتیں، بچے غرض ہر پاکستانی شہری اپنے اپنے طور پر اس جنگ میں شریک ہو گیا۔ ملک کے سارے ادیب، شاعر، موسیقار بلا کسی اجرت کے اس کام میں شریک تھے۔ کراچی سے پشاور تک ایک ہی جذبہ تھا۔ شاعروں نے عسکری نغمے اور قومی گیت لکھے۔ جنگ کے سترہ دنوں میں لکھے ہوئے یہ ترانے صبح سے رات تک فضاؤں میں گونجتے رہتے۔

خطۂ لاہور تیرے جانثاروں کو سلام

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے

اے راہِ حق کے شہیدو!

اے وطن کے سجیلے جوانوں میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

فیض صاحب ان دنوں کراچی میں تھے لیکن جب حکومت نے جنگ کی پبلسٹی کے لئے ایک یونٹ بنائی اور ان کو اس میں مشیر کی حیثیت سے شامل کرنا چاہا تو وہ فوراً راولپنڈی پہنچے اور جنگ ختم ہونے تک اس خصوصی یونٹ میں کام کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں ایک بار ڈاکٹر ایوب مرزا نے ان سے پوچھا کہ ''آپ کے نکتہ چین آپ کو بھارت نواز کہتے ہیں اور اب آپ پاکستان کی سرکار کے ساتھ اس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ یہ کیا قصہ ہے؟ فیض صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا'' بھئی ہم کسی کے خلاف کام نہیں کر رہے ہیں، رہی بات ''بھارت نوازی کی'' تو یہ کیا بکواس ہے۔ یہ ''بھارت'' کیا اور یہ ''نوازی'' کیا۔ بھارت ایک ملک ہے جو ہمارے ملک سے بڑا ہے۔ ہمارے ملک میں ابتدا سے ہی ظلم و تشدد لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ یہاں

ایک ایسا نظام قائم ہو چکا ہے جس کی اساس عوام کی تذلیل، بے حرمتی اور لوٹ پر قائم ہے۔ بھارت میں بھی یہی قصہ ہے۔ وہ بڑا ملک ہے لہٰذا وہاں یہ حرکتیں ہم سے زیادہ بڑے پیمانے پر ہوتی ہیں اور رہی بات سرکار کے ساتھ کام کرنے کی تو جب آپ کے وطن کے ناموس اور وجود پر حرف آئے تو حُب الوطنی کا تقاضہ ہے کہ آپ اس کے دفاع میں شریک ہوں۔"

فیض صاحب سے ایک بار میں نے بھی دریافت کیا تھا کہ "آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ نے پاکستان کے لئے ترانے نہیں لکھے، جیسے سب شاعروں نے لکھے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا تھا "بھئی ہم نے بھی لکھے ہیں مگر ہمیں اس طرح کے ترانے لکھنے نہیں آتے جیسے دوسرے لکھتے ہیں۔" پھر انہوں نے خود ہی اپنی اس غزل کا حوالہ دیا جس کا مطلع ہے۔ "کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب" یہ اشعار انہوں نے اسی جنگ کے موقع پر لکھے تھے اور وہ خود اس کو ایک عسکری نغمہ سمجھتے تھے۔

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا
سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا
بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اِس ہاتھ پہ سر، اُس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا
جس خاک میں مل کر خاک ہُوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہمرنگِ گلِ طنّاز کیا
لو وصل کی ساعت آپہنچی، پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا

☆......☆......☆

سپاہی کا مرثیہ

ایک محفل میں کسی نے فیض صاحب سے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں آپ کی نظم ''سپاہی کا مرثیہ'' آپ نے ویت نام کی جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کے لئے لکھا ہے، کیا یہ بات سچ ہے۔؟ یہ بات سن کر فیض صاحب مسکرائے اور پھر انہوں نے جواب دیا ''بھئی یہ مرثیہ ہم نے پاکستان اور بھارت کی 1965ء کی جنگ کے موقع پر لکھا تھا۔ یہ ایسے پاکستانی سپاہی کا مرثیہ ہے جس نے انتہائی خلوص اور جوش کے ساتھ مادرِ وطن کے دفاع کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا... رہی یہ بات کہ یہ مرثیہ ویت نام کے کسی ''حریت پسند'' کے لئے ہے تو شاید یہ بھی اتنی غلط نہیں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ظلم، جبر اور بے انصافی جہاں بھی ہوگی، جس مقام، جس ملک میں بھی بلا لحاظ رنگ ونسل، دین و مذہب، مظلوم عوام آواز اٹھائیں گے اور جنگ کریں گے تو ہماری آواز ان کی آواز میں شامل ہوگی۔'' ان کا کہنا تھا ''کوئی سپاہی بھی اگر ایسی جنگ میں کام آئے جو اس کی اپنی زمیں اور اپنے وطن کے دفاع اور اس کی بقا کے لئے لڑی جارہی ہے تو وہ ایک مجاہد کا رتبہ رکھتا ہے اس کی موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس طرح ''سپاہی کا مرثیہ'' ہر اس سپاہی کے لئے ہے جو اپنے وطن کی حفاظت اپنی قوم کی سرفرازی کے لئے لڑتا ہوا مارا گیا۔ تو اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ''سپاہی کا مرثیہ'' ویت نام کی جنگ میں کام آنے والے سپاہی کے لئے ہے تو یہ بھی سچ ہے۔ ان کے نزدیک ایک دکھیا ماں خواہ وہ پاکستانی ہو یا ویتنامی بہر حال ماں ہوتی ہے اور ایسے شہید کی دلہن بلا تفریق مذہب وملت اپنے بالم کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔''

فیض صاحب کی فکر اور خیالات اور ان کے مخاطبین کو جغرافیائی حدود کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شاعری کی آفاقیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے ایک انمول سوغات سمجھ کر ساری دنیا میں تقسیم کیا جائے۔

فیض صاحب نے برسوں پہلے جب وہ حیدر آباد جیل میں تھے اور ان کے بھائی کی وفات کو بہت عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ایلس کو ایک خط میں لکھا تھا ''ایسی ہی کسی صبح اسی چاند نے اس جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک تنہا مسافر کو پکارا تھا اور اسے کسی نامعلوم دنیا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہ مسافر میرا بھائی تھا۔ شاید اس وقت یہی چاند ایسے بہت سے چہروں پر چمک رہا ہے جو مر کر درد سے آزاد ہو چکے ہیں۔ کوریا کے کیمپوں میں محبوس قیدیوں کے چہرے بھی یہ سب مقتول نوجوان بھی میرے بھائی تھے کہ جب وہ زندہ تھے تو ایسی دور دراز سرزمینوں پر زندہ تھے جو میں نے نہیں دیکھیں لیکن وہ میرے تن میں بھی زندہ تھے اور میرے لہو میں ان کا لہو بھی شامل تھا۔ جن

قاتلوں نے انہیں قتل کیا ہے انہوں نے میرے تن کا کوئی حصہ بھی قتل کیا ہے۔ اور میرا بھی کچھ لہو بہایا ہے"۔

یہ سب کچھ میں نے اس لے بیان کیا کہ ایک عظیم شاعر کی سوچ بھی عظیم ہوتی ہے اگر چہ یہ مرثیہ یقیناً ایک پاکستانی سپاہی کا مرثیہ ہے لیکن یہ ہر اس سپاہی کا مرثیہ بھی ہے جو اپنی دھرتی کی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے میدانِ کارزار میں کام آیا۔

یہی بات فیض صاحب کی جنگ کے زمانے کی اس تیسری نظم پر بھی صادق آتی ہے جس کا عنوان ہے "بلیک آوٹ"۔

جب سے بے نور ہوئی ہیں شمعیں
خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا
کھو گئی ہیں مری دونوں آنکھیں

اور نظم کا آخری بند

ایک پل ٹھہرو کہ اس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب یدِ بیضا لے کر
اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گہر
جامِ ظلمت سے سیہ مست
نئی آنکھوں کے شب تاب گہر لوٹا دے
ایک پل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے
اور نیا دل میرا
زہر میں دُھل کے فنا ہو کے کسی گھاٹ لگے
پھر پئے نذر نئے دیدہ و دل لے کے چلوں
حسن کی مدح کروں شوق کے مضمون لکھوں

فیض صاحب جنگ کے خلاف تھے۔ وہ دل سے اس بات کے قائل تھے کہ جنگ کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ لیکن وطن کے دفاع کے لئے جنگ کرنے کو جائز سمجھتے تھے

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال،
اب جاگو میرے لال

تمری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں ان دُکھین اَکھین نے
ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی جن کی جیوتی
دان سے تمرا
جگ جگ لاگا
نام چمکنے
اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دُلھنیا، بانکے ویرن
سُونا تمرا راج پڑا ہے
دیکھو کتنا کاج پڑا ہے
بیری بیراجے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال
اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال
ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال

اب جاگو میرے لال

☆......☆......☆

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

سقوطِ ڈھاکہ

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
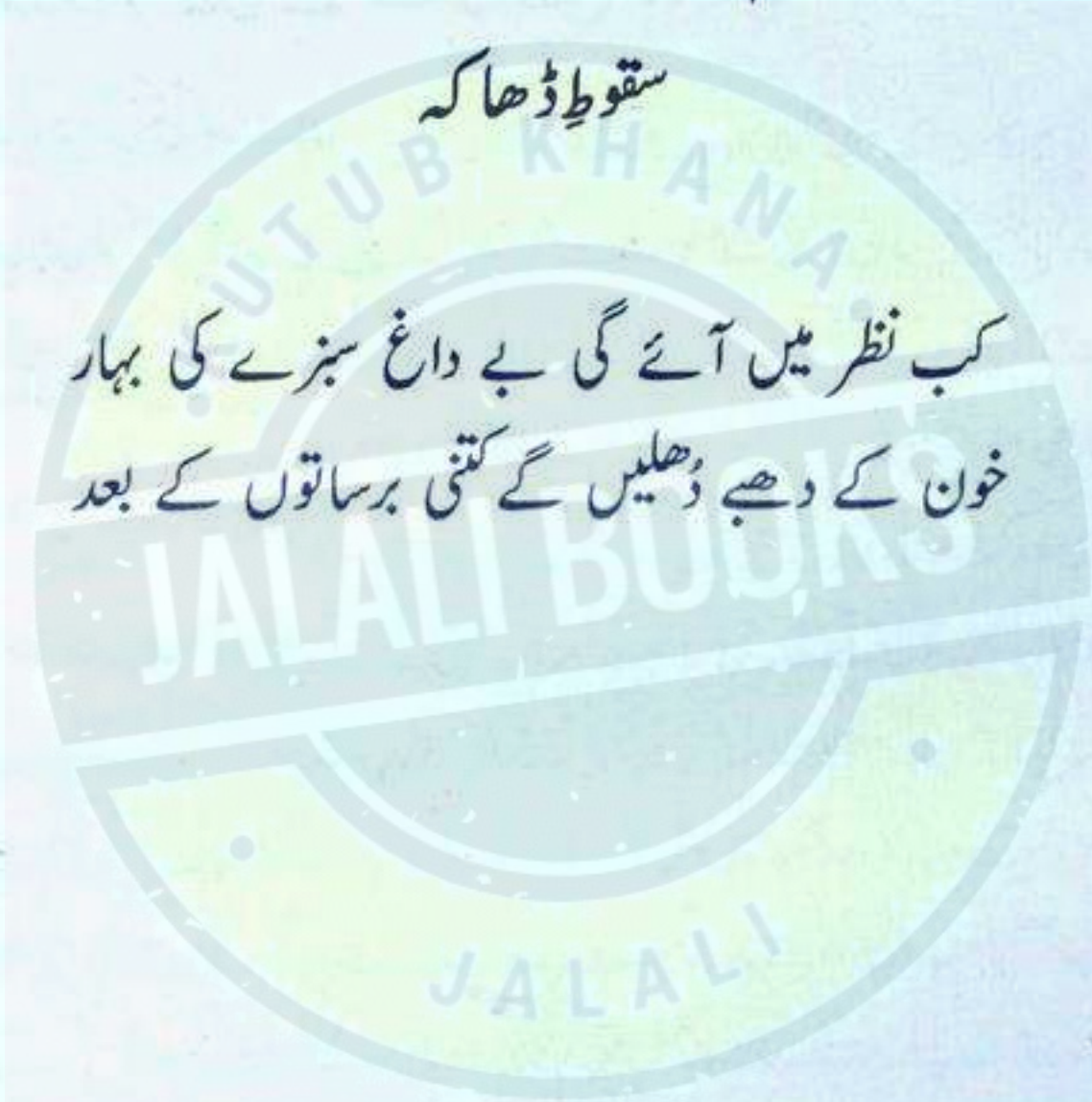
- حذر کرو مرے تن سے
- تہ بہ تہ دل کی کدورت
- غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے
- رفیق راہ تھی منزل
- پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو
- ڈھاکہ سے واپسی پر
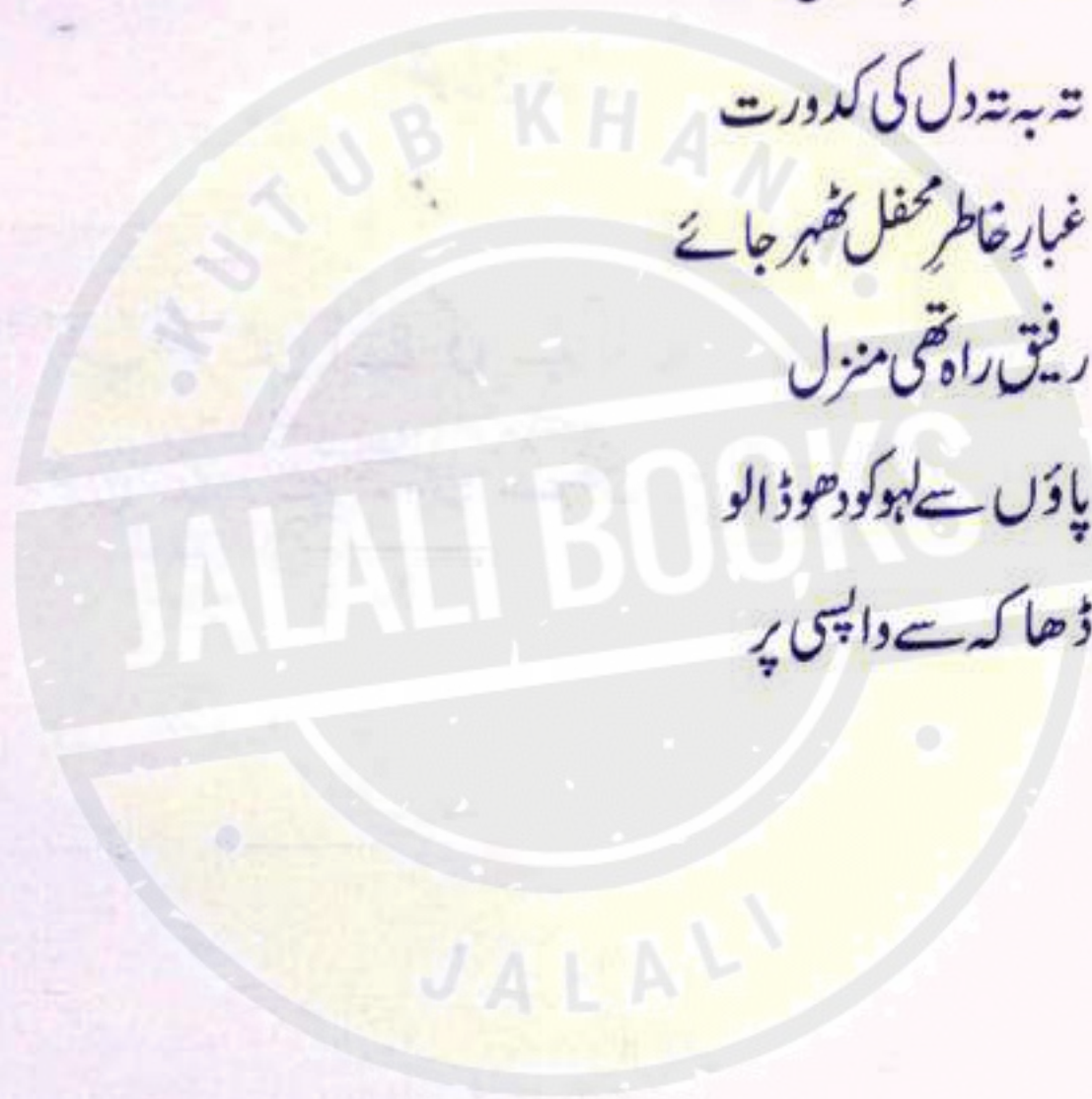
حذر کرو مرے تن سے

26 مارچ 1971ء کا دن ایک ایسا منحوس اور بدبخت دن تھا جب وطن کے سپاہیوں نے خود اپنے لوگوں پر گولیاں برسائیں اور قتل وغارت کا ایسا بازار گرم کیا جس کی سیاہی تاریخ کے صفحات سے کبھی مٹائی نہیں جا سکے گی۔

ملک کے حالات 1970ء کے الیکشن کے بعد سے خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو الیکشن میں اکثریت حاصل کر کے ان دونوں حصوں کے بلاشرکتِ غیرے لیڈر تسلیم کر لئے گئے تھے۔ 1971ء کا آغاز سیاسی مذاکرات اور صلاح مشوروں سے ہوا۔ دونوں بڑے لیڈر اور ان کے معاونین نے بار بار ملاقاتیں کیں کہ کسی صورت کوئی ایسی راہ نکال سکیں جس سے ملک کی سالمیت اور یک جہتی برقرار رہے اور عوامی خواہشات کے مطابق ایسا آئین وجود میں آ سکے جو ملک میں پائیدار امن اور استحکام کا ضامن ہو لیکن کچھ تو ان دونوں رہنماؤں کی اپنی بدنیتی اور کچھ تیسرے فریق یعنی جنرل یحییٰ خان کے پوشیدہ عزائم کے سبب گفت وشنید میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

پھر ایک وقت ایسا آ گیا جب ان رہنماؤں نے ایک دوسرے سے بات چیت کرنے اور جنرل یحییٰ خاں کے احکامات تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ مارچ کے پہلے ہفتہ تک حالات مکمل طور پر قابو سے باہر ہو چکے تھے۔

۷ مارچ کو شیخ مجیب الرحمان نے متوازی حکومت بنانے کا اعلان کیا۔ اسی روز ان کی رہائش گاہ پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا گیا۔ مشرقی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے ان کی ہدایات اور احکامات کو تسلیم کیا اور سارے سرکاری محکموں نے یحییٰ خان کی حکومت کے خلاف ایک طرح سے اعلانِ جنگ کر دیا۔ بنگالی عوام نے بھی اس کی بھرپور حمایت کی۔ اب تخریب کار کھلم کھلا سڑکوں پر نکل آئے۔ جگہ جگہ غیر بنگالیوں کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جانے لگا، ان بھائیوں اور دوستوں کو جو برسوں سے ساتھ رہتے آئے تھے بیدردی سے قتل کیا گیا، عورتوں کی عصمت دری اور معصوم بچوں کی ہلاکت نے 1947ء کے فسادات کی یاد تازہ کر دی۔

مغربی پاکستان میں ان حالات کا ردِعمل غم وغصہ کی صورت میں ہوا۔ اور فوج جس میں اکثریت پنجاب کے لوگوں کی تھی حرکت میں آ گئی۔ مشرقی پاکستان میں 23 مارچ کو یومِ پاکستان کے بجائے یومِ مزاحمت منایا گیا۔ بنگلہ دیش کے سپاہی ''مکتی باہنی'' کے نام سے جنرل عثمانی کی قیادت میں افواجِ پاکستان کے مدِمقابل آ گئے۔

اسی دن صدر پاکستان نے شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری کا حکم صادر فرمایا۔ ان کو باغی قرار دیا گیا اور پاکستان کی مسلح افواج کو بغاوت کی بیخ کنی کے احکامات جاری کئے۔ فوج نے جنرل ٹکا خان کی قیادت میں "آرمی ایکشن" کا آغاز کر دیا۔

یوں قتل و غارت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ سارے صوبے میں پھیل گیا۔ فوجی ایکشن کی آڑ میں غیر بنگالیوں نے بھی کھل کر اس معرکہ میں حصّہ لیا اور وہ سارا حساب چکا دیا جو کچھ عرصہ پہلے بنگالیوں نے سفاکی اور بربریت کی صورت میں ان سے رَوا رکھا تھا۔ جنرل ٹکا جنہیں بنگالی عوام آج تک "بوچر" کے نام سے یاد کرتے ہیں پاکستانی افواج کے کمانڈر تھے۔ اس فوجی اقدام کی ساری دنیا میں بڑے پیمانے پر مذمت کی گئی۔

یوں قتلِ عام کا میلہ سج گیا۔ اس موقع پر فیض صاحب نے اس نظم کی صورت میں سخت احتجاج کیا اور قوم کو مشرقی پاکستان کی طرف سے یہ لرزہ خیز پیغام دیا۔

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہر ہلاہل بھرا ہے نس نس میں
جسے بھی چھید و ہر اک بوند قہر افعی ہے
ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مُہر بہ لب غیظ و غم کی گرمی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو سمن مری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

☆......☆......☆

تہ بہ تہ دل کی کدورت

یہ مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کے بعد فیض صاحب کی دوسری نظم تھی۔ مارچ کے مہینے میں جب جنرل یحیٰی خان کے حکم سے جنرل ٹکا خان نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا آغاز کیا اور صوبے کے شہروں، بستیوں اور قصبوں کے کوچہ و بازار اور گلیوں میں معصوموں کا لہو پانی کی طرح بہنے لگا تو فیض صاحب تلملا اُٹھے ان کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ یہ نظم اپریل 1971ء میں انہوں نے اسی موضوع پر لکھی۔

فیض صاحب کو مشرقی پاکستان سے خاص محبت تھی۔ وہ حالات کی اس ابتری سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کے ایک دوست نے بڑے خوبصورت الفاظ میں ان کی ذہنی کیفیت کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے۔ ''جب بادِ سموم کے طوفان میں ملک گھرا ہو۔ جب دستِ قاتل بے خطر جس رخ چاہے قتلِ عام کا میلہ سجالے۔ جب گرد آلود آنکھوں کو دھونے کے لئے لہو کی ضرورت ہو۔ جب چارہ گروں کے دل میں بجز کدورت کچھ نہ ہو۔ جب خورشید کا کندن، مہتاب کی چاندنی، صبحوں کا ہنسنا، راتوں کا رونا سب لہو ہو جائے، جب ہر شجر مینارہ خوں اور ہر پھول خونیں دیدہ ہو جائے۔ تو پھر دردمند فیض اس سیلاب و غضب کو کیسے روک سکتا ہے۔''

فیض صاحب نے خود اس زمانے میں کہی گئی ان دو تین نظموں کے بارے میں کہا تھا "مشرقی پاکستان میں نفرت کا سیلاب امنڈ پڑا ہے جو کل تک دوست آشنا تھے وہ اغیار ہو چکے ہیں۔ جو کل تک آپس میں بھائی تھے وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔''

ان حالات اور واقعات پر قابو پانے کے لئے جس حقیقی قوت کی ضرورت تھی وہ مفقود تھی۔ ڈھاکہ میں فیض صاحب کے کئی قریبی احباب موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے تھے۔ ان کے بنگالی دوستوں میں شہید اللہ قیصر، منیر چودھری، ظہور حسین چودھری، پروفیسر کبیر اور بہت سے دوسرے شامل تھے۔ ان میں سے کچھ دانشور، ادیب، شاعر گرفتار کئے گئے۔ کچھ مارے گئے۔ فیض صاحب کہتے تھے'' مجھے زندگی میں اس واقعہ سے بڑھ کر صدمہ نہیں ہوا۔'' وہ اپنے یار آشنا اور احباب سے دور ان کے لئے بلکتے رہے۔ پکارتے رہے۔

تہ بہ تہ دل کی کدورت
میری آنکھوں میں امنڈ آئی تو کچھ چارہ نہ تھا
چارہ گر کی مان لی
اور میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھولیا
میں نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھولیا
اوراب ہر شکل وصورت
عالمِ موجود کی ہر ایک شے
میری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم رنگ ہے
خورشید کا کندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو
ہر شجر مینارِ خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے
ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ
جذبۂ شوقِ شہادت، درد، غیظ وغم کا رنگ
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت کا، شب کا، موت کا،
ہر رنگ کے ماتم کا رنگ
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلاب اشک
آبِ وضو
جس میں دھل جائیں تو شاید دھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

☆......☆......☆

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن اور بے گناہ اور معصوم شہریوں کے قتل عام نے فیض کو صاحب قلبی اور ذہنی طور پر بے حد متاثر کیا۔ انہوں نے اس المناک واقعہ پر کُل سات نظمیں لکھی ہیں۔ چار 1971ء کی جنگ سے پہلے اور تین بنگلہ دیش کے وجود میں آجانے کے بعد۔۔ ہر دو صورتوں میں انہوں نے جن جذبات اور تاثرات کا اظہار کیا ان میں غم واندوہ اور عوام سے کئے جانے والے ناروا سلوک کا اظہار ہے۔ فرق ان دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ جنگ سے پہلے جب مشرقی پاکستان ملک کا ایک حصہ تھا۔ فیض صاحب نے بڑی خفگی اور ناگواری کے ساتھ اہلِ اقتدار کو وہ سب کچھ کرنے سے روکنے کی کوشش کی جو وہ کر رہے تھے۔ دسمبر 1971ء کے بعد جب پاکستان آدھا رہ گیا اور شکست خوردہ قوم کو سہاروں اور امیدوں کی ضرورت تھی تو فیض صاحب کے اشعار کی وہ تلخی بھی کم ہوگئی۔ انہوں نے دونوں ملکوں کو جواب آزاد اور خود مختار تھے، امن وآشتی کا پیغام دینا شروع کیا اور یہ تلقین کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا اب خون کے دھبے دھونے کا وقت ہے۔

زیرِ نظر نظم پہلے دور یعنی قبل از جنگ سے تعلق رکھتی ہے کہ جب مشرقی پاکستان کے صوبے میں بسنے والے بنگالی پاکستانی شہری تھے۔ یہ ایک بڑی درد انگیز نظم ہے جس میں پُر زور الفاظ میں فیض صاحب یہ تلقین کر رہے ہیں کہ قتل وغارت گری بند کرو اور مظلوموں پر رحم کرو۔

مشرقی پاکستان کے المیہ پر امر جلیل نے بہت ہی دلسوزی کے ساتھ انگریزی زبان میں ایک کالم لکھا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا خلاصہ یہاں پیش کروں۔ مگر اس سے بھی پہلے یہ چند مصرعے جو فیض صاحب نے اس زمانے میں لکھے۔ ان کے دل پر گزرنے والی واردات کی ان پانچ مصرعوں میں مکمل عکاسی ہوتی ہے۔

یار اغیار ہو گئے ہیں
اور اغیار مصر ہیں کہ وہ سب
یار غار ہو گئے ہیں

اب کوئی ندیم باصفا نہیں ہے
سب رند شراب خوار ہو گئے ہیں

اوراب امر جلیل کی تحریر مگر اس کی تلخی کونظرانداز کر دیجئے گا۔

''دسمبر 1971ء کا مہینہ مجھے ان دوستوں اور چاہنے والوں کی یاد دلاتا ہے جو مشرقی پاکستان میں تھے اور جو مجھ سے جدا ہوگئے۔ میری نسل اس بات کی گواہ ہے کہ یہ کھیل مغربی پاکستان کے سیاست دانوں نے سویلین اور فوجی دور میں کھیلا اور بالآخر بنگال کے لوگ اس سے تنگ آ کر علیحدگی پر مجبور ہو گئے۔ ہمارے سیاست دانوں کا اس سے یقیناً ذاتی مفاد وابستہ تھا۔ لیکن ان کو پاکستان کے ٹوٹنے اور مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہونے میں کیا فائدہ نظر آیا؟۔

یہ ایک اہم سوال ہے جو یقیناً ان نوجوانوں کے ذہنوں میں بار بار اٹھے گا جو 1958ء کے بعد پیدا ہوئے۔ یہی وہ سال تھا جب پہلی بار ملک میں ملٹری کی حکومت آئی اور ٹھیک دس سال بعد ایک بار پھر مارشل لا لگایا گیا۔ حکومت کی باگ ڈور ایک جنرل سے دوسرے جنرل کو منتقل کر دی۔ ایوب خاں کے بعد یحیٰ خان ملک کے حکمران بن گئے۔ 1971ء میں پاکستان ٹوٹ گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔

اس وقت ایک بارہ تیرہ سال کے بچے سے ان پیچیدہ سوالوں کے صحیح جوابات کی توقع رکھنا فضول ہے۔ یہ بچے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمے دار انڈیا کو ٹھہرائیں گے۔ یہی بات اب ہماری تاریخ کا حصہ ہے اور یہی بات 1971ء سے اب تک آنے والی نسلوں کو بتائی جاتی رہی ہے۔ لیکن جس طرح ایک رات میں قد آور درخت نہیں بن جاتے۔ اسی طرح 1971ء میں پکنے والی علیحدگی کی فصل کے بیج 1948ء میں بوئے گئے تھے۔

مشرقی پاکستان جغرافیائی طور پر مغربی پاکستان سے ہزار میل دور تھا اور آزادی کے وقت اس کی آبادی ساڑھے چار کروڑ بنگالیوں پر مشتمل تھی۔ جبکہ مغربی پاکستان میں رہنے والے تین کروڑ نفوس تھے۔ مرکزی حکومت میں گنتی کے چند بنگالی افسران تھے جو دونوں حصوں میں مساوات پیدا کرنے میں بری طرح ناکام رہے۔

حد تو یہ ہے کہ وفاقی حکومت کا رویہ مشرقی بنگال میں رہنے والے دانشوروں اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ بھی بڑا ناروا تھا۔ مشرقی بنگال کے لوگ زندگی کے ہر پہلو کو شائستہ، نفیس اور سلجھے ہوئے طریقے سے ناپنے تولنے کے عادی تھے۔ اور ان کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے سردار، چودھری اور ملک تھے۔ چنانچہ نیشنل اسمبلی میں ایک طرف تو پروفیسر اور آرٹسٹ تھے اور دوسری جانب جاگیردار اور وڈیرے۔

بنگالی آبادی کو دبانے کے لئے حکمرانوں نے بے دردی سے غیر ضروری طاقت کا استعمال کیا اور بالآخر طاقت کا جواب طاقت سے دیا گیا۔ انڈیا کو اس جنگ میں کودنے کا بہترین موقعہ مل گیا اور اس طرح مسلم لیگ نے اپنا ہی بنایا ہوا ملک چوبیس سال کے اندر توڑنے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اب تو اس سانحہ کو زمانہ بیت گیا مگر جنہوں نے ہم وطنوں کی حیثیت سے تقریباً 25 برس ساتھ زندگی

بسر کی ہوان کے لئے یہ زخم آج بھی تازہ ہیں۔"

یہ نظم فیض صاحب نے 1971ء کے آرمی ایکشن کے زمانے میں لکھی تھی۔

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آلگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیِ صہبا کو تہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

خُمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر برلبِ ساحل ٹھہر جائے

نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئنہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

☆......☆......☆

رفیقِ راہ تھی منزل

وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مشرقی پاکستان کے المیہ کو ابھی دو چار روز ہی ہوئے تھے۔ دسمبر کی سرد شام تھی۔ جب راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں فیض صاحب مجھے ملے۔ ملک کے دولخت ہو جانے اور جنگ میں شکست کے بعد پاکستان کے رہنے والوں کی کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ہر شخص دل گرفتہ تھا اور ہر ایک کے چہرے پر رنج والم کے گہرے تاثرات تھے۔

بھٹو صاحب زمام حکومت سنبھال چکے تھے اور ان دنوں اپنے پسندیدہ لوگوں کو مناسب اور اہم عہدے تقسیم کرنے میں مصروف تھے۔ راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے ہر کمرے میں میرا کوئی نہ کوئی جاننے والا ٹھہرا ہوا تھا جو نئی حکومت میں کسی عہدے کا امیدوار تھا۔ میں اداس اور دل برداشتہ روزانہ ٹیلی وژن اسٹیشن سے نکل کر ہوٹل چلا جاتا تا کہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ مل کر غم غلط کر سکوں۔ ایک شام فیض صاحب مجھے ہوٹل کے کاری ڈور میں مل گے۔ پوچھنے لگے ''کس سے ملنے آئے ہو؟'' میں نے جواب دیا ''جو بھی مل جائے۔ آجکل اس ہوٹل کے ہر کمرے میں کوئی نہ کوئی جاننے والا ٹھہرا ہوا ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے'' فیض صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ''آج ہماری باری سہی'' میں ان کی بات سن کر بے حد خوش ہو گیا اور کہا ''چلئے پھر آپ کے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں'' مگر وہ کسی اور ہی موڈ میں تھے بولے ''نہیں ہمیں راولپنڈی کلب جانا ہے وہاں کوئی ہمیں ملنے آ رہا ہے۔''

میں نے کہا ''تو پھر ذرا انتظار کیجیے۔ میں نے گاڑی واپس بھیج دی ہے فون کر کے منگالوں'' کہنے لگے ''گاڑی واڑی چھوڑو۔ کلب یہاں سے قریب ہی تو ہے پیدل چلتے ہیں۔''

ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ جنگ کے زمانے میں شروع ہونے والے بلیک آوٹ کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہم اس نیم تاریکی میں مال روڈ کے فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔ فیض صاحب بڑے پژمردہ تھے۔ انہیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور جنگ میں شکست کا بے حد صدمہ تھا۔ اس شام ان پر ایک عجب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ چلتے ہوئے بار بار اپنی ایک پرانی نظم کے مصرعے دہرا رہے تھے۔

مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر خانماں خراب کی خیر

وہ مدھم آواز میں یہ بھی کہہ رہے تھے ''بھئی ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہم نے برسوں پہلے جو لکھا تھا اس طرح حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔''

وہ تمام راستے اپنے یہ شعر بڑے تواتر کے ساتھ دہراتے رہے۔ کلب پہنچ کر میں نے اُنہیں ایک گوشے میں چھوڑا اور خود ان کے دوست کو تلاش کرنے کلب کے دوسرے حصہ کی طرف چلا گیا۔ جب میں واپس آیا تو میں نے دیکھا فیض صاحب ایک کاغذ پر پنسل سے کچھ لکھ رہے ہیں۔ غالباً سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد یہ قطعہ ان کی پہلی تخلیق ہے۔

رفیقِ راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چُھٹا یہ ساتھ تو رہ کی تلاش بھی نہ رہی
ملُول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہُوا اِک خراش بھی نہ رہی

☆......☆......☆

پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو

سقوطِ مشرقی پاکستان بلاشبہ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مُلک دولخت ہوگیا، ہماری بہادر افواج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا، نوے ہزار سپاہی قیدی بن کر ہندوستان کے جیل خانوں میں پہنچا دیے گئے۔ اس جنگ سے قبل فیض صاحب فوجی کارروائی روکنے کے لئے اربابِ اقتدار سے درخواست کرتے رہے کہ اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں پر رحم کریں، مگر کچھ نہ ہوسکا اور آخر کار ہمیں ساری دنیا کے سامنے شرمساری کا سامنا کرنا پڑا۔

جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ فیض صاحب کے نزدیک اب بخیہ گری کا وقت تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ اگرچہ یہ بچھڑے دو بھائی اب ایک تو نہیں ہو سکتے مگر کوئی ایسی صورت یقیناً نکالی جاسکتی ہے کہ یہ دو آزاد برادر ملکوں کی طرح امن اور آشتی کے ساتھ رہ سکیں۔ برسوں کا ساتھ اگرچہ ٹوٹ چکا تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ یہ تو ممکن تھا کہ پرانے شکوے شکایات کو نظر انداز کر کے ان سخت گیر اور تکلیف دہ یادوں کو بھلا دیا جائے جو اس المناک سانحہ کا باعث بنی تھیں۔ ان دنوں وہ اپنی عام گفتگو میں بھی اس بات کو بار بار دہراتے رہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمان اور ذوالفقار علی بھٹو دونوں کو بردباری اور حُب الوطنی کا ثبوت دینا چاہیے اور دونوں ملکوں کے درمیان درپیش سارے مسائل کا حل گفت وشنید کے ذریعہ نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ فیض صاحب ایک امن پسند اور قوم پرست انسان کی حیثیت سے اس کا پرچار کرتے رہتے تھے۔ بھٹو صاحب نے ان کو پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹ کا سربراہ مقرّر کر دیا تھا لہٰذا اُن کو ایسے مواقع وافر تعداد میں ملتے رہتے تھے کہ وہ اہم ملکی اور غیر ملکی شخصیتوں کو اپنا نقطۂ نظر سمجھا سکیں۔

اداسی کے اثرات جو 1971ء کے حالات نے ان کی شخصیت پر ڈالے تھے ابھی تک برقرار تھے اور ان کی شاعری میں بھی اس کے بڑے واضح اشارے نظر آتے ہیں خاص طور پر ان کی یہ نظم جس میں اُنہوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ دونوں ملکوں کے سیاستدانوں، فوجی کمانڈروں، ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور عام آدمیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جنگ سے پہلے "قتلِ عام کے میلے" کو تو نہ روک سکے مگر اب لہو کے ان دھبوں کو دھونے کا وقت ہے

ان کا خیال تھا صدیوں کے یارانے اور زمانوں کی محبتیں اس طرح بھلائی نہیں جانی چاہئیں۔

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
اُن رشتوں کے جو چھوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اِک اِک کر کے ٹوٹ گئے
جس راہ چلے، جس سَمت گئے
یوں پاؤں لہولہان ہُوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی رِیت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے
وہ کہتے تھے، کیوں قحطِ وفا
کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو!
یہ راہیں جب اَٹ جائیں گی
سو رستے اِن سے پُھوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

☆......☆......☆

ڈھاکہ سے واپسی پر

1972ء میں بچے کھچے پاکستان کی نئی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد فیض صاحب کو جو فکر دامن گیر تھی وہ بنگلہ دیش سے تعلقات اُستوار کرنے کا معاملہ تھا۔ جنگ ہو چکی تھی، پاکستان کی افواج نے ہتھیار ڈال دیے تھے، شیخ مجیب الرحمان کو بھٹو نے رہا کر کے بنگلہ دیش بھجوا دیا تھا جہاں وہ اس نئے ملک کے سربراہ بن چکے تھے۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا اب زخموں کی بخیہ گری کا وقت تھا اور بھٹو صاحب چاہتے تھے یہ کام جلدی سے مکمل ہو جائے۔ مگر اس میں ان گنت دشواریاں تھیں، مغربی پاکستان کے لوگوں نے ابھی تک آدھے ملک کے چلے جانے کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ایک بہت بڑی تعداد تو ایسے لوگوں کی بھی تھی جو بھٹو صاحب کو براہِ راست اس سانحہ کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ مگر بھٹو صاحب ارادے کے پکے تھے۔ وہ ساری مخالفتوں کے باوجود اپنی دھن میں لگے رہے۔ اُنہوں نے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قوم پر جو قیامت گزرنی تھی وہ گزر چکی۔ اب اس کا ماتم کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم حقیقت کو تسلیم کر لیں۔ انہوں نے عوامی جلسوں میں ریڈیو ٹیلی وژن اور اخبارات کے ذریعہ اور منتخب اسمبلیوں کے اندر زور وشور سے یہ مہم چلائی اور بالآخر مسلسل جدوجہد کے بعد وہ وقت آ گیا جب پاکستان نے حکومتی سطح پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ ملک دولخت ہو چکا ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے بھائی کو گلے لگانے ہی میں مصلحت ہے۔ اُنہیں یہ موقع 1974ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر نصیب ہوا، جب شیخ مجیب الرحمان ایک آزاد اور خود مختار بنگلہ دیش کے سربراہ کی حیثیت سے اس میں شرکت کرنے پاکستان آئے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بھٹو صاحب معافی تلافی کے لیے خود ایک بڑا وفد لے کر بنگلہ دیش گئے۔ اس وفد میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ عام افواہ یہ تھی کہ وہ فیض صاحب کو بنگلہ دیش میں پاکستان کا پہلا سفیر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ فیض صاحب کے شیخ مجیب الرحمان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ اُن دنوں سے شیخ صاحب کو جانتے تھے جب وہ ہارون خاندان کی انشورنس کمپنی میں ملازم تھے۔ شیخ مجیب الرحمان فیض سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اسی لئے بھٹو صاحب اس وفد میں ان کو ہمراہ لے گئے تھے، مگر وہاں کوئی پیش رفت ہی نہ ہو سکی اور پاکستانی وفد بے نیل و مرام واپس آ گیا۔ ڈھاکہ سے واپسی پر فیض صاحب بہت مغموم اور مایوس تھے۔ اُنہوں نے اپنے ایک دوست کو بڑے دُکھ کے ساتھ جو وہاں گزری تھی اس طرح بیان کی۔

''ہم تو سوچ کر گئے تھے خوب گھومیں گے اور اپنے دوست احباب سے ملیں گے کچھ اُن کی سُنیں گے کچھ اپنی سُنائیں گے، گلہ گزاریاں ہوں گی اور دوستی از سرِ نو اُستوار کریں گے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہم جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے۔ کسی سے ملاقات تک نہ ہو سکی۔ صرف آخری دن شیخ مجیب الرحمان سے مختصر ملاقات ہوئی۔''

وفد میں شامل ایک اور ممبر نے بتایا کہ آخری دن بھٹو صاحب نے شیخ مجیب الرحمان کے اعزاز میں اپنے ہوٹل میں جوابی دعوت دی تھی۔ اس موقع پر شیخ صاحب سے ملاقات کے لئے وفد کے سارے ارکان استقبالیہ قطار میں کھڑے تھے۔ جب شیخ صاحب آئے اور وفد کے ممبران سے ان کا تعارف کرایا جانے لگا تو اچانک اُن کی نظر فیض صاحب پر پڑی۔ وہ آٹھویں یا دسویں نمبر پر کھڑے تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی شیخ مجیب نے پروٹوکول وغیرہ سب چھوڑ دیا اور لپک کر اُن کے پاس آئے بغل گیر ہوئے۔ اُنہوں نے کہا'' فیض بھائی! آپ بھی آئے ہوئے ہو، ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' اسی موقع پر مختصر گفتگو کے دوران انہوں نے فیض صاحب سے یہ فرمائش کی کہ ہمارے لیے بھی کچھ لکھیں۔ فیض صاحب نے وعدہ کیا کہ ضرور لکھیں گے۔

ڈھاکہ سے واپس آتے ہوئے ہوائی جہاز میں فیض صاحب نے یہ نظم لکھی اور غالباً شیخ مجیب کی فرمائش پوری کرتے ہوئے بذریعہ ڈاک ان کو بھجوا بھی دی۔

اس نظم کو سیاسی اعتبار سے تو خاص اہمیت حاصل ہے ہی مگر ادبی نقطہ نگاہ سے بھی اس کا مقام بہت بلند ہے۔ ہندوستان کے معروف اُردو نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ہنگامی شاعری کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا اثر بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے۔ وطنی قومی شاعری کا ایک حصہ طاقِ نسیاں کی نذر اس لیے ہو جاتا ہے کہ وقت کی دیمک رفتہ رفتہ اسے چاٹ لیتی ہے۔ مگر فیض صاحب کی اس نظم پر یہ بات صادق نہیں آتی۔''

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
اُن سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

☆......☆......☆

محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں

عشقیہ منظومات

مچل رہا ہے رگ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

- مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
- رقیب سے
- مرگِ سوزِ محبت
- موضوعِ سخن
- کب تک دل کی خیر منائیں
- دو عشق
- کوئی عاشق کسی محبوبہ سے
- تجھے پکارا ہے بے ارادہ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

1935ء میں فیض صاحب لاہور کو الوداع کہہ کر امرتسر آ گئے۔ انہیں وہاں ایم اے او کالج میں لیکچرار شپ مل گئی تھی۔ لاہور کو چھوڑنا فیض صاحب کے لیے کوئی ایسی خوشگوار بات نہیں تھی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں انہوں نے عنفوانِ شباب کا زمانہ گزارا تھا۔ یہاں ان کو بڑے قابل قدر اساتذہ اور محبت کرنے والے دوست ملے۔ ان دوستوں میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے آنے والے زمانے میں بڑا نام پیدا کیا اور زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑے لوگ کہلائے۔ اپنے ہم جماعت طالب علموں کے علاوہ فیض صاحب کو اپنے اساتذہ سے بھی خاص نسبت رہی اور ان کی صحبت میں انہوں نے وہ کچھ حاصل کیا جو آنے والے زمانوں میں ان کا قیمتی اثاثہ ثابت ہوا۔ ان علم و دانش کے جگمگاتے ستاروں میں پروفیسر ڈکسن، پروفیسر ہریش چند کٹاپالیا، پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر اور صوفی تبسم صرف چند نام ہیں۔ ان مشاہیر کے علاوہ ادبی حلقوں میں جو لوگ اس وقت لاہور میں موجود تھے اور جن سے فیض صاحب نے ہر طرح کا کسب فیض کیا ان میں مولانا چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، عبدالرحمٰن چغتائی، غلام رسول مہر، امتیاز علی تاج اور حفیظ جالندھری وغیرہ شامل تھے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ لاہور ہی وہ شہر تھا جہاں وہ اٹھارہ سال کی عمر میں شدید قسم کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ اس پہلی محبت نے انہیں دیوانہ بنا دیا تھا۔

یہ بھری محفل چھوڑ کر فیض صاحب جب لاہور سے امرتسر آئے تو ظاہر ہے ان کو ملول اور دل گرفتہ تو ہونا ہی تھا، سو وہ ہوئے۔ فیض صاحب نے شعر گوئی کا آغاز جس ادبی فضا میں کیا تھا اس کا تعلق رومان پسندی سے تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری پر اختر شیرانی اور حسرت موہانی کی حکمرانی تھی۔ سارے ملک کے ادبی ماحول میں رومانیت کی لہر رواں دواں تھی۔ یہ جمالیات کی حکمرانی اور ادب برائے ادب کا زمانہ تھا۔

یہ تھے وہ حالات جب ہمارا نوجوان شاعر، روشنیوں، خوشبوؤں اور محبتوں کے شہر کو چھوڑ کر امرتسر آیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اُن دنوں عشق نے مکمل طور پر ان کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور وہ "کل وقتی" عاشقی میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے عشق و محبت کے موضوعات پر جیسی معرکۃ الآرا شاعری کی وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔

یہ ساری شاعری "نقشِ فریادی" میں شامل ہے جو فیض صاحب کا پہلا مجموعہ تھا۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

------x----x----x---x------

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

------x----x----x---x------

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تیری رہگزر میں ہے

****

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

****

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حُسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

یہ رومانوی تاثر صرف غزلوں تک محدود نہیں ہے۔ فیض صاحب کے اس زمانے کی اور نظمیں بھی اتنی ہی خوبصورت اور سحر انگیز ہیں۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

ان نظموں میں، خداوہ وقت نہ لائے، سرودِ شبانہ، آخری خط، حسینۂ خیال سے، یاس، رقیب سے، مرگِ سوزِ محبت وغیرہ شامل ہیں جن کا پہلا شعر سن کر ہی پوری نظم یاد آجاتی ہے۔

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حسن معصوم خواب ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب
آ کہ کچھ دل کی سن سنالیں ہم
آ محبت کے گیت گالیں ہم

اور ایک بہت ہی اثر انگیز نظم کا یہ ٹکڑا

مجھے دے دے

رسیلے ہونٹ معصومانہ پیشانی حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر اک جاودانی سی نظر دے دے

اور ایک اور دلکش نظم

مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھکو
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
ترے جلووں سے بزمِ زندگی جنت بداماں ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

مبادہ یاد ہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موج ہائے غم میں کھو جائیں

مبادہ اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

اور یہ چھوٹا سا اقتباس۔فیض صاحب کی بہت ہی مقبول نظم سے

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجوم شوق سے اک دل ہے بیقرار ابھی

خمار خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں

دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگ نیاز پیدا ہے

اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں

تہِ نجوم کہیں چاندنی دامن ہے میں
کسی کا حسن ہے مصروفِ انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

یہ سارے اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ فیض صاحب ان دنوں سرتا پا رومانس میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کی شاعری صرف کیف و مستی کی شاعری تھی۔

پھر ایک معجزہ ہوا

امرتسر میں ان کی ملاقات ایک دانشور جوڑے سے ہوئی۔ ان کے نام تھے صاحبزادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں۔ صاحبزادہ صاحب ایم اے او کالج کے وائس پرنسپل تھے اور ان کی بیگم پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھیں۔ صاحبزادہ صاحب نئے نئے انگلستان سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے اور ان کی بیوی لکھنؤ سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ دونوں میاں بیوی مارکسسٹ تھے۔ ان دنوں یورپ میں ترقی پسند تحریک اُبھرنا شروع ہو گئی تھی۔

ادھر فیض صاحب کا یہ عاشقی کا زمانہ تھا۔فیض صاحب کا ان دونوں سے رابطہ ہوا اور پھر یہ تعلق قربت اور چاہت میں بدل گیا۔ڈاکٹر رشید جہاں فیض صاحب سے ملاقات کے بعد ان کا 'اصل مرض' جان گئیں اور انہوں نے نوجوان فیض کو سمجھایا کہ "تم عشق

اور عاشقی کے چکر میں پڑے ہو۔ یہ سب فضول بات ہے۔ دنیا کے جو دکھ ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ عاشقی کا یہ تمہارا چھوٹا سا معاملہ ہے۔"

بقول فیض صاحب ڈاکٹر رشید جہاں نے ان کو سکھایا کہ اپنا جو ذاتی غم ہے یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو محض اپنی ذات کے لیے سوچنا خود غرضی ہے۔

انہوں نے فیض صاحب کو کمیونسٹ پارٹی کا منشور بھی دیا جسے پڑھ کر ان کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ یوں یہ واقعہ ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ بن گیا۔ اس وقت سے ان کی شاعری اور ان کا ذہنی رجحان بدل گیا۔ وہ غریبوں، مفلسوں، ضرورت مندوں، مجبور اور مفلوک الحال عوام کے شاعر بن گئے۔

اپنے ان جذبات کے اظہار کے لیے یہ ان کی پہلی نظم تھی۔ اس کو ان کی شاعری کا اہم ترین سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔

"مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"

یہ ایک اُبھرتے ہوئے عظیم شاعر کا اعلان تھا کہ اب اس کے شعر اور اس کے خیال قوم کی امانت ہیں۔ یوں فیض ایک عظیم انقلابی شاعر بن گئے مگر دوسرے انقلابیوں سے ذرا مختلف۔ انہوں نے ایک نیا اسلوب اور ایک نئی طرز ادا اختیار کی۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہُوئے
جا بجا بکتے ہُوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہُوئے خون میں نہلائے ہُوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

فیض صاحب کی یہ نظم شاید گلوکاروں نے سب سے زیادہ گائی ہے۔ سب سے زیادہ شہرت اس نظم نے ملکہ ترنم نور جہاں کی وجہ سے حاصل کی۔ فیض صاحب کہا کرتے تھے۔ ''بھئی اب یہ نظم ہماری نہیں ہے۔ ہم نے تو یہ مادام نور جہاں کو دے دی ہے۔''

رقیب سے

1941ء میں ''نقش فریادی'' کی اشاعت کے ساتھ جب فیض صاحب کی یہ نظم منظر عام پر آئی تو دنیائے ادب میں جیسے تہلکہ مچ گیا۔

رقیب کا کردار اُردو اور فارسی شاعری میں ہمیشہ سے موجود تھا اور شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ایسا ہو جس کی شاعری میں اس کا تذکرہ نہ ہو۔ مگر رقیب کا جو تصور فیض صاحب نے اپنی اس نظم میں دیا وہ بالکل انوکھا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق حسین نے "ولے بفرد ختم جائے فریدم" کے ساتھ آغاز ہونے والے فیض صاحب کی شاعری کے اس دور کے بارے میں لکھا ہے "فیض کی شاعری نظری سیاست کی اخلاقی قدروں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ اسی جذبے نے فیض کو رقیب سے گفتگو کرنے کا ایک نیا انداز اور محبوب کو ڈھارس دینے کے ایک نئے سلیقے سے روشناس کرایا۔ اُن کے سیاسی شعور کی پختگی اور آنے والے کل کے تصور نے فیض کو یہ لہجہ عطا کیا کہ وہ ظلم کی چھاؤں میں دم لینے اور جنبش لب پر تقدیروں کی قدغن کے باوجود جرأت اور بانکپن کے ساتھ یہ کہہ سکیں

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں''

خیر یہ تو دانشورانہ تبصرہ ہوا۔ میں نے جو جو کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اُس کا مقصد فیض صاحب کی معروف نظموں کی شانِ نزول معلوم کرنا ہے۔ اس نظم کے سلسلہ میں کچھ مدد مجھے امرتا پریتم کے ساتھ فیض صاحب کی گفتگو سے ملی جس کے دوران فیض صاحب نے بڑی بے تکلفی سے امرتا پریتم سے کہا تھا ''لے ہن تینوں دساں میں پہلا عشق اٹھارہ وریاں دی عمر وچ کیتا سی۔''

''لیکن اسے زندگی میں حاصل کیوں نہ کیا؟''

''ہمت کب ہوتی تھی اس وقت زبان کھولنے کی پھر اس کا بیاہ کسی ڈوگرے جاگیردار کے ساتھ ہوگیا۔''

''ایک تمہاری نظم ہے جس میں تم رقیب سے مخاطب ہو۔''

امرتا پریتم نے دریافت کیا کہ یہ نظم کس کے بارے میں ہے تو فیض صاحب نے جواب دیا یہ بھی اُسی کے بارے میں ہے۔ یہ فیض صاحب کا پہلا عشق تھا۔ اُن کی محبوبہ کا تعلق ایک افغان گھرانے سے تھا۔ یہ نوعمر لڑکی سیالکوٹ میں اُن کے ہمسائے میں

رہتی تھی اور فیض صاحب کمرے کی کھڑکی سے اس کو آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔ چونکہ طبعاً بہت شرمیلے تھے اس لئے بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ یہ باتیں خود فیض صاحب نے زہرہ نگاہ کو بتائیں جن سے اُن کے بڑے قریبی روابط تھے۔ زہرہ آپا نے مجھ سے کہا ''فیض صاحب اُس لڑکی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی اس دیوانگی میں اس کے لئے خوبصورت شعروں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ان کا عشق اپنے شباب پر تھا جب تعلیم کے لئے انہیں سیالکوٹ سے لاہور جانا پڑا۔''

فیض صاحب نے بتایا'' پھر ہوا یوں کہ ہم ایک بار چھٹیوں میں لاہور سے واپس آئے تو کھلی کھڑکی کے دوسری جانب وہ چہرہ نظر نہ آیا۔ ہم نے کسی سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ اس کی شادی ہوگئی ہے'' فیض صاحب کے لئے یہ خبر بڑی اندوہناک تھی۔ وہ ٹوٹے دل سے واپس لاہور چلے گئے اور مدتوں اس غم کو بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔

پھر خاصہ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ایک بار پھر سیالکوٹ آئے تو اُن کی محبوبہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ فیض صاحب سے اپنے شوہر کو ملانے کے لیے لائی۔ اس کا شوہر بہت حسین وجمیل انسان تھا۔ دراز قد، شہابی رنگت، تیکھے خدوخال، مردانا وجاہت کا نمونہ۔ فیض صاحب سے مل کر وہ دونوں رخصت ہوگئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر واپس آئی، اس بار اکیلی تھی صرف یہ کہنے کے لئے ''تم نے دیکھا میرا شوہر کس قدر خوبصورت ہے۔''

فیض صاحب کہتے ہیں بس اس کا یہی فقرہ اس نظم کی تخلیق کا سبب بنا۔

آ کہ وابستہ ہیں اُس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

نظم کا پہلا حصہ یہاں ختم ہوجاتا ہے اور بعض کا تو یہ خیال ہے کہ نظم ہی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

☆......☆......☆

مرگِ سوزِ محبت

عشق ومحبت ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ نہ عام طور پر اسکا اظہار کیا جاتا ہے اور نہ اعلان خاص طور پر فیض صاحب جیسا انسان جو طبعاً بھی بے حد شرمیلہ ہو۔ وہ خود اپنے بارے میں کہتے تھے کہ وہ بڑے پرائیوٹ آدمی ہیں۔ جب تک بہت ہی ضروری نہ ہو اپنے کسی راز میں کسی کو شریک نہیں کرتے تھے چہ جائے کہ عشق کے معاملات۔ مگر یہ بات بھی خلاف فطرت ہے کہ کوئی آپکا راز داں ہی نہ ہو۔ کچھ دوست تو ہوتے ہیں جن سے انسان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہوتی۔ فیض صاحب کے ایسے ہی ایک دوست کا نام تھا شیر محمد حمید۔ یہ ان کے نوجوانی کے زمانے کے دوست تھے۔ کم عمری میں آغاز ہونے والی یہ دوستی عمر کی آخری منزلوں تک قایم رہی۔

اس دوستی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب فیض صاحب سیالکوٹ چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور وارد ہوئے اور اُنھوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو کالج کے ہوسٹل میں شیر محمد نے ان کو اپنی دوستی کے لئے منتخب کر لیا۔ شیر محمد نے لکھا ہے۔

"یہ 1929ء کی بات ہے۔ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تیسرے سال کا طالب علم تھا۔ چودھری نبی احمد اور آغا عبدالحمید میرے دوست تھے، ہم سب نیو ہاسٹل میں رہتے تھے۔ ہر شام ہم سیر کو نکلتے تو ایک نوجوان کو دیکھتے جو باہر جنگلے کے پاس تنہا کھڑا گردوپیش سے بے خبر کالج ٹاور کی سمت نظریں جمائے دور کہیں افق کی بلندیوں کو دیکھ رہا ہوتا تھا۔ اس کا سراپا دلکش اور محویت جاذب تو جہ تھی تین چار دن کے بعد نبی احمد کے ذوقِ جستجو نے ہمیں اس نوجوان سے ہم کلام ہونے پر آمادہ کر لیا۔ قریب جا کر نبی احمد نے پوچھا" آپ کون ہیں اور یوں گم سم تنہا کھڑے کیا دیکھا کرتے ہیں؟" نوجوان محویت کے عالم سے چونکا اور کہنے لگا" میرا نام فیض ہے، میں نے سیالکوٹ کالج سے ایف اے پاس کر کے یہاں تھرڈ ائیر میں داخلہ لیا ہے۔ یہاں میرا کوئی واقف آشنا نہیں ہے" نبی احمد نے معاً کہا" آیئے آج سے آپ ہمارے دوست ہیں۔ یہ شیر محمد ہیں۔ یہ آغا حمید ہیں۔ یہ بھی آپ کے ہم جماعت ہیں"۔ وہ دن اور آج کا دن۔ زندگی ہزاروں نشیب وفراز سے گزری لیکن فیض کی دوستی کا بندھن بدستور برقرار ہے اور یہ دوستی ہمارے لئے فخر وانبساط کا باعث ہے"

پھر جب فیض صاحب اپنی ایک ہم عمر خاتون کے عشق میں مبتلا ہوئے تو اس کے احوال اور حقایق سے ان کے یہی چند قریبی دوست واقف تھے۔ اس کا ذکر بھی شیر محمد حمید نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں" فیض کے اس معاشقہ کی عمر نو دس برس ہے۔ فیض امرتسر سے لاہور اس حُسن دلآویز کی طرف پلٹے مگر ناکام واپس لوٹے۔ ان دنوں وہ ہر پانچویں چھٹے دن مجھے خط بھیجتے

اوراپنے عشق کی ناکامی کاذکرکرتے آخرمیں اُنھوں نے "مرگِ سوزِ محبت" لکھ کر مجھے اپنی داستانِ عشق کے ختم ہوجانے کی خبردی۔اس دوران میں راہ محبت کے سب مراحل انھوں نے طے کیے۔مسرتوں کے فردوس آباد ہوئے تو نسیم بہار اٹھلائی اور مسموم خزاں کی لپٹوں کا بھی گزر ہوا۔آرزوؤں کے شیش محل تعمیر کیے تو امیدوں کے چراغ بھی جلائے اور حسرتوں کا دھواں بھی اُٹھا۔محبوب کے عنبریں گیسوں سے کھیلے ہیں تو فراق کی جانکاہیاں بھی جھیلی ہیں۔کمال وضعداری یہ ہے کی سرور نشاط کے نشہ میں آپے سے باہر کبھی نہیں ہوے اور کرب وغم کی حالت میں فریادوفغاں کبھی نہیں کی۔"نقشِ فریادی" کی ابتدائی نظمیں اسی حشر ساماں دور کی پیداوار ہیں۔"

اس زمانے میں عشق، شاعری اور عالم شباب ان سب نے مل کر شاعر پر کچھ ایسی کیف ومستی طاری کی کہ اُنھیں کہیں کا ہوش نہ رہا اور وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گئے۔اس دور میں انھوں نے جیسے جیسے رومان پرور شعر کہے اور جس دلنشیں انداز میں حسن وجمال کی عکاسی کی وہ اردو شاعری کا اثاثہ ہے۔حسن وعشق کے عناصر پر مبنی اس شاعری نے انھیں اس دور کے سارے ہم عصروں میں ممتاز کردیا۔ نمونے کے طور پر ان مسحور کن نظموں میں سے صرف چند ہی جنوں خیزی کی اس کیفیت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

آ کہ کچھ دل کی سُن سُنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم
میری تنہائیوں پہ شام رہے
حسرت دید ناتمام رہے
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کرلیں ہم

—x—x—x—x—

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

---x-----x----x---x----

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
شاید میری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دل معصوم کو ناشاد کرو گی
آو گی میری گور پہ تم اشک بہانے
نو خیز بہاروں کے حسین پھول چڑھانے

—x—x—x—x—

مری جاں اب اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
تیرے جلوں سے بزمِ زندگی جنت بدامن ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تار نفس میں آرزو بیدار کرتی ہے
مبادہ یاد ہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موج ہائے غم میں کھو جائیں
مبادہ اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو

ایسے ہی اور بہت سے خوبصورت اشعار اور ابیات سے ان کی اس دور کی شاعری بھری پڑی ہے۔ ایک طویل عرصہ تک فیض صاحب پر یہ کیفیت طاری رہی۔ پھر کیف و مستی اور جنوں خیزی کا یہ دور اچانک ختم ہو گیا۔ اور جیسا کہ اِنکے دوست کا خیال ہے "سوز محبت" لکھ کر گویا اپنے عشق کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے

سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیِ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم
سُلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہُوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم
پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چُرائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سُنائیں ہم

☆......☆......☆

موضوعِ سخن

یہ لاجواب نظم فیض صاحب نے ایک لاجواب خاتون کے لئے لکھی تھی، جس کا نام ایلس تھا۔ حمید نسیم فیض صاحب کے لائق شاگرد، ان کی شاعری کے عاشق اور قریبی دوست تھے۔ انہوں نے لکھا ہے "فیض صاحب کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی طرح شیریں، نرم اور دل آویز ہے۔ کم بولتے ہیں مگر عجب بات یہ ہے کہ ان سے ملئے تو ان کی کم گوئی کے باوجود دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔"

ایسے شخص کے لئے شریک زندگی بھی ایسے ہی ہونی چاہیے تھی جو خاموشی کی زبان سمجھتی ہو۔ ایلس میں یہ خصوصیات تھیں لیکن فیض صاحب کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ وہ خاموشی کی زبان پر یقین رکھتے تھے۔ ان کی کم گوئی کے بارے میں کسی نے بڑا دلچسپ فقرہ لکھا ہے کہ "فیض صاحب ایک لفظ بھی زبان سے نکالے بغیر ساری شام گزار سکتے تھے۔"

ایلس کے والد مسٹر جارج کی لندن میں کتابوں کی دوکان تھی۔ وہ دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن کرس کی شادی ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر سے ہوئی تھی جو ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل تھے اور فیض صاحب کے بزرگ دوستوں میں سے تھے۔ ایلس کو ابتدائے زندگی ہی سے اشتراکیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ابھی سولہ برس کی تھیں کہ انہوں نے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کر لی۔ اس طرح وہ لندن کے بائیں بازو کے خیالات رکھنے والے دانشوروں کے حلقے کی ایک جانی پہچانی شخصیت بن گئیں۔ انہیں زمانہ طالب علمی سے ہی فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی اور سیاحت کی بھی دلدادہ تھیں۔ یہی شوق انہیں اپنی بہن کے پاس امرتسر لے آیا۔

حمید نسیم نے جو اُن دنوں تعلیم کے سلسلہ میں امرتسر میں مقیم تھے اور تاثیر صاحب کے ہاں ان کا آنا جانا تھا۔ ایلس لندن سے امرتسر آئیں تو ان سے تعارف کے لئے تاثیر صاحب نے کچھ لوگوں کو چائے پر بلایا۔ اس دعوت میں حمید نسیم بھی شریک تھے۔ انہوں نے لکھا ہے "مجھے ایلس بہت خوبصورت لگی۔ دراز قد، سرخ وسفید رنگ، جاذب نظر چہرہ، متناسب بدن۔ شام کو جب ہم واپس آرہے تھے تو راستے میں میں نے فیض صاحب سے ایلس کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگے اچھی لڑکی ہے۔ میں نے کہا آپ کی بیوی بن جائے تو کیسا ہو۔ فیض صاحب ہنس دیئے اور صرف اتنا کہا "تم تو پاگل ہو۔" پھر ہم سب لوگ ایلس سے گھل مل گئے۔ ایک شام ہم سب تاثیر صاحب کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایلس نیلے اطلس کی شلوار قمیض پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل لگا رکھا تھا اور کانوں میں بڑے نگوں والے آویزے سجا رکھے تھے۔" ایلس کی آمد کا یہی تاثر کچھ دنوں بعد ان کی نظم "موضوع سخن" میں کارفرما نظر آتا ہے۔
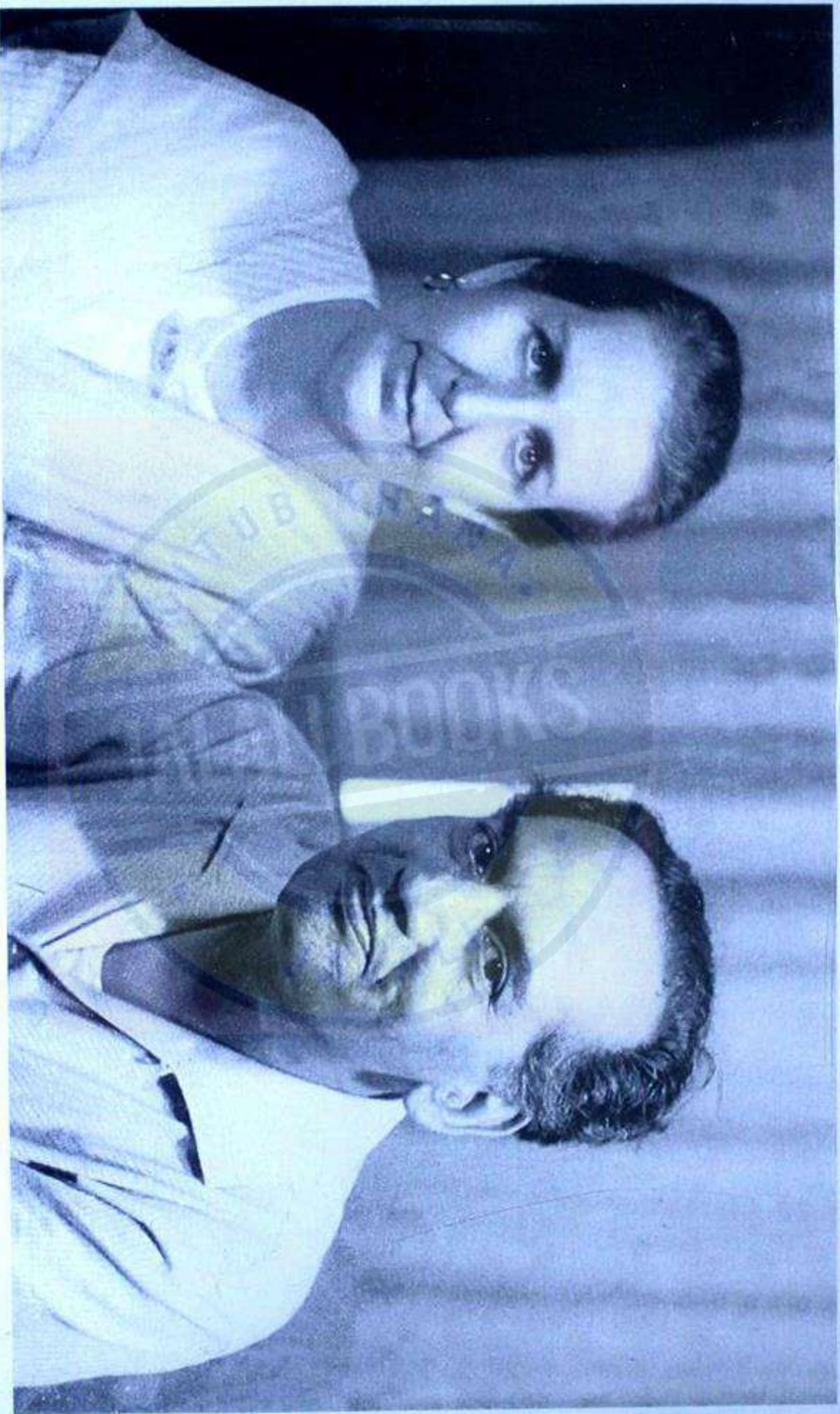
فیض صاحب اور ایلس

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

پھر پردہ پوش اور پردہ دار خواتین نے ایلس کو مشرقی روایتی دلہن کی طرح سجایا، چمکیلے اور بھڑ کیلے لباس میں دلہن بنایا اور ایلس کا نام بدل کر ''کلثوم'' رکھ دیا گیا۔ طے پایا کہ نکاح سری نگر میں ہوگا اور شیخ عبداللہ پڑھائیں گے۔

کشمیر کی پُر کیف وادی میں آغاز پانے والی اس نئی زندگی سے منسوب محبت آخری دم تک برقرار رہی۔ آنے والے کڑی آزمائشوں کے دنوں میں بھی اور جب فیض صاحب جیل کاٹ رہے تھے تب بھی۔۔۔ ایلس نے اس دور کے بارے میں لکھا ہے ''جیل کے یہ سال ہماری باہمی زندگی میں ایک رخنہ کی طرح نظر آتے ہیں مگر ان برسوں نے ہم دونوں کو وہ کچھ دیا ہے جو کسی طرح بھی ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ زندان کے دروازے ہمارے درمیان حائل تھے لیکن ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے، ان سے نکلتے ہوئے زنجیروں کی جھنکار اور تالوں میں کنجیوں میں گھومنے کی آواز کے ساتھ زنجیر و سلاسل کے یہ ایام اپنے جلو میں بھرپور لمحے لے کر آئے۔'' ایلس کی اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فیض صاحب کی رجائیت اور مستقبل پر ان کا کامل اعتماد ایلس کے وجود میں بھی سرایت کر چکا تھا۔

''موضوعِ سخن'' ایلس کے حضور فیض صاحب کا پہلا ہدیہ محبت ہے۔

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حُسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی

آج تک سرخ وسیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

☆......☆......☆

کب تک دل کی خیر منائیں

فیض صاحب نے یہ نظم لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون پر لکھی تھی۔ فیض صاحب کو ان سے خاص تعلق تھا حالانکہ اس دوستی کی عمر کچھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن جیسا کہ کہتے ہیں بعض اوقات وہ فاصلے جو عام حالات میں بہت دیر میں طے ہوتے ہیں کبھی کبھی جلد سمٹ جاتے ہیں۔ یہی ماجرا ان کو پیش آیا۔ دونوں کی ملاقاتیں رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے قربت اور پھر چاہت میں بدل گئیں۔

لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون، بیگم آمنہ مجید ملک کی قریبی دوستوں میں سے تھیں اور بیگم مجید ملک کے فیض صاحب سے بھی بڑے پرانے رشتے تھے۔ جن دنوں فیض صاحب حیدرآباد جیل میں تھے، انہیں کان میں درد کی شکایت ہوئی۔ انہیں کراچی کے جناح اسپتال میں علاج کے لئے بھیجا گیا۔ ڈاکٹر شوکت ہارون ان دنوں اسی اسپتال سے منسلک تھیں۔ بیگم مجید ملک نے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ خود فیض صاحب کا خاص خیال رکھیں۔ کیونکہ وہ ان دنوں بہت تنہا اور افسردہ ہیں۔

اس طرح وہ ڈاکٹر شوکت ہارون کے خاص مریض بن گئے۔ وہ ان کے لئے گھر سے کھانا لاتیں ہر طرح سے ان کی دل جوئی کرتیں اور ان کا خیال رکھتیں۔ اس وقت شاید انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں ان کی دوستی کے رشتے اسقدر استوار ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر شوکت ہارون پاکستان کے ایک ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ سر عبداللہ ہارون کی بیٹی تھیں جو ملک کے ممتاز صنعت کار اور ایک معروف سیاسی شخصیت بھی تھے۔ قائداعظم کے قریبی دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شوکت ان کے آٹھ بچوں میں تیسرے نمبر پر تھیں۔ انہوں نے 1942ء میں لیڈی ہارڈنگ کالج دہلی سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایک معروف وکیل میر مقبول محمود سے ان کی شادی ہوگئی جو 1949ء میں ایک ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون اس کے بعد انگلستان چلی گئیں۔ بعد میں کراچی واپس آکر جناح اسپتال سے وابستہ ہوگئیں۔

ڈاکٹر ہارون کی بہنوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک بہت بلند حوصلہ خاتون تھیں۔ ساری زندگی انہوں نے اپنے والد یا اپنے شوہر کی وراثت میں چھوڑی ہوئی دولت سے سروکار نہیں رکھا اور اپنے دونوں بچوں کی تعلیم کے سارے اخراجات خود برداشت کیے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد بھی ان سے واقف تھے۔ اپنی کتاب میں انہوں نے فیض صاحب کے حوالے سے ایک جگہ اس طرح ان کا ذکر کیا ہے۔

''میں کراچی میں تھا اور مجید ملک صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔شام کے قریب آمنہ باجی نے بتایا کہ پولیس ہیڈکوارٹر سے فیض صاحب کا فون آیا تھا۔وہ اسپتال میں چیک اپ کے لئے لائے گئے ہیں۔اب انہیں حیدر آباد سے منٹگمری جیل بھیجا جارہا ہے۔آج رات خیبر میل سے ان کی روانگی ہے۔ میں نے باجی سے کہا میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر شوکت کسی قدر پُرتکلف لباس پہنے معمول سے زیادہ بنی ٹھنی وارد ہوئیں۔باجی سے ان کی پرانی دوستی تھی۔فیض صاحب سے بھی ان کی سلام دعا تھی مگر جب فیض جناح اسپتال میں رہے جہاں وہ بطور اسپیشلسٹ کام کرتی تھیں تو فیض سے ان کی صبح شام ملاقات رہنے لگی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔اس وقت وہ باجی سے تھوڑی دیر کے لئے ملنے آئی تھیں۔باجی نے بتایا کہ ہم فیض صاحب سے ملنے ریلوے اسٹیشن جارہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ جانے پر تیار ہوگئیں۔فیض ہمیں دیکھ کر باہر پلیٹ فارم پر آگئے۔باجی کے ساتھ شوکت کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی اور ایک خاص قسم کی خوشی سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔''

جناح اسپتال میں قیام کے دوران فیض صاحب نے اپنی دوست کے بارے میں وہ بہت خوبصورت غزلیں لکھیں۔جوان کے قلبی احساس کی آئینہ دار ہیں۔

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا ہوا انتظار کرتے رہے

اور یہ مشہور غزل بھی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

شوکت ہارون نے زندگی کے آخری دم تک فیض صاحب کا خیال رکھا۔جب انہوں نے مارشل لا کے زمانے میں جیل سے رہائی پائی اور بیروزگار ہوگئے تو ڈاکٹر ہارون نے انہیں کراچی کے عبداللہ ہارون کالج میں پرنسپل کی ملازمت دلوانے میں مدد کی۔لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون 49 سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پاگئیں۔

فیض صاحب نے ان کی موت پر ایک مرثیہ لکھا اور پھر بعد میں یہ نظم بھی لکھی۔

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے
بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لُٹ جانا بھی
تم اُس حُسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اِتراؤ گے

☆......☆......☆
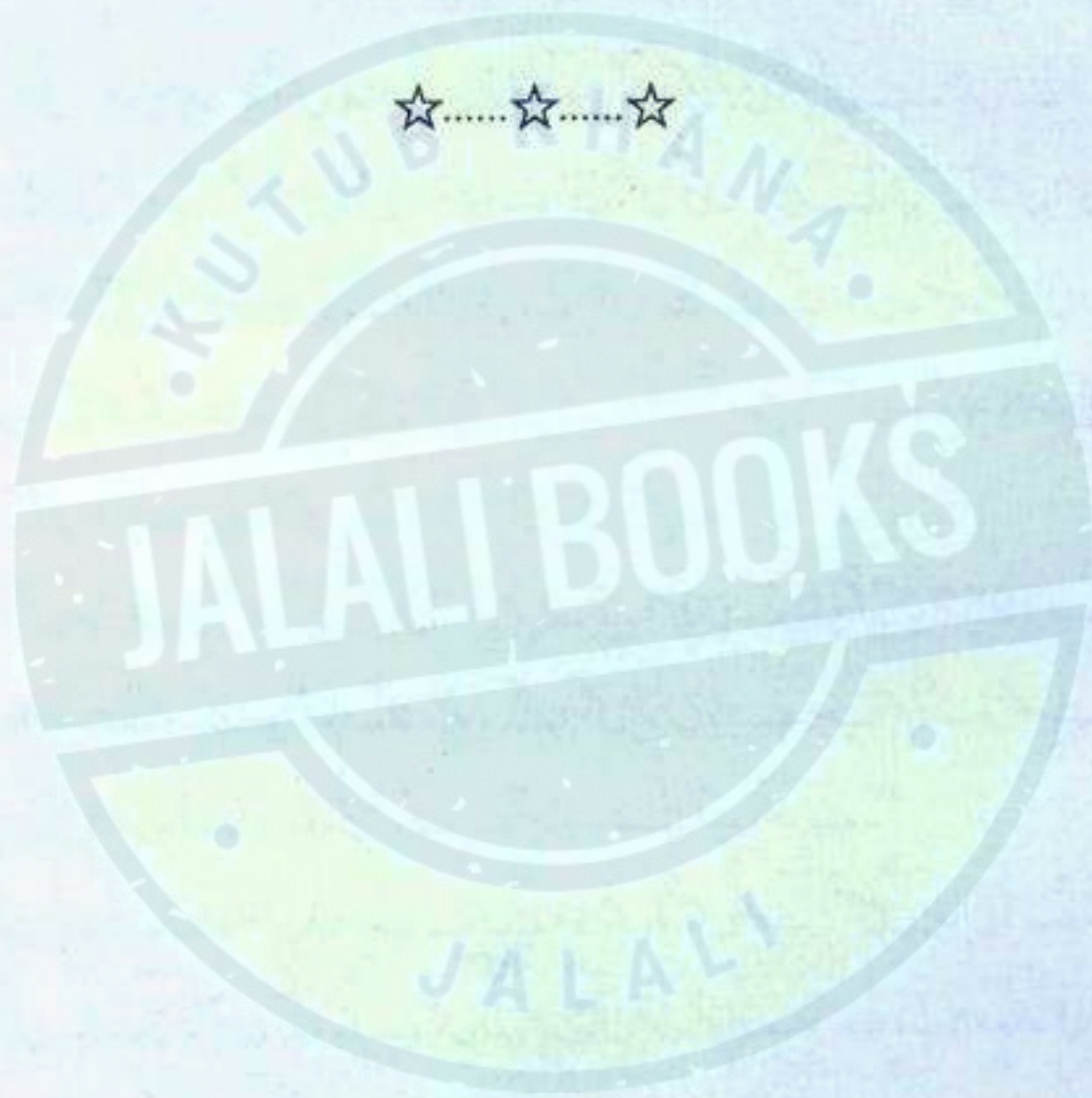
دو عشق

میں نے سلیمہ ہاشمی سے پوچھا کیا فیض صاحب نے ایلس پر بھی کبھی کوئی نظم کہی ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ حمید نسیم کا کہنا ہے کہ فیض صاحب نے اپنی مشہور نظم ''موضوعِ سخن'' ایلس کے لیے لکھی تھی۔ سلیمہ نے کہا کہ اُنہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ میں نے اصرار کیا کہ پھر بھی کچھ اشعار تو ایسے ضرور ہوں گے جو اُنہوں نے ایلس کے لیے کہے ہوں۔ سلیمہ تھوڑی دیر خاموش رہیں اور اور پھر اُنہوں نے بالکل اپنے باپ کے لہجہ میں جواب دیا ''ہاں ہیں تو سہی'' ''وہ کونسی نظم ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''وہی بھئی'' ''اس بام سے نکلے گا تیرے حسن کا خورشید'' والی نظم۔

سلیمہ کا اشارہ فیض صاحب کی مشہور نظم ''دو عشق'' کی طرف تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ''یہ 1952ء کے موسم گرما کی بات ہے۔ ہم سب ابا سے جیل میں ملاقات کے لیے حیدر آباد گئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہم لوگ رخصت ہو رہے تھے تو اُنہوں نے ماما کو کاغذ پر لکھی ہوئی یہ نظم دی تھی اور کہا تھا۔ ''یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔''

ایلس کے واپس جانے کے بعد فیض صاحب نے اپنے خط میں اُنہیں لکھا۔ ''تمہیں یہاں آنے میں تکلیف تو بہت ہوئی ہو گی لیکن اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔ بہت سی باتوں کے بارے میں دل پریشان تھا۔ تمہارے آنے کے بعد کچھ تشفی ہو گئی۔"

"دو عشق" فیض صاحب کی پسندیدہ نظموں میں سے ہے۔

فیض صاحب کے کلام کی خصوصیت اُن کا مؤثر اسلوب ہے۔ اگر چہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ ہر صاحبِ اسلوب شاعر بڑا شاعر نہیں ہوتا مگر یہ بات بھی سچ ہے کہ ہر بڑا شاعر ایک خاص اسلوب کا مالک ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ زندگی کے بارے میں ایک مخصوص رویہ رکھتا ہے۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر جب ہم فیض صاحب کی شاعری کے بارے میں سوچتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے اُسلوب کا خاص جوہر حرکت اور توانائی ہے۔ ہمیں اُن کی شاعری میں ایک بہتے ہوئے دریا کی روانی اور بے باکی محسوس ہوتی ہے۔ کسی نقاد نے اُن کی اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "فیض نے ہمیشہ زندگی کا بڑی باریکی اور گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے۔ اُن کا یہ اُسلوب زندگی کے شیوہ حسن کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں الگ الگ راستوں پر نہیں ہیں بلکہ پہلو بہ

پہلو چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی نظم ''دو عشق'' اس کی بہترین مثال ہے۔

فیض صاحب کے اس پہلودار عشق نے اُن سے ایسی نظمیں کہلوائی ہیں جن کا موضوع پوری زندگی ہے۔انہوں نے عام انسان کی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا اور محبوب کی سراپا گلزار شخصیت دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا ہے۔

یہی تاثر بڑی حد تک اس خوبصورت نظم کا بھی ہے جو اُنہوں نے اپنی محبوب شریک حیات کو ایک تحفہ کے طور پر نذر کی تھی۔نظم کے دو حصے ہیں۔پہلا حصہ محبوب کے حضور ہدیہ تحسین ہے اور دوسرا ان کے آدرش کے ساتھ اُن کے لگاؤ اور جذبات کا اظہار ہے۔یہ احساسات صرف فیض صاحب کے نہیں بلکہ ایلس بھی اُن کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہُوئے ایام
وہ پُھول سی کھلتی ہُوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہُوا اُمّید کا ہنگام

اُمّید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہُوئی شب ہوگئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدّر

اِس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اُس کنج سے پُھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اِس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہُوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لو تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے

کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اُس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

☆......☆......☆

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

فیض صاحب کا کہنا تھا کہ انسان عشق کے بغیر اُدھورا سا ہوتا ہے۔ خاص طور ایک فنکار کے لیے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ عشق کیے بغیر زندگی گزار سکے۔ محبت کے بغیر فن میں چمک اور رنگ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ خود فیض صاحب نے زندگی میں کئی عشق کیے لیکن جب بھی کسی نے پوچھا کہ اپنی محبوباؤں کے بارے میں بتائیں تو کہتے تھے یہ بالکل پرائیویٹ معاملہ ہے۔ وہ کم کم ہی کبھی کسی سے اپنی محبتوں کا ذکر کرتے تھے۔ البتہ جو لوگ اُن سے بہت قریب تھے اُن کو علم تھا کہ فیض صاحب نے کب کب اور کہاں کہاں عشق کیا مگر کس سے کیا اس کا پتہ چلانا ناممکن تھا۔ اُن کے سوانح نگار ڈاکٹر ایوب مرزا نے لکھا ہے کہ راقم سے انہوں نے اپنے پہلے عشق کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک غریب افغانی لڑکی تھی۔ فیض صاحب نے اُسے ٹوٹ کر چاہا۔ مگر پھر اُس کی شادی ہوگئی۔ وہ کہتے تھے ''بھئی اصلی محبت تو ایک بار ہی ہوتی ہے اُسکے بعد تو سب ہیرا پھیری ہے۔''

یہ فیض صاحب کی شاعری کا ابتدائی دور تھا اور اُن کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ ان دنوں اُن کا حال دیکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نوجوان شاعر مرضِ عشق میں بتلا ہے۔ اس پہلے پہلے عشق کی خلش عمر بھر اُن کے دل سے نہ گئی۔ فیض صاحب کے دوست ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنی کتاب ''بیادِ صحبت نازک خیالاں'' میں لکھا ہے "فیض کے دل کے معاملات کے سلسلہ میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر چنداں غیر مناسب نہ ہوگا۔ ایک دن سہ پہر کو فیض صاحب میرے ہاں آئے اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد کہنے لگے تم ذرا قریب ایک جگہ مجھے پہنچا دو۔ وہ میرے ساتھ کار میں بیٹھے اور ای آئی لائنز کی طرف جانے کو کہا۔ وہاں ایک کوٹھی کے پچھواڑے کی طرف لے گئے، جہاں نوکروں کے کوارٹرز تھے اور دھوبیوں کی الگنیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہیں اُتر گئے اور یہ کہہ کر اندر چلے گئے کہ میں خود ہی واپس آ جاؤں گا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک کار اُنہیں میرے گھر کے گیٹ پر پہنچا گئی۔ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ مجھے بتایا کہ " آج بڑی مدت کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اُن خاتون سے جوانی میں رسم و راہ پیدا ہوئی تھی جو جلد ہی ایک شدید جذباتی لگاؤ میں تبدیل ہوگئی مگر پھر بوجوہ اسے فراموش کرنا پڑا۔ اس کا اثر طبیعت پر بہت دیر تک رہا۔ فیض کی نظم ''کوئی عاشق کسی محبوبہ سے'' اگرچہ اس واقعہ کے کوئی سترہ برس بعد لکھی گئی مگر میرا قیاس ہے کہ اس میں اُنہی خاتون سے خطاب ہے۔ یہ نظم فیض صاحب کی پسندیدہ نظموں میں سے ایک ہے۔

ایک روز اُنہیں اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے ان سے یونہی ایک سوال کر دیا ''فیض صاحب! آپ کو اپنی شاعری میں کونسی چیز

سب سے زیادہ پسند ہے۔''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مثلاً'' کوئی نظم، کوئی غزل، کوئی قطعہ جو آپ کو سب سے زیادہ اچھا لگتا ہو۔۔۔''

وہ پہلے تو ہوں ہاں کرتے رہے پھر ذرا سوچ کر بولے، بھئی کوئی ایک چیز تو نہیں ہے۔ ہم کس طرح اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔''
میں پھر بھی بضد رہا تو کہنے لگے ''جو نظمیں ہمیں بہت عزیز ہیں ان میں ایک نظم یہ بھی ہے'' جس کا عنوان تھا ''کوئی عاشق کسی محبوب سے'' میں نے کہا ''فیض صاحب! اس عنوان سے تو آپ نے دو نظمیں لکھی ہیں ایک بالکل ابتدائی دور میں اور دوسری بعد میں۔۔۔'' بولے ''بھئی یہ بعد والی۔۔۔ پہلی کا قصہ کچھ اور ہے۔'' تو اسطرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظم خود فیض صاحب کی تصدیق شدہ پسندیدہ نظموں میں سے ہے۔

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانہ سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو
گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہو گا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
ان کہی بات کا موہوم سا پردہ ہو گا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہو گا

گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لئے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سُنو، اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو، اور جو نہ چاہو نہ کہو

☆......☆......☆

تجھے پکارا ہے بے ارادہ

مجھے ششماہی ''غالب'' کراچی کی 1992ء کی اشاعت میں فیض صاحب کے چند غیر مطبوعہ خطوط ملے ہیں جو ملتان کے پتہ پر عفت ذکی نام کی خاتون کو لکھے گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی میں نے فیض صاحب کے دوستوں کی زبانی یہ بات سنی تھی کہ جس خاتون سے فیض صاحب کو طویل عرصہ تعلق خاطر رہا اس کا تعلق ملتان سے تھا۔ اب یہ خطوط پڑھنے کے بعد اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ہے اور گمان ہوتا ہے کہ شاید اسی خاتون کا نام ہی عفت ذکی ہے۔ اس رسالے کے مدیران کو عفت ذکی کے نام یہ خطوط جناب لطیف الزماں کے توسط سے ملے ہیں جو خود بھی ملتان کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے عفت ذکی کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ عفت ذکی کو اس زمانے سے جانتے ہیں جب وہ گورنمنٹ کالج ملتان سے اردو میں ایم اے کر رہی تھیں۔ عفت بڑی ذہین اور متین طالبہ تھیں۔ فیض صاحب سے ان کی پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی پھر باہمی ارتباط بڑھا۔ وہ طویل عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے منسلک رہیں۔

ایک دن ملتان میں قیام کے دوران فیض صاحب نے یاد فرمایا۔ جب میں دیئے ہوئے پتہ پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ عفت ذکی کا گھر ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ فیض صاحب جب بھی ملتان آتے ہیں ان کا قیام ہمیشہ عفت ذکی کے ہاں ہوتا ہے۔

عفت کے نام لکھے جانے والے ان خطوں کی سب سے بڑی اہمیت تو یہ ہے کہ یہ فیض کے ایسے خط ہیں جو "کاروباری" یا "رسمی" نہیں۔ یہ ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر کی ذہنی اور قلبی کیفیات کے آئینہ دار ہیں اور شاعر کی سوچ کے بعض ایسے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو اب تک عام نظروں سے اوجھل تھے۔

میں نے ان خطوں سے چند اقتباسات اختصار کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ خاص طور پر وہ ایک خط جو اس غزل کے حوالے سے ہے، جس کو انہوں نے ''تجھے پکارا ہے بے ارادہ'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ تحریریں غالباً 1970ء کے عشرے کی ہیں۔

فیض صاحب نے عفت ذکی کو لکھا۔

''اب کے تمہارے خط سے دل کچھ خوش بھی ہوا اور کچھ اُداس بھی۔ خوش اپنے لیے، یہ جان کر کہ فارسی شاعر عرفیؔ کے بقول خزاں کے باوجود چمن میں بوئے یاسمین باقی ہے اور تمہارے لیے اس خیال سے کہ تمہیں بازار وفا کی اس وقت سوجھی جب دوائے درد بیچنے والے دوکان بڑھانے کی فکر میں تھے۔ بہر حال آج کل دلوں کی خانہ ویرانی کے دور میں بزم چراغاں کرنے کی کوئی صورت تو پیدا ہوئی۔''

فیض صاحب کی ان سے راہ و رسم اور روابط کا اندازہ لگانے کے لئے چند خطوں کے مختصر اقتباسات۔

''کئی دنوں سے موسم ابر آلود تھا۔ جب کچھ اس قسم کی کیفیت ہوتی ہے کہ

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیماں کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن میں وجد آئے

خاص طور پر اس لیے کہ بہت دن سے نامہ و پیام کا سلسلہ بھی بند تھا۔ بارے اب اس کی تلافی تو ہوگئی لیکن صحبت پھر بھی باقی ہے اور اس greed کی وجہ سے جس کی بات ہو چکی ہے ضبط کا عہد توڑنے کو جی چاہتا ہے (مرجانے کو نہیں)۔

ہمارے ہاں لوگ مرجانے کو بھی وصال کہتے ہیں یعنی فلاں صاحب کا وصال ہو گیا اور اہل فرنگ جو صوفی نہیں ہیں وہ اپنے طور سے ایک خاص ذہنی اور جسمانی کیفیت کو Little Death کہتے ہیں۔ یعنی روزمرہ زندگی میں ایک qualitative تبدیلی کا تصور دونوں میں مشترک ہے۔ البتہ ہمارے ہاں وصال صرف ''پہنچے ہوئے'' لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

تمہاری باتوں کی وجہ سے عمر رفتہ کو آواز دینے کو بہت جی چاہتا ہے۔ وہ تو نہیں ہو سکتا البتہ کبھی ماضی کو حال اور کبھی حال کو ماضی ضرور تصور کر سکتے ہیں۔''

اور آخر میں ایک اور خط کا اقتباس جو شاید دسمبر 1975ء کا ہے۔

''حج اور عید کے ہجوم نے واپسی میں راستہ روکے رکھا۔ بعد از خرابی بسیار دو تین دن پہلے گھر پہنچے۔ حسب اُمید تمہارا خط ملا۔ طویل غیر حاضری کے باعث بہت سے جھمیلے درپیش تھے۔ عرصہ بعد ایک غزلیہ قسم کی غزل کو جی چاہا۔ تم بھی سن لو۔''

خط میں غزل کے آخری شعر کے حوالے سے انہوں نے یہ فقرہ بھی لکھا ہے۔

''تمہاری رعایت سے آخری مصرع اُلٹ ہونا چاہیے۔ یعنی "ادائے رنگیں قبائے سادہ" لیکن وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

یہ غزل پڑھ کر صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر نے اپنی اسی محبوب دوست کے لیے یہ اشعار لکھے ہیں۔

تجھے پکارا ہے بے ارادہ
جو دل دکھا ہے بہت زیادہ
ندیم ہو تیرا حرف شیریں
تو رنگ پر آئے رنگِ بادہ
عطا کرو اک ادائے دیریں
تو اشک سے تر کریں لبادہ
نہ جانے کس دن سے منتظر ہے
دلِ سرِ رہگزر فتادہ
کہ ایک دن پھر نظر میں آئے
وہ بام روشن وہ در کشادہ
وہ آئے پرسش کو پھر سجائے
قبائے رنگیں ادائے سادہ

☆......☆......☆

دشتِ تنہائی میں

تنہائی کے لمحات

آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
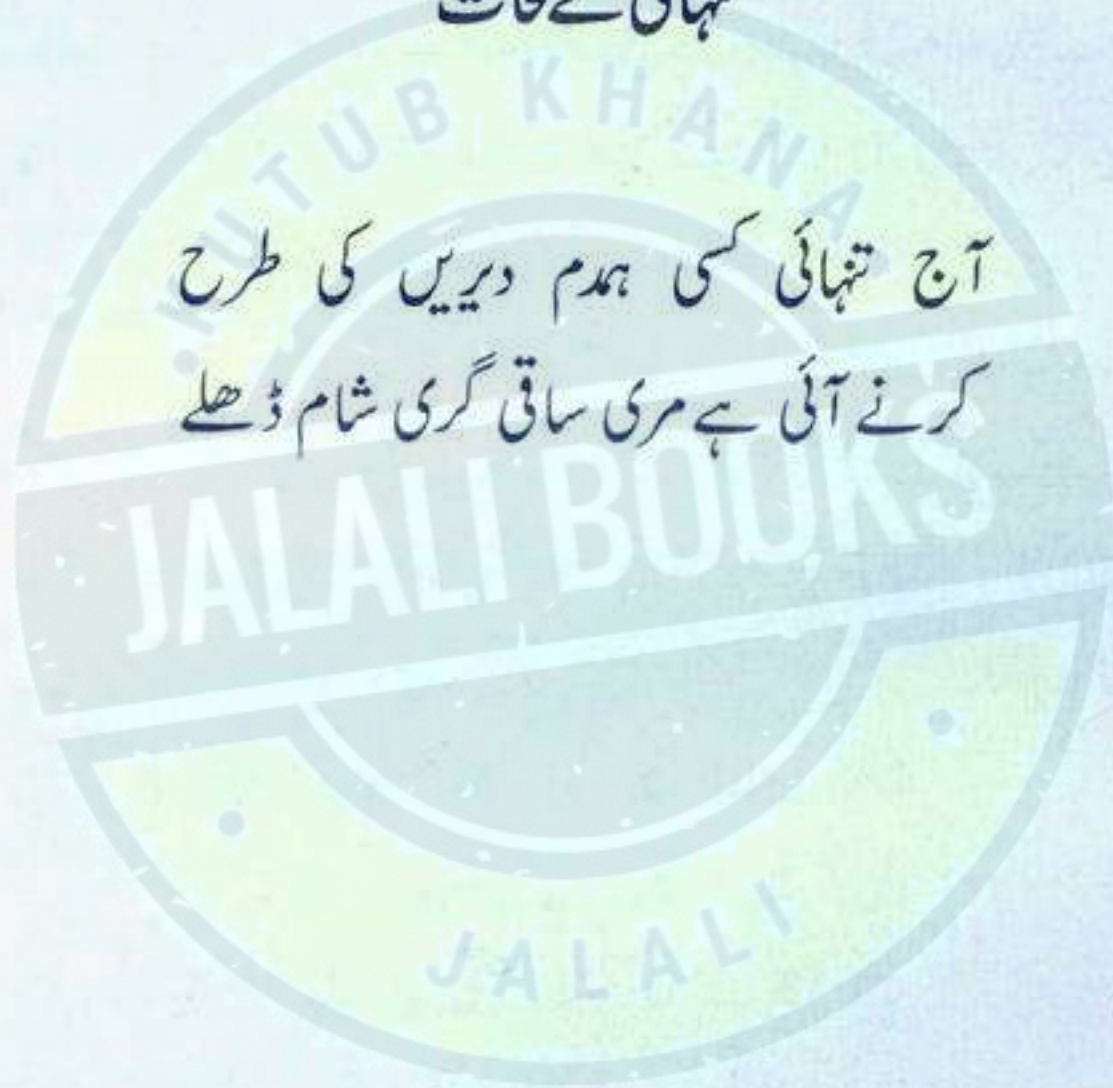
آج شب کوئی نہیں ہے

 تنہائی

 یاد

 درد آئے گا دبے پاؤں
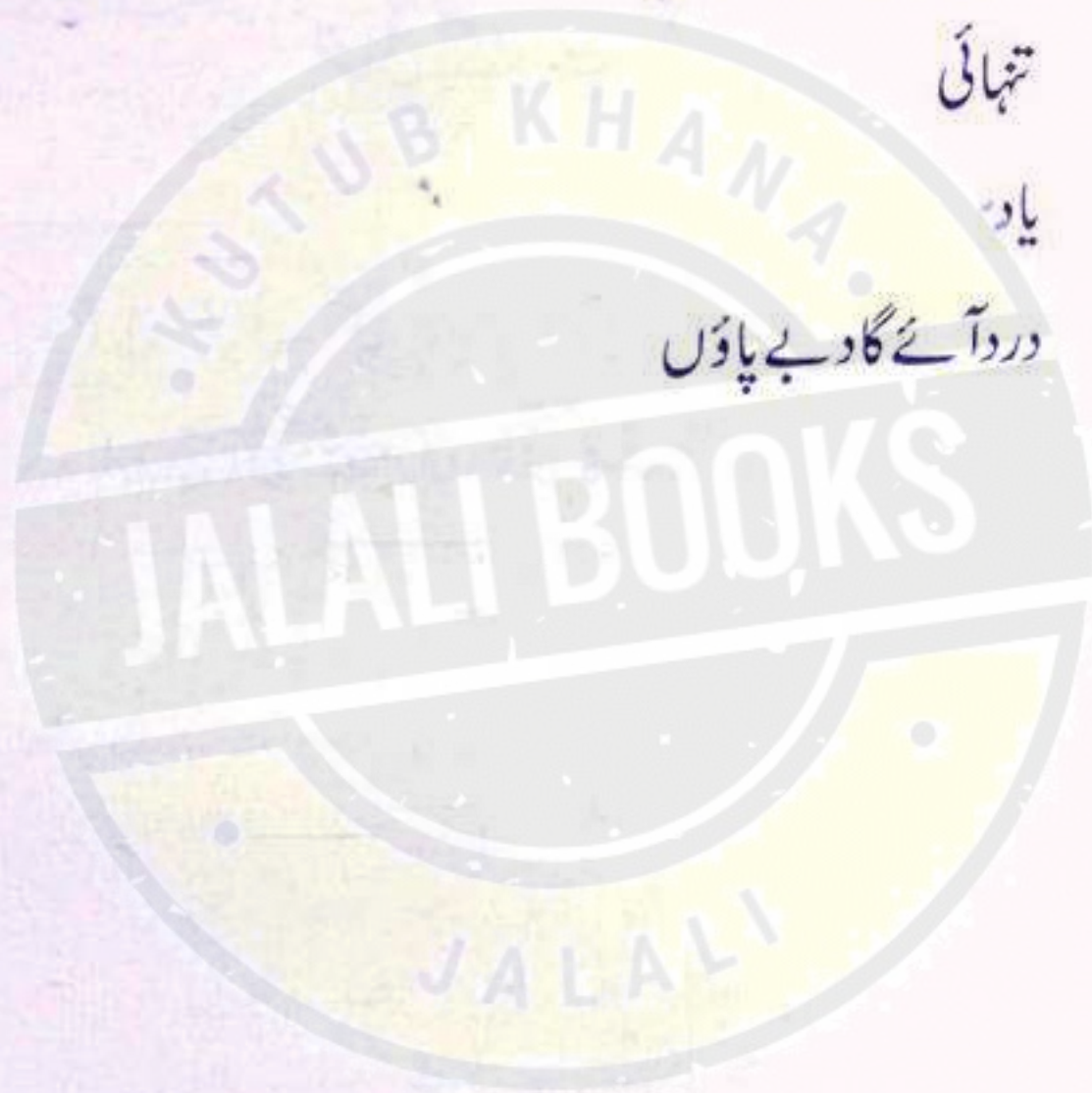
آج شب کوئی نہیں ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب فیض صاحب غروب ہو رہے تھے۔ فیض صاحب ساری عمر تنہائی سے بہت خوف کھاتے رہے مگر تنہائی نے زندگی بھر ان کا تعاقب کیا۔ جیل خانوں میں، جلاوطنی کے کٹھن دنوں میں، یہاں تک کہ کبھی کبھی بھری محفلوں میں بھی تنہائی کسی نہ کسی روپ میں ان کے پاس آتی جاتی رہی۔ اس موضوع پر اُنہوں نے ایک سے ایک بڑھ کر نظمیں لکھیں ''آج شب کوئی نہیں ہے'' بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ غالباً تنہائی کے موضوع پر یہ اُن کی آخری نظم ہے۔ اس کے اشعار میں جو غمنا کی اور افسردگی ہے وہ کسی اور نظم میں دکھائی نہیں دیتی، ایک ہوک سی ہے۔ واقعی جیسے سارے دُکھتے ہوئے رشتوں کی طنابیں کُھل کر سلسلہ وار پتہ دینے لگی ہیں۔ ''رخصت قافلہ شوق کی تیاری کا''، ''انتظار''، ''یاد'' اور ''تنہائی'' ہمیشہ فیض صاحب کے دل پسند موضوع رہے۔ انہوں نے ہر زاویے سے ان موضوعات کو دیکھا اور پرکھا۔

شام دھندلانے لگی اور مری تنہائی
دل میں پتھر کی طرح بیٹھ گئی
چاند اُبھرنے لگا یکبار تری یاد کے ساتھ
زندگی مونس و غمخوار نظر آنے لگی

تنہائی کی ایک واردات اُن پر لاہور قلعہ کے زندان میں بھی گزری جب اُنہوں نے "قید تنہائی" کے عنوان سے یوں لکھا

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آباد جدائی میں سحر ہونے لگی

لیکن اب اور وقت تھا۔ تب ان میں حوصلہ بھی تھا، ولولہ بھی اور عکس رخ یار کی صحبت بھی میسر تھی۔ اُن دنوں وہ تنہائی سے گھبراتے ضرور تھے مگر ساتھ ہی ایک آس ایک اُمید اور ایک رومانس بھی اُن کا ہم جلیس ہوتا تھا۔

آج تنہائی کسی ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

لیکن 1983ء کا زمانہ تھا۔ بوڑھا شاعر اپنے چہار اطراف دیکھتا تو اسے اس دشت تنہائی میں دل کے رخسار پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نظر نہ آتا تھا۔ آخر شب کے ہم سفر ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے تھے۔ آشنا چہرے، جانی پہچانی آوازیں دھندراتوں میں کھوگئی تھیں۔ اب نہ وہ خوشبوئیں تھیں، جن سے کبھی زندگی مہکتی تھی، نہ وہ دل کو موہ لینے والے نغمے تھے اور نہ ہی وہ جھلملاتی جگمگاتی صورتیں تھیں۔ بس تصورات تھے خواب تھے خیال تھے۔ نگاہوں کے سامنے خالی عمارتوں کی ویران اور بیگانہ سی دیواریں تھیں، دروازے اور دریچے تھے، غلام گردشیں تھیں، محل سرائے تھیں مگر سب مکینوں سے خالی، سب کچھ دھندلکوں میں ڈوبا ہوا تاریکی میں نہایا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے یہ نظم لکھتے ہوئے فیض صاحب کے دل نے ضرور ان سے سرگوشی کی ہوگی کہ ''الٰہی وہ صورتیں کس دیس بستیاں ہیں؟ یہ ایک مختصر نظم ہے مگر اس کی جاذبیت اور تاثر ناقابل فراموش ہے۔

فیض صاحب کے اس دکھ اور تکلیف کا اندازہ وہ لوگ خوب لگا سکتے ہیں جو ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ جو جانتے تھے کہ فیض صاحب بڑے محفل آرا انسان تھے۔ انہیں بھری پری شامیں اور کیف و مستی سے سرشار راتیں پسند تھیں۔ وہ چاہتے تھے ہر گھڑی ان کے چاروں طرف ایک میلہ لگا رہے۔

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

تصور کیجئے ایک ایسا انسان بستر پر خاموش لیٹا تخیلات کی دنیا میں گم ہے۔ اس کے دل کو تسلی اور تقویت دینے والا کوئی نہیں ہے اور وہ زیرلب کہہ رہا ہے۔

یہ کس دیارِ عدم میں مقیم ہیں ہم تم
جہاں پہ مژدۂ دیدار حسن یار تو کیا
نویدِ آمدِ روزِ جزا نہیں آتی
یہ کس خمار کدے میں ندیم ہیں تم
جہاں پہ شورشِ زندانِ میگسار تو کیا
شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہیں آتی

اس سے بڑا صدمہ فیض صاحب کے لئے اور کیا ہو سکتا تھا۔ انہیں محسوسات اور جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے یہ نظم لکھی۔

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
"کوئی نغمہ کوئی خوشبو کوئی کافر صورت"
کوئی امید کوئی آس مسافر صُورت
کوئی غم کوئی کسک، کوئی شک کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
تم اگر ہو تو مرے پاس ہو یا دور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور ہو تم
اور نہیں ہو تو کہیں کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے

☆......☆......☆

تنہائی

یہ نظم غالباً فیض صاحب کی مقبول ترین نظموں میں سے ہے جوان کی شاعری کے ابتدائی دور کی تخلیق ہے اوران کے پہلے مجموعۂ کلام ''نقشِ فریادی'' میں شامل ہے۔ صہبا لکھنوی نے ''افکار'' کے فیض نمبر میں ان کا ایک غیر مطبوعہ خط شائع کیا ہے جو فیض صاحب نے اپنے ایک شاعر دوست سلام مچھلی شہری کو لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ یہ نظم منسلک تھی۔ چونکہ خط پر 1940ء کی تاریخ درج ہے اس لیے امکان ہے کہ یہ نظم بھی اسی سن کی تخلیق ہے۔

جب یہ نظم منظرِ عام پر آئی تو اس کی بڑی شہرت ہوئی اور اسے اردو شاعری میں ایک نئے موڑ سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن تعریف کے ساتھ ساتھ اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا اور آج تک بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے دور کے معروف نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ''نظم میں جسقدر شاندار الفاظ اور اسلوب ہے نظم اسی قدر مبہم اور بے معنی ہے۔ اس قسم کی نظمیں پڑھ کر ہم یہ ضرور محسوس کر سکتے ہیں کہ کوئی افسردگی اور یاس کی سی بات بیان کی جا رہی ہے لیکن وہ یاس اور افسردگی کس لئے ہے اور کیسی ہے یہ نہ شاعر سمجھتا ہے اور نہ پڑھنے والا۔۔۔''

نظم کے بارے میں ایک اور بہت تلخ بات ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر سے منسوب ہے۔ ان کا یہ فقرہ جسے حمید نسیم نے ان کے حوالے سے لکھا ہے دہرانے کو جی تو نہیں چاہتا۔ مگر اتنے بڑے دانشور کا خیال نقل کرنے میں شاید کوئی حرج بھی نہیں۔ تاثیر فیض صاحب کے استاد تھے، ابتدائی دور میں ان کے زبردست حمایتی بھی تھے اور بیوی کی طرف سے رشتہ دار بھی۔ یہ بات جو میں لکھ رہا ہوں اس کو حمید نسیم نے اس طرح قلمبند کیا ہے۔

''امرتسر میں قیام کا زمانہ، فیض صاحب کی شخصیت کی تربیت اور جلا کا اہم ترین دور تھا۔ جہاں صاحبزادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں نے فیض صاحب کے سیاسی شعور کو چمکایا وہاں تاثیر کی صحبت نے ان کی شاعری کو نکھارا۔ تاثیر صاحب گرمیوں کی تعطیلات ہمیشہ کشمیر میں گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ کشمیر سے واپسی پر فیض صاحب اور میں ان سے ملنے گئے۔ اس نشست میں فیض صاحب نے اپنی نظم ''تنہائی'' سنائی۔ تاثیر صاحب بڑے انہماک سے سنتے رہے اور کئی مصرعوں پر بے ساختہ داد دی۔ نظم ختم ہوئی تو تاثیر صاحب نے فرمایا۔ ''فیض تم نے رنڈی کے گھر کی بے مثال تصویر کھینچی ہے۔'' میں نے فیض صاحب کو برہم ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ فقرہ سن کر ان کے کان سرخ ہو گئے۔ بولے کچھ نہیں۔ ظاہر تھا کہ تاثیر صاحب کے فقرے سے انہیں دکھ پہنچا ہے۔"

اس نظم پر لڈ میلا وسیلیئوا نے یوں تبصرہ کیا ہے۔

"'' تنہائی'' فیض صاحب کی بیشتر نظموں سے رجائیت کے فقدان کی وجہ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کے نو مصرعے مایوسی کی حد تک پہنچے ہوئے دلگیری اور بے چینی کے جذبے، دنیا سے مکمل بے تعلقی اور پس ہمتی کے احساس کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس محدود شعری فضا میں ٹوٹتی ہوئی امید اور تنہائی کے المیے کی پوری ایک کہانی سما گئی ہے۔ نظم کا غنائی ہیرو ہر آہٹ کو غور سے سنتا ہے کہ شاید وہ آہی جائے۔ اس کے گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور شمعیں روشن ہیں۔ تنہائی کی دلگیری میں غنائی ہیرو اپنے دل سے مخاطب ہوتا ہے لیکن وہ جواب دینے سے قاصر ہے۔"

1946ء میں معروف نقاد پروفیسر سلامت اللہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "تنہائی اور انتظار فیض صاحب کی شاعری کی مرکزی بنیادی خصوصیت ہے۔ ان موضوعات پر ان کی ساری نظمیں اس ایک نظم کے گرد گھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نظم بظاہر داخلی واردات کی داستان ہے لیکن بے حد معنی خیز ہے پروفیسر صاحب کا خیال یہ بھی تھا کہ حقیقتاً یہ نظم محض انفرادی نہیں ہے۔ تنہائی اور انتظار جس کا اظہار فیض نے کیا ہے وہ صرف شاعر کا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری ہندوستانی قوم کا ہے۔"

خود فیض صاحب نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ ہمارے طالب علمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک بھی وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے، لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں کہ 1920ء سے 1930ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر اور نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔

لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سب ہی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

تنہائی کے احساس کی شدت اس نظم میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ مگر اس کا انداز اور تاثر کچھ اور ہی ہے۔

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک رہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

اسے پڑھتے ہوئے غالبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔۔

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

اس نظم کے ساتھ میری ایک اور یاد بھی وابستہ ہے۔اسے ہم مشہور عوامی شاعر حبیب جالب سے سنا کرتے تھے۔ ان کا ترنم ایسا دلکش تھا کہ سننے والے مبہوت ہو جاتے تھے۔ میں نے پہلی بار یہ نظم ان سے فیض صاحب کی موجودگی میں سنی تھی۔جب فیض صاحب سازش کیس میں جیل سے رہائی کے بعد کراچی آئے تھے اور یونیورسٹی کے طلباء نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا تھا۔اس شام پہلی بار حبیب جالب نے یہ نظم سنا کر محفل کو لوٹ لیا تھا۔

☆......☆......☆
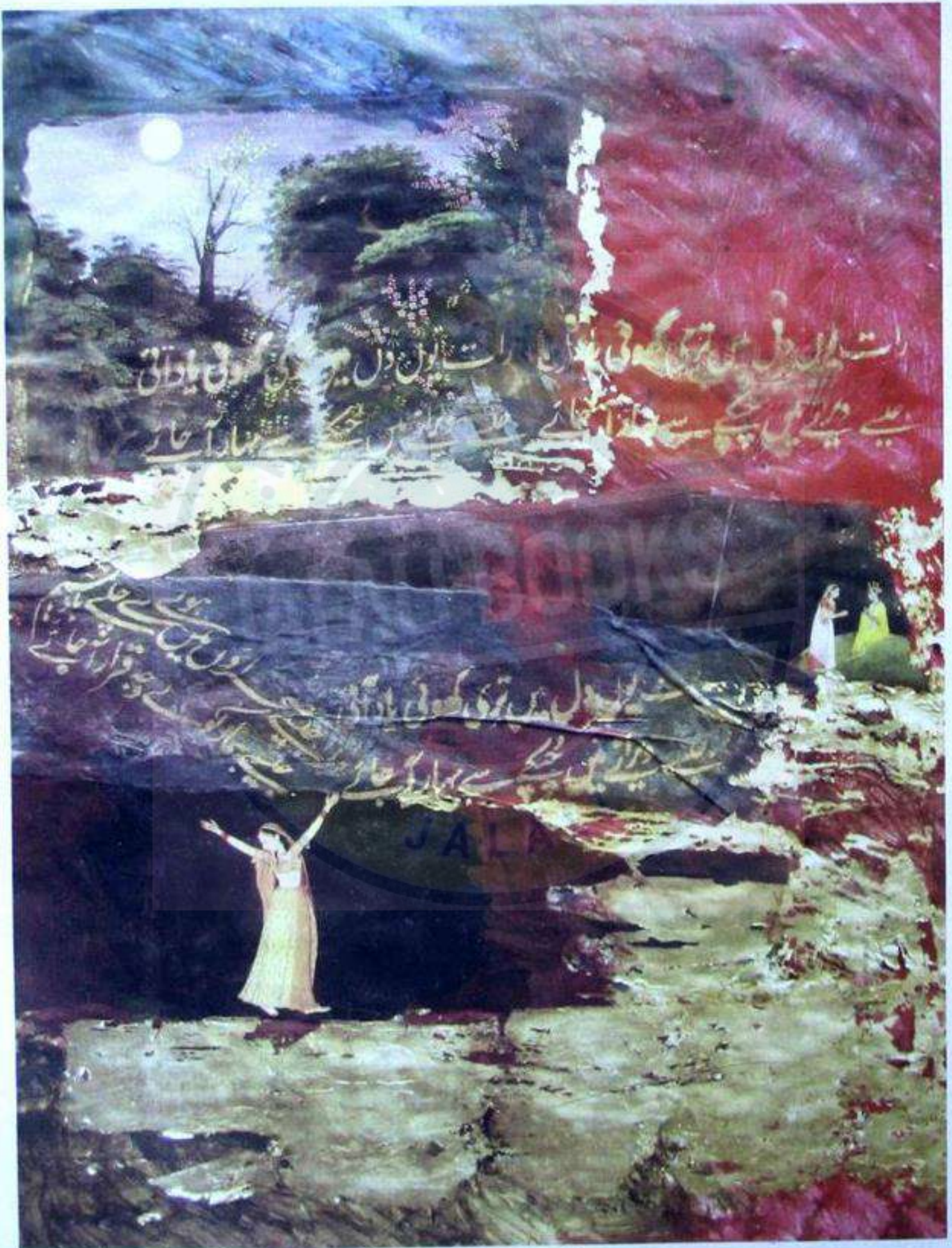
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے ـــ عمل ثمینہ آفتاب

یاد

''یاد'' فیض صاحب کی ایک بہت مقبول نظم ہے۔ ویسے شاید یہ کہنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ اس کی مقبولیت میں گلوکارہ اقبال بانو کا بھی برابر کا حصہ ہے جنہوں نے اسے کچھ ایسے تیکھے انداز میں گایا ہے کہ سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ یہ نغمہ پہلی بار نصف صدی قبل فیض صاحب کی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کے ذریعہ منظر عام پر آیا تھا۔

فیض صاحب کے ابتدائی دور میں لکھی گئی یہ نظم خیال آفرینی اور حسن کاری کے لحاظ سے ایک نئے ابھرتے ہوئے شاعر کے سفر کا نقطہ آغاز ہے۔ ان دنوں ان پر سحر آگیں الفاظ اور علامتیں بڑے تواتر کے ساتھ وارد ہوتی تھیں۔

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

اگر کوئی پوچھے تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بالکل ابتدائی دور میں فیض کی شاعری کو بام عروج پر پہنچانے والی چار نظمیں ہیں، جن کا اسلوب بھی ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ ان میں الفاظ کی مینا کاری اور علامتوں کی جادوگری اپنے عروج پر ہے۔ ان نظموں کے بغیر فیض کی شاعری کا پہلا دور نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ رقیب سے، مجھ سے پہلی سی محبت، تنہائی اور یاد ان نظموں کے عنوانات ہیں۔ یہ نظمیں ایسی ہیں کہ صرف پہلا مصرع سن کر پوری نظم یاد آجاتی ہے۔ جیسے:

آکہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں

اس دور کی رومانوی اور عشقیہ اردو شاعری کے حوالے سے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ "فیض کی شاعری میں ان کے ہم عصروں کی طرح اشاریت یا رمزیت نہیں ہے چونکہ زندگی کے جن مسائل پر ان کی نظر پڑتی ہے وہ غم انگیز ہونے کے باوجود سادہ ہیں۔ دوسرے یہ سچ ہے کہ فیض کے ہاں تشبیہات کی بہتات نہیں ہے مگر جو تشبیہیں ان کے ہاں ملتی ہیں وہ بڑی دلکش، انوکھی اور غیر مانوس ہیں مثلاً

رات آئی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار پڑی

یا یہ کہ

جیسے ویرانے میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اور اس نظم میں تو لفظوں کی جادوگری اپنے شباب پر ہے

اس کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

ان نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے۔ کچھ مصرے تو ایسے ہیں جو بذات خود ایک نظم ہیں۔

اس نظم کے بارے میں بہت زیادہ نہیں لکھا گیا۔ شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس نغمہ کو سنا زیادہ گیا ہے اور اس پر لکھا کم گیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے میری نظر سے اردو کے معروف نقاد پروفیسر احتشام حسین کی ایک تحریر گزری تھی جس میں انہوں نے اس پر تبصرہ کیا تھا ''اس نظم میں شاید ہر محبت کرنے والے کی داستان ہے۔ فیض کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس نظم میں لمحہ حال کو ماضی اور مستقبل میں اس طرح پھیلایا ہے کہ ہجر کی بکھری ہوئی کڑیاں خیال کے ایک لمحے میں مرکوز ہوگئی ہیں۔ ایک ایسے لمحے میں جو ابھی وجود میں نہیں آیا لیکن جسے شاعر کی قوت تخیل نے موجود کر دیا ہے اس میں واقعات کے خارجی عمل سے وہ داخلیت جنم لیتی ہے جو پورے وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ علامات اور استعارات نے ایک دنیا کی تخلیق کی ہے جس میں گزرے ہوئے وصل اور قربت کے مناظر بھی ہیں اور وقفے بھی ان میں کھو کر یہ مناظر سائے اور سراب کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔''

یہ غنائی نغمہ بہت موسیقیت لئے ہوئے ہے۔ آغاز سے انجام تک شاعر نے ایک مخصوص آہنگ برقرار رکھا ہے۔ اس طرح کہ سننے والا کچھ خواب کچھ بیداری کے عالم میں دشت تنہائی کے سحر میں کھو جاتا ہے اور نغمہ کے الفاظ براہ راست دل میں اتر جاتے ہیں۔

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سَراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کِھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے، کہیں قربت سے تیری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

درد آئے گا دبے پاؤں

5 جنوری 1953ء کو راولپنڈی سازش کیس کا فیصلہ سنا دیا گیا اور سارے ملزموں سمیت فیض صاحب بھی سزا کے مستحق قرار پائے۔ وہ مقدمہ ہار گئے اور ایسا ہونا کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ فیض صاحب نے اسی روز ایلس کو اس فیصلہ کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ''اب تک یہ بری خبر تم تک پہنچ چکی ہوگی مگر اپنا دل زیادہ پریشان نہ ہونے دینا۔ جس طرح گذشتہ ماہ و سال گزرے ہیں آنے والے دن بھی ویسے ہی گزر جائیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت اتنی بڑی نہیں ہوتی جتنی بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں اتنے حراساں کیوں تھے۔''

5 تاریخ کو شروع کیا جانے والا خط انہوں نے اگلے روز مکمل کیا ''مجھے افسوس ہے کل کے واقعہ کی گہما گہمی میں یہ خط ختم نہ ہو سکا۔ مجھے تو ابھی سے کل کے واقعات بالکل مہمل اور دل سے دور معلوم ہونے لگے ہیں۔ حقیقی اور بامعنی بات صرف اتنی ہے کہ میں نے جرم نہیں کیا، کوئی گناہ نہیں کیا۔ میرا دل بالکل مطمئن ہے اور پُر سکون ہے۔''

اسی خط میں فیض صاحب نے ایک عجیب فلسفیانہ انداز مگر بہت سہل زبان میں یوں لکھا ہے۔

''میں نے اپنے آپ کو کہا کہ ایک آدمی جو زندہ اور صحت مند ہے کیسا بھی غمگین اور دردمند کیوں نہ ہو اس شخص سے بہتر ہے جو زندہ ہے لیکن بیمار ہے۔ اور وہ شخص جو زندہ اور بیمار ہے لیکن اُسے صحت یاب ہونے کی امید ہے اس شخص سے بہتر ہے جو زندہ اور بیمار ہے لیکن شفا سے ناامید اور یہ آخری شخص اس شخص سے بہتر ہے جو مر چکا ہے اور جو مر چکا ہے وہ تو کوئی شخص ہی نہیں اس لئے وہ نہ کسی سے بہتر ہے اور نہ بدتر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی زندہ ہے وہ کسی نہ کسی سے بہتر ہے اس لئے اسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا!!''

اس واقعہ کے بعد فیض صاحب کے دل پر کیا بیتی اس کا اندازہ کرنا اس لئے مشکل ہے کہ انہوں نے اس کے بعد بہت دنوں تک کوئی نیا شعر نہیں کہا۔ تقریباً ایک مہینہ گزر جانے کے بعد انہوں نے خود لکھا ''فیصلے کے بعد سے میں نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اس کی غنودگی سے اب جا کے کچھ بیدار ہونے لگا ہوں۔''

فیصلہ کے کچھ دن بعد انہیں حیدر آباد سے منٹگمری جیل منتقل کر دیا گیا۔ وہاں فیض صاحب کو قید کا بہت شدید احساس ہوا۔ سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ مستقبل قریب میں رہا ہو جانے کی جو موہوم سی امید تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ جیل کی دیواروں، دروازوں اور سلاخوں کو غور سے دیکھتے رہتے۔ باہر کی دنیا سے جیسے ان کے سارے تعلق ختم ہو چکے تھے۔ لیلائے سخن ان سے روٹھ گئی تھی۔ وہ تنہائی کے کرب کا شکار تھے، جو منٹگمری میں اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ ان کے روبرو تھی اور وہ امید و بیم کی اس کیفیت کو

شعر میں ڈھالنے کا انتظار کر رہے تھے۔

اک کڑا گیت کہ جو درد میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک سوراخوں سے نکلتا ہی نہیں

مقدمہ کے فیصلے کے بعد انہوں نے پہلی غزل مئی 1954ء میں لکھی۔

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرمِ سخن سے پہلے

یہ ایک خوبصورت غزل ہے لیکن اُس نظم کی تخلیق میں جوان کی دلی کیفیت کی آئینہ دار تھی، تخلیق ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور جب وہ معرض وجود میں آئی تو انہوں نے اسے "درد آئے گا دبے پاؤں" کا عنوان دیا منٹگمری کے ویران اور تنگ و تاریک قید خانہ میں انہوں نے تنہائی کی کیفیت کا اظہار یوں کیا۔

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آئے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا
حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابہ ہوگا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمن جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہُوا گلزار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

☆......☆......☆

عمر گذشتہ کی کتاب

نوحے اور مرثیے

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمر گذشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا اور مرا عہد شباب

- حسن اور موت
- اقبال
- نوحہ
- جمے گی کیسے بساطِ یاراں
- تیرے غم کو جاں کی تلاش تھی
- ختم ہوئی بارشِ سنگ
- نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش
- چاند نکلے کسی جانب
- سجاد ظہیر کے نام
- مخدوم کی یاد میں
- میجر اسحاق کی یاد میں

حُسن اور موت

کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ نظم فیض صاحب نے اپنے والد کی وفات پر لکھی تھی اور ایک طرح سے یہ ان کا مرثیہ ہے۔

فیض صاحب کے والد کا نام سلطان محمد خاں تھا۔ کالا قادر قصبہ اُن کی جائے ولادت ہے جو ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں کی معیشت کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا چنانچہ فیض صاحب کے خاندان والوں کی زندگی بھی زراعت کے گرد گھومتی تھی۔ اُن کے آباؤ اجداد اسی پیشہ سے وابستہ تھے۔ نوعمر سلطان محمد خاں کو بھی اس کام پر لگا دیا گیا۔ وہ صبح سویرے.... بھیڑ بکریاں لے کر نکل جاتے اور شام تک چراگاہوں میں انہیں لیے گھومتے رہتے۔ حالانکہ اُن کو یہ کام بالکل پسند نہ تھا۔ اُن کی طبیعت تو آغازِ زندگی سے ہی تعلیم کی طرف راغب تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ گاؤں کے دوسرے متمول گھرانوں کے بچوں کی طرح وہ بھی تعلیم حاصل کریں۔ اُس زمانے میں کالا قادر گاؤں سے کچھ فاصلے پر صرف ایک پرائمری اسکول تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ سلطان خاں کے والد ایک معمولی کسان تھے اور اپنی اولاد کے اسکول کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ لیکن سلطان خاں تو علم کے دیوانے تھے۔ آخر ایک روز یہ حسرت اُنہیں اس اسکول کے اندر لے گئی۔ اُنہوں نے اپنے مویشیوں کو گھاس چرنے کے لیے چھوڑا اور خود اسکول کے استاد کے پاس پہنچ گئے۔ اُستاد نے گڈریے کے اس بچے کو دیکھا اور اس کی علم کی طلب سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے انہیں کلاس میں آکر بیٹھنے کی اجازت دے دی اور اس طرح اس سفر کا آغاز ہوا۔

سلطان محمد خاں نے زندگی کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔ غربت اور مفلوک الحالی کے زمانے بھی.. اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی بھی۔ وہ اپنی کوششوں سے افغانستان چلے گئے اور وہاں ترقی کرتے کرتے وزارت اور مشاورت کے اعلیٰ عہدوں تک جا پہنچے۔ افغانستان کے حکمراں امیر عبدالرحمان اُن سے بہت متاثر تھے۔ اُن کی سرپرستی میں سلطان خاں ترقی کی منزلوں پر گامزن رہے۔ اُن کی ایک شادی بھی امیر افغانستان کی بھتیجی سے ہوئی۔ افغانستان میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے وکالت کی اعلیٰ سند لے کر وطن لوٹے۔ یہاں ان کا شمار ممتاز قانون دانوں میں ہونے لگا۔ وہ بہت سی سماجی اور فلاحی انجمنوں سے بھی منسلک رہے۔ پنجاب کے مشاہیر، شخصیتوں، علامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر محمد شفیع اور ڈاکٹر ضیاء الدین وغیرہ سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔

فیض صاحب کو اپنے والد سے خاص اُنس تھا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اُن کو علم وفن کی طرف رغبت دلانے اور اُن کی

شخصیت کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا سہرا اُن کے والد کے سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی موت نوجوان فیض کے لئے شاید زندگی کا پہلا بڑا سانحہ تھا۔ وہ اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔ اُن کے کالج کے ایک بہت قریبی دوست شیر محمد نے اس سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''وہ اپنے والد کی ہدایت کے مطابق چھوٹی بہن کی شادی کے موقع پر اپنے سب بھائی بہنوں کے ساتھ سیالکوٹ میں موجود تھے۔ جس صبح بارات آنے والی تھی اس سے ایک رات قبل سلطان محمد خاں مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے رہے۔ آدھی رات کے قریب بستر پر لیٹے تو دل کا دورہ پڑا اور آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گئے۔'' فیض صاحب نے اپنے دوست کو خط میں صرف اتنا لکھا۔

''تمہارا فیض یتیم ہو گیا''

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گلچیں میں
ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے
کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحطِ عیش و مسرّت نہ غم کی ارزانی
کنارِ رحمتِ حق میں اسے سُلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنّت کے پھول لاتی ہے

☆......☆......☆

اقبال

فیض صاحب نے علامہ اقبال پر پہلی نظم 1930ء میں لکھی تھی۔ اُس وقت اُن کی عمر صرف بیس سال تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک انعامی مشاعرہ تھا جو علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ فیض صاحب نے جو اُن دنوں طالب علم تھے اس مشاعرہ میں ایک نظم پڑھی اور پہلے انعام کے حقدار ٹھہرے۔ طالب علموں اور کالج کے اساتذہ کی طرف سے اُنہیں خوب خوب داد ملی خاص طور پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے اُن کی بے حد تعریف کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد وطن واپس آئے تو اُن کے اعزاز میں گورنمنٹ کالج میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اس محفل میں حاضرین کے بے پناہ اصرار پر فیض صاحب نے اپنی یہی نظم سنائی۔ علامہ اقبال نے جو کہ فیض صاحب کی طرح خود بھی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور فیض صاحب کے والد کو بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے اُن کی نظم کو بے حد پسند فرمایا۔ یوں بطورِ شاعر یہ فیض صاحب کا علامہ اقبال سے پہلا تعارف تھا۔ اُن کی یہ نظم ان ہی دنوں کالج کے رسالہ ''راوی'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خزاں کا رنگ تھا گلزار ملت کی بہاروں میں
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی
فسردہ مشت خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے

غور طلب بات یہ ہے کہ اس نظم میں فیض صاحب کا اسلوب اور انتخابِ الفاظ بڑی حد تک اقبال سے ملتا جلتا ہے۔ شاید اُنہیں یادوں کا تاثر تھا کہ اقبال کی وفات کے موقع پر فیض صاحب نے انتہائی عقیدت کے ساتھ ایک بار پھر اسی رنگ میں ایک نظم لکھی۔ اُن کے پُرخلوص جذبات اور درد بھرے لہجے کی اثر انگیزی اس نظم کا خاصہ ہے جسے اُردو کے ایک بہت بڑے نقاد نے اقبال پر کی جانے والی شاعری میں پہلا نمبر دیا ہے۔ انگریزی کے معروف کالم نگار خالد حسن نے فیض صاحب کے تصورِ اقبال کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔

"فیض صاحب اقبال کے بہت زبردست معتقد ہیں۔ لیکن زندہ پائندہ اقبال کے۔ اس اقبال کے نہیں جسے قلم فروشوں، بوگس ناقدوں اور خودساختہ نظریہ پرستوں نے ایک قدیم ڈھانچہ میں تبدیل کردیا ہے۔"

اسی بات کی فیض صاحب نے مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا۔

"دورِحاضر کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال ہیں۔ مگر اقبال کے بہت سے مداح انہیں شاعر کہنا ایک معیوب بات سمجھتے ہیں اور انہیں مفکر، فلسفی اور مبلغ کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا دعوی ہے کہ علامہ کی عظمت ان کی شاعری میں نہیں پیام میں ہے۔ ان بزرگوں نے دوسرا مغالطہ یہ پیدا کیا اور برابر اس کا پرچار کرتے رہتے ہیں کہ فکر اور شعر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔"

اُوپر بیان کیے گئے تجزیہ کی روشنی میں اگر غور سے فیض صاحب کی نظم پڑھیں تو بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے خبر

☆......☆......☆

نوحہ

فیض صاحب بنیادی طور پر ایک گھریلو آدمی تھے۔ ماں، باپ، بہنوں اور بھائیوں سے اُن کی چاہت اور عقیدت ان کی خاندانی روایات کے مطابق تھی۔ جیل میں تھے تب بھی ایلس کے نام اپنے خطوں میں انہوں نے بارہا چھوٹے چھوٹے خاندانی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ دُکھ، بیماری، بچوں کی ولادت، شادی بیاہ اور ایسے ہی دیگر گھریلو معاملات۔ یوں تو انہیں اپنے سارے بھائی پیارے تھے مگر طفیل احمد خاں سے خاص نسبت تھی۔ یہ دونوں اوپر نیچے کے بھائی تھے اس لیے بچپن کی ساری شرارتیں، کھیل کود اور ہنسی ٹھٹھے اُن دونوں کی مشترکہ میراث تھے۔

1952ء میں جب فیض صاحب حیدر آباد جیل میں تھے تو اُن کے بھائی طفیل اُن کو ملنے آئے۔ وہ اپنے روحانی پیشوا کی طرف سے فیض صاحب کی رہائی کی خوشخبری بھی لائے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اپنے چھوٹے بھائی سے ملاقات سے پہلے ہی صبح فجر کی نماز کے وقت اُن کو دل کا شدید دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور اس طرح فیض کی ملاقات اپنے بھائی کی میت سے ہوئی۔

اس اندوہناک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فیض صاحب نے ایلس کو اپنے خط میں لکھا۔

> ''آج صبح میرے بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی۔ یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع مجھے دکھانے لے گئے۔ وہ متاع جو اب خاک ہو چکی ہے اور پھر وہ اسے ساتھ لے گئے۔ میں نے اپنے غم کے غرور میں سر اُونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی۔ یہ کتنا مشکل اور کتنا اذیت ناک کام تھا صرف میرا دل جانتا ہے۔''

اپنے اگلے خط میں انہوں نے لکھا۔

> ''اب میں اپنی کوٹھڑی میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں۔ اب مجھے سر اونچا رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس غم کے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں۔ میں اُن کے بیوی بچوں اور ماں کے خیال کو دل سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی ماں کی پہلی اولاد اُن سے چھین لی ہے۔ ہاں میں نے ہی سب کو اُن کی زندگی سے محروم کر دیا ہے۔ اسوقت حواس اسقدر پراگندہ

ہیں کہ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ یہ غم بہت اچانک اور بے سبب لگا ہے لیکن اسے سہنے کا بل مجھ میں ہے اور اس کے سامنے بھی میرا سر نہیں جھکے گا۔ صرف یہ جی چاہتا ہے کہ اسوقت میں باہر ہوتا اور اُن بے چاروں کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے سکتا جن کے تن مجھ سے کم طاقت اور جن کا غم میرے غم سے زیادہ بھاری ہے۔''

اس شدید صدمے پر فیض صاحب تادیر قابو نہ پاسکے۔ طفیل کی موت کا گھاؤ مدتوں اُن کے دل میں ہرا رہا۔ اُن کو تسلی دینے کے لیے دوستوں اور عزیزوں نے بہت تدبیریں کیں مگر اس غم کو بھلانا بہت دشوار تھا۔ ایلس بھی اپنے شوہر کی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے چند دن بعد اُن سے ملنے آئیں۔ جب وہ اُن سے ملاقات کر کے واپس گئیں تو فیض صاحب نے لکھا۔ ''تمہارے آنے کے بعد کچھ تشفی ہوگئی ہے مگر اب بھی کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ طفیل کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے تو دماغ سن سا ہو جاتا ہے اور دل یہ بات کسی طور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔''

اس خط کے ساتھ فیض صاحب نے طفیل کی یاد میں لکھا گیا نوحہ بھی ارسال کیا تھا۔

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گذشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا اور مرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب
کیا کروں بھائی یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمر گذشتہ کی کتاب

☆......☆......☆

جمے گی کیسے بساطِ یاراں

قرۃ العین حیدر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ پاکستان کے مشہور صحافی ایوب احمد کرمانی مرحوم راقم الحروف کے بھائی مصطفےٰ حیدر کے برادرِ نسبتی تھے۔ وہ فیض صاحب کے دوستوں میں تھے اوران کی موت پر انہوں نے ایک انتہائی دلدوز مرثیہ لکھا ہے۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں

ایوب احمد کرمانی ایک جواں سال صحافی تھے۔ اُن کا تعلق ریاست حیدر آباد دکن سے تھا۔ وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، میٹرک کے بعد حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی سے انہوں نے گریجویشن کی۔ زوالِ حیدر آباد کا سانحہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی حکومت کا سلوک ریاست کے لوگوں کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ اس لیے بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ رہے تھے۔ اوائل عمر ہی سے ایوب کرمانی کا رجحان سوشلزم کی طرف تھا چنانچہ ان کی لاہور آمد کے فوراً بعد ہی میاں افتخار الدّین نے انہیں ''امروز'' اخبار میں ملازمت کی پیشکش کی جو اُن دنوں صرف لاہور سے نکلتا تھا۔ لہٰذا وہ لاہور ''امروز'' کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گئے۔ ان دنوں ''امروز'' کی پیشانی پر جن تین مدیران کے نام چھپتے تھے ان میں مولانا چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض کے علاوہ ایوب کرمانی بھی شامل ہو گئے۔ پھر جب ''امروز'' لاہور کے علاوہ کراچی سے شائع ہونے لگا تو ایوب کرمانی اس کے ایڈیٹر ہو کر کراچی آ گئے۔ وہ ایک ذہین اور سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ میں اُن دنوں ریڈیو پاکستان کراچی میں کام کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھی میرے دوست طفیل احمد جمالی کے ساتھ آیا کرتے تھے جو ''امروز'' اخبار میں ایک روزانہ کالم لکھتے تھے۔

آخری زمانے میں اُنہوں نے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور حکومتِ سندھ کے محکمہ اطلاعات مس ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ اُن کے دوستوں کا خیال ہے کہ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کے بعد اُن کی زندگی کا انداز خاصا بدل گیا تھا۔ یہ بھی شنید تھی کہ کسی غیر ملکی لڑکی کے عشق میں ناکامی کے بعد اُنہوں نے پُر اسرار حالات میں خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر قرۃ العین حیدر کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ انہوں نے خاصی تفصیل کے ساتھ ایوب کرمانی کی موت کی کہانی اپنی کتاب ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں قلم بند کی ہے۔ وہ قرۃ العین حیدر کے صحافی دوستوں کے گروپ میں شامل تھے۔ یہ لوگ کراچی میں لنچ کے وقت اکثر کافی ہاؤس میں ملتے تھے جو بندر روڈ پر واقع تھا۔ کافی ہاؤس کے عین سامنے ایک اونچا درخت کھڑا تھا جس کی شاخیں بالائی منزل تک پہنچتی تھیں جہاں رہائشی فلیٹ تھے۔ اس دوپہر یہ دوست کھانا کھا رہے تھے جب کافی ہاؤس کے سامنے والے درخت کی شاخ ٹوٹنے کی چڑچڑاہٹ اور "مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ" کی

آوازیں سنائی دیں۔ یہ سب لوگ ہڑ بڑا کر باہر بھاگے۔ دیکھا ایوب کرمانی خون میں لت پت فٹ پاتھ پر پڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اوپر کی منزل میں کسی سے ملنے گئے تھے اور بالکونی میں کھڑے نیچے جھانک رہے تھے کہ توازن قائم نہ رہ سکا اور گر پڑے۔ گرتے میں درخت کی شاخ پکڑ لی مگر شاخ ٹوٹ گئی اور نیچے آن رہے۔

قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے فیض صاحب کو اُن کی موت سے بے حد صدمہ ہوا۔ یہ خبر سننے کے بعد وہ بالکل چپ ہو گئے۔ پھر بڑی دیر کے بعد بولے ''ہمیں چاہیے تھا ایوب کو پاکستان ٹائمز سے نہ جانے دیتے۔''

ایوب کرمانی بڑے کنبہ پرور انسان تھے۔ وہ کل سات بھائی بہن تھے۔ ان کی بہن بیگم مصطفےٰ حیدر نے بتایا کہ وہ اپنے اہلِ خاندان سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ خاص طور پر اپنی بہنوں سے۔ خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے انہوں نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔ اگرچہ انہیں لاہور شہر بہت پسند تھا مگر بہنوں کی محبت میں انہیں یہ قربانی بھی دینا پڑی کہ اپنے پسندیدہ شہر کو چھوڑ کر کراچی آ گئے۔

''امروز'' سے اپنی وابستگی کے زمانے میں ان کے فیض صاحب سے قریبی تعلقات قائم ہو گئے۔ فیض صاحب اُن کی اہلیت اور قابلیت کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور وہ ان کے قریبی حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ ایوب کرمانی کی موت پر فیض صاحب نے اپنے ساتھی اور ہم خیال صحافی کے لیے یہ اشعار لکھے۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بُجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کُھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بُجھ گئے ہیں

☆......☆......☆

تیرے غم کو جاں کی تلاش تھی

کامریڈ فیروز الدین منصور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے حلقوں کی ایک بے حد قابلِ احترام اور مقبول شخصیت تھے۔ اُن کا نام فیروز الدین تھا، منصور تخلص کرتے تھے اور اپنی بزرگی کی وجہ سے دادا منصور کہلاتے تھے۔

ان کا سراپا بیان کرتے ہوئے اُن کے ایک دوست نے لکھا ہے ''وہ دُبلے پتلے، چھریرے بدن اور درمیانے قد کے گورے چٹے آدمی تھے۔ وہ مزدوروں کے ساتھی، کسانوں کے غم گسار اور طالب علموں کے رفیق تھے۔"

دادا منصور شیخوپورہ کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پورا نام فیروز الدین تھا۔ جب نوجوانی کی منزل میں قدم رکھا تو ہندوستان میں تبدیلی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ رونما ہوا تھا۔ اس واقعہ نے نوجوان منصور کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی ایک ایسی چنگاری پیدا کر دی جو تاحیات آگ کا آلاؤ بن کر بھڑکتی رہی۔ اُنہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ گاؤں گاؤں گھوم کر مظلوم اور محکوم مزدوروں اور کسانوں کے دلوں میں غلامی کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھارنے لگے۔ کالج میں اُنہیں طلبہ یونین کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

دادا منصور کی زندگی کی کہانی بڑی ہیجان انگیز ہے۔ اس کو پڑھ کر وہ ایک طلسماتی داستان کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔

1921ء میں جب ہندوستان میں ترکی کی حمایت میں تحریک ہجرت چلی تو دادا منصور اس میں شامل ہو گئے اور ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان پہنچ گئے۔ وہ وہاں سے ترکی جانا چاہتے تھے مگر سرحدیں بند تھیں۔ مجبوراً اُن کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیدل روس جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے قزاقوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ جرگہ منعقد ہوا جس میں دادا منصور اور ان کے ہمراہ سارے حریت پسندوں کو گولی سے اُڑا دینے کا حکم ہوا۔ مگر بعدازاں ایک بوڑھے قاضی کے دل میں رحم آیا اس نے سزائے موت منسوخ کرا کے اُن سارے لوگوں کو غلام بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بڑا کڑا وقت تھا۔ دادا منصور اور اُن کے ساتھی سارا دن سخت کوشی میں مصروف رہتے۔ آخر کار اُن کی گرفتاری کی اطلاع ماسکو پہنچی اور کامریڈ لینن کی سرخ فوج نے لشکر کشی کر کے اُن حریت پسندوں کو قزاقوں کی قید سے رہائی دلائی۔ آزاد ہونے کے بعد دادا منصور تاشقند چلے گئے جہاں اُنہوں نے ایک فوجی اکادمی میں عسکری تربیت حاصل کی اور تقریباً سال بھر بعد ہندوستان واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔ رہائی کے بعد وہ مدتوں روزگار کی تلاش میں

سرگرداں رہے مگر کمیونسٹ پارٹی سے تعلق کی وجہ سے انہیں کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں اُنہیں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں مگر وہ اپنی پارٹی لائن کی ہدایات پر عمل کرتے رہے۔ 1947ء میں پاکستان قائم ہوا مگر آزادی کے بعد بھی اُن کی مشکلوں میں کمی نہیں آئی۔

کامریڈ منصور جامع الصفات انسان تھے۔ اُنہوں نے ساری زندگی دیانت اور خلوص کے ساتھ اپنی پارٹی کی پالیسیوں کے مطابق ملک وقوم کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک مقتدر سیاسی شخصیت تھے اور کافی عرصہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل بھی رہے۔

فیض صاحب نے ہمیشہ اُن کو بڑی عزت اور احترام سے دیکھا۔ شمیم احمد کی تحریر کے مطابق ان کی موت کے تھوڑے دن بعد فیض صاحب نے پُر زور الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار اس غزل نما مرثیہ میں کیا ہے۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

☆......☆......☆

ختم ہوئی بارشِ سنگ

یہ 61-1960ء کی بات ہے۔ ایک دن اخباروں میں ایک خبر شائع ہوئی جس کے مطابق لاہور کے شاہی قلعہ میں قید حسن ناصر نامی ایک انقلابی لیڈر کو قلعہ کی دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کے دوران پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اگلے روز سرکاری ذرائع نے اس کی تردید کردی اور مقامی اعلامیہ کے مطابق اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں یہ بتایا گیا کہ حسن ناصر کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی تھی۔ کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ اس کا فیصلہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہے

حسن ناصر کون تھا اور لاہور کے شاہی قلعہ میں کیوں نظر بند تھا۔ اُس وقت زیادہ لوگوں کو اس کا علم نہ تھا۔ آج بھی کم ہی لوگوں کو اس کا علم ہے۔

اس کی موت کو زیادہ شہرت تو فیض صاحب کی اس نظم سے ملی جس کا عنوان ہے ''ختم ہوئی بارش سنگ'' جب پہلی بار یہ نظم منظرِ عام پر آئی تو فیض صاحب نے اسے ''اپنا مرثیہ'' قرار دیا تھا مگر بعد میں دیگر حقائق کے آشکار ہونے کے بعد انہوں نے تسلیم کرلیا کہ یہ نظم انہوں نے پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک سرگرم کارکن حسن ناصر کی موت پر لکھی تھی، جو لاہور کے شاہی قلعہ میں مرگیا یا ماردیا گیا۔

یہ جنرل ایوب خان کے مارشل لا کا دور تھا اور ان دنوں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مختلف سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں، صحافیوں اور دانشوروں کو بڑے پیمانے پر گرفتار کیا جارہا تھا۔ ان میں سے بہت سوں کا ٹھکانہ لاہور کے شاہی قلعہ کا عقوبت خانہ ہوتا تھا۔ خود فیض صاحب کو بھی یہاں نظر بند رکھا گیا۔ حسن ناصر کو ایوبی دورِ آمریت کا پہلا انقلابی شہید کہا جاتا ہے۔

حسن ناصر 1928ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ وہ وہاں کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور برصغیر کی ایک معروف علمی اور سیاسی شخصیت نواب محسن الملک کے پڑپوتے تھے۔ نواب گھرانے کے اس نونہال نے حیدرآباد کے اعلیٰ معیاری تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی اور بعدازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیج دیے گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد وہ واپس ریاست حیدرآباد آگئے اور نظام کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ہی ان کی انقلابی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

یہ ہندوستان کی سیاسی اور انقلابی جدوجہد کا ایک بڑا پُر آشوب دور تھا۔ نوجوان حسن ناصر نے اپنی عالی مرتبت خاندانی حیثیت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کچلے اور سسکتے ہوئے عوام کے حقوق کی جدوجہد میں شریک ہونے کو ترجیح دی۔ انہوں نے 1947ء میں حکومت کے خلاف مظاہرہ کرنے والے 25 ہزار طالب علموں کے ایک عظیم الشان جلوس کی قیادت کی اور اس طرح حکومت وقت کی نظروں میں آگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد 1948ء میں انہوں نے حیدرآباد چھوڑ دیا اور کراچی آگئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم

کے لئے انگلستان جانا چاہتے تھے۔ تا کہ اپنے خاندان اور منصب کے مساوی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کراچی میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکنوں سے ملے اور اشتراکیت سے اپنی والہانہ محبت کی بدولت انہوں نے باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

1951ء میں اس وقت کے وزیراعظم کے حکم پر پاکستان کی امریکہ نواز پالیسوں پر احتجاج کرنے کے جرم میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ ایک سال سے زیادہ کراچی جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا سلسلہ پھر شروع کردیا تھا۔ یہاں تک کہ 1954ء میں حکومت نے کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگادی اور حسن ناصر کو ایک بار پھر پس دیوار زنداں جانا پڑا۔ اسی قید کے دوران انہیں جلاوطنی کا حکم ملا اور انہیں ہندوستان بھیج دیا گیا، مگر پُرعزم اور اپنے قول کے دھنی نوجوان انقلابی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوسکی اور وہ سال بھر کے اندر ایک بار پھر ہندوستان سے واپس پاکستان آگئے اور یہاں پارٹی کے ساتھ مل کر ''زیرزمیں'' سرگرمیاں شروع کردیں۔ 1958ء کے مارشل لا کے بعد جب بڑے پیانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو تلنگانہ کا یہ انقلابی بھی سرکار کی گرفت سے محفوظ نہ رہ سکا اور اسے اگست 1960ء میں کراچی سے گرفتار کرکے لاہور کے شاہی قلعہ میں بھیج دیا گیا جہاں بالآخر اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

جن لوگوں نے حسن ناصر کو دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ مردانہ حُسن و وجاہت کا ایک نادر نمونہ تھے۔ چھ فٹ سے اونچا قد، سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، گھنے بال اور تیکھے خدوخال۔ نشست و برخاست میں ایک دلکش انداز خوبصورت آواز مگر سرگوشیوں میں گفتگو کرتے تھے۔ فیض صاحب کے دل میں ان کے لئے بے حد نرم گوشہ تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں حسن ناصر سے انہیں کتنا قرب تھا مگر میں نے جب بھی ان کی زبانی ان کا ذکر سنا وہ بڑی محبت اور عزت سے ان کا نام لیتے۔ اپنے ایک خط میں بھی انہوں نے ان کا ذکر کیا ہے جب فیض صاحب قید کے دوران کراچی کے جناح اسپتال میں علاج کے لئے داخل ہوئے تو حسن ناصر بھی اسی اسپتال میں تھے۔ بہت زیادہ میل ملاقات اور آشنائی نہ ہونے کے باوجود فیض صاحب کو ان کی موت کا بے حد غم تھا۔ یہ دردانگیز اور انتہائی مؤثر اشعار اس بات کے غماز ہیں۔

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقہ دام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہگیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اِک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارو
دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری

آشنا موت جو دشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

فیض صاحب کی دو نظموں کے علاوہ حسن ناصر کے بارے میں تحریری مواد بہت کم ہے۔ ایسے لوگ بھی بہت زیادہ تعداد میں نہیں ہیں جو انہیں جانتے تھے یا ان سے کبھی ملے تھے۔

حسن ناصر نے اپنی زندگی کے آخری دن بہت صعوبتوں میں گزارے۔ جس کال کوٹھری میں اُن کو رکھا گیا تھا اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ وہ چھ فٹ دراز قد جوان پوری طرح کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان کے ایک دوست نے لکھا ہے ''قلعہ کی کوٹھڑی میں وہ کون سا حربہ تھا جو حسن ناصر پر نہیں آزمایا گیا۔ نوکدار سلاخوں کے کچوکے دے دے کر انہیں جاگنے پر مجبور کیا جاتا۔ جلتے ہوئے سگرٹوں سے جسم کو داغا جاتا۔ برف کی سلوں پر ننگے بدن لٹایا جاتا، ہاتھوں اور پاؤں کے ناخنوں کو نوچا جاتا۔ مگر انتہائی گھٹیا اور انسانیت سوز سلوک کے باوجود ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ حسن ناصر پاکستان کی ترقی پسند تحریک کا ایک ایسا روشن ستارہ تھا جو ظلم و جبر کے اندھیروں میں ایک منارۂ نور بن کر ابھرا۔''

اس کی جواں مرگی پر فیض صاحب کا یہ مرثیہ بھی ایسے جذبات کا اظہار ہے جو حسن ناصر سے ان کا درد کا رشتہ سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہُوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سَمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ رفا میرے بعد
دوستو! قافلہ درد کا اب کیا ہوگا
اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہُوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہُوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کُوئے جاناں میں کُھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
''کون ہوتا ہے حریفِ مَے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد''

☆......☆......☆

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ فیض صاحب کی یہ مشہور غزل دراصل میاں افتخار الدین کا مرثیہ ہے۔ میاں صاحب فیض صاحب کے بہت عزیز دوست تھے۔ اُن کی اچانک وفات کا اثر فیض صاحب پر بڑی شدت سے ہوا۔ ایک پُرانے دوست، ہم خیال سیاستداں اور سرپرست کا جُدا ہو جانا ان کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ فیض صاحب اُن دنوں جیل میں تھے۔

میاں افتخار الدین کو پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ وہ مسلم لیگ کے صفِ اول کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے اور اپنے انقلابی اور ترقی پسندانہ خیالات کے سبب دوسرے مسلم لیگی ہم عصروں سے مختلف تھے۔ میاں افتخار الدین کے دیرینہ دوست اور ہندوستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر گجرال نے اُن کی وفات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا ''میاں افتخار الدین اپنے وقت میں بڑے ٹھاٹھ کے انسان تھے۔ آکسفورڈ میں پڑھتے پڑھتے انقلابی بن گئے۔ واپس آ کر پنجاب کانگریس کے صدر بنے۔ جواہر لال نہرو کے ساتھ اُن کا قریبی رشتہ تھا۔ فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور ہم جیسے لوگوں کے ساتھ بھی اُن کے گہرے مراسم تھے۔''

ان کا خاندان لاہور کا پہلا خاندان تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں کانگرس اور بعد ازاں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ وہ ہر دو جماعتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ وزیر بھی بنے اور صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے رُکن بھی منتخب ہوئے۔ مگر اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے زمینداروں اور وڈیروں کی اس پارٹی کے ساتھ زیادہ چل نہ سکے اور اُنہیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ اُس کے بعد 1950ء میں اُنہوں نے اپنے ایک ہم خیال سیاسی دوست سردار شوکت حیات کے ساتھ مل کر ''آزاد پاکستان پارٹی'' بنائی، جو ملک کی دوسری بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرتی رہی۔ اُنہوں نے ''پروگریسو پیپرز لمیٹڈ'' کے نام سے ایک بڑا اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کے زیر انتظام ملک کے مقبول اخبارات ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ''لیل و نہار'' شائع ہوتے تھے۔ ایوب خاں کے مارشل لا کے زمانے میں اُن کے اخبارات کو حکومتی تحویل میں لے لیا گیا۔ میاں صاحب کو اس فیصلے سے بے حد صدمہ ہوا اور وہ مرتے دم تک اس غم سے نجات حاصل نہ کر سکے۔

یوں تو فیض صاحب کے میاں صاحب کے ساتھ ذاتی مراسم بھی تھے مگر اُن تعلقات میں زیادہ گرم جوشی فیض صاحب کی ''پاکستان ٹائمز'' کے ساتھ وابستگی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔

جب فیض صاحب نے فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کا ارادہ کیا اور لاہور واپس آئے تو میاں صاحب اُن دنوں ''پاکستان ٹائمز'' نکالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ فیض صاحب سے ملے اور اُن کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس نئے انگریزی اخبار کے چیف ایڈیٹر بن جائیں۔ فیض صاحب نے بہت انکار کیا کہ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے مگر میاں صاحب اُن کے انکار پر ناراض ہوئے اور اُنہیں سمجھایا کہ ''میں کوئی ایسا بیوقوف اور ناسمجھ انسان ہوں کہ خواہ مخواہ تمہارا نام تجویز کر رہا ہوں اور اگر ناتجربہ کاری ہی دلیل ہے تو پھر فوج کا تجربہ تمہیں کہاں تھا۔''

یوں میاں صاحب نے فیض صاحب کی رضامندی کے بغیر ہی ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ ایک دن اُن کو یہ مژدہ سنایا کہ اُنہوں نے اخبار کے دفتر کے لیے جگہ حاصل کر لی ہے۔ فیض صاحب کے لیے تنخواہ کے علاوہ ایک رہائشی مکان کا بھی انتظام کر لیا ہے۔ ساتھ ہی اُنہیں حکم دیا کہ ''تم باغبانپورہ میں ہماری حویلی میں بچوں کو لیکر آجاؤ۔'' اس طرح فیض صاحب میاں افتخار الدین کے ''زیرِسایہ'' اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ''لیل و نہار'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے اس وقت تک کام کرتے رہے جب تک انہیں راولپنڈی سازش کیس کے جرم میں گرفتار نہ کیا گیا۔ 1955ء میں رہائی کے بعد اُن کو پھر اپنا عہدہ واپس مل گیا اور مارشل لا حکومت کے ''قبضہ'' تک وہ اس پر فائز رہے۔

جیل کے دنوں میں میاں افتخار الدین کبھی کبھی فیض صاحب کو ملنے آیا کرتے تھے۔ اُن سے فیض صاحب کی تھوڑی بہت خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ لیکن ان دنوں فیض صاحب کو اُن سے مل کر کچھ بے چینی سی ہو جاتی تھی کیونکہ میاں صاحب ملک کی ابتر صورتِ حال سے بہت فکرمند رہتے تھے۔ وہ انقلابی اور بائیں بازو کی قوتوں کی کامیابی کی اُمید چھوڑ بیٹھے تھے اور ہمیشہ ایک مایوسی کی کیفیت اُن پر طاری رہتی تھی۔ فیض صاحب کی اس مرثیہ نما غزل میں بھی اس طرف واضح اشارے پائے جاتے ہیں۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

☆......☆......☆

چاند نکلے کسی جانب

ایک بار 1968ء میں مَیں نے فیض صاحب کو تخلیق کے عمل سے گزرتے دیکھا۔ میں اُن دنوں لاہور میں ٹیلی ویژن سے منسلک تھا۔ لاہور شہر اگرچہ میرے لیے نیا تھا مگر جلد ہی وہاں میرے بہت سے دوست بن گئے تھے جس میں ٹیلی ویژن میں کام کرنے والے پروڈیوسرز، فنکار اور لکھنے والے شامل تھے۔ ساتھ ہی ٹیلی ویژن سے باہر میرے دوستوں کا حلقہ تھا۔ ان میں میرے کراچی یونیورسٹی کے ایک قریبی دوست یوسف جمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ اُن دنوں مغربی پاکستان کے وزارتِ تعلیم میں ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ ہم دونوں دوست اکثر شام کو اکٹھے ہوتے تھے۔ بہت سی دیگر عادتوں کے علاوہ ہم میں ایک قدر مشترک یہ بھی تھی کہ دونوں فیض صاحب کے گرویدہ تھے۔ ہمیں فیض صاحب کے شعر سننے کے بعد زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ فیض صاحب کو بھی اس کا علم تھا اور ایک آدھ بار تو یوں بھی ہوتا کہ کسی محفل میں اگر وہ اپنا کلام سناتے ہوئے اگلا مصرع بھول جاتے تو ہماری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کہتے "بھئی آگے کیا ہے۔"

فیض صاحب اُن دنوں کراچی میں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل تھے مگر گاہے گاہے لاہور آتے رہتے تھے۔ یوسف جمال بہت باخبر آدمی تھے لہٰذا جب بھی فیض صاحب کا لاہور میں ورود ہوتا انہیں پتہ چل جاتا۔

ایک روز یوسف جمال کا فون آیا اور اُنہوں نے مجھے بتایا کہ فیض صاحب لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ رات کو اُنہوں نے پاکستان ٹائمز کی یونین کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعرے کی صدارت کرنی ہے۔ لہٰذا میں شام ہوتے ہی فلیٹیز ہوٹل پہنچ گیا۔ فیض صاحب آ چکے تھے اور میرے دوست کے ساتھ ریستوران میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی ساتھ بیٹھ گیا، باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک سے فیض صاحب کے لیے پیغام آیا کہ اُن کے لئے ٹیلی فون ہے۔ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئے تو اس طرح جیسے نیند میں چل رہے ہوں۔ وہ خاموش اور پتھر کی طرح ساکت تھے۔ تھوڑی دیر ہمارے پاس کھڑے رہے اور پھر میز سے اپنے کمرے کی چابی اُٹھا کر چل دیے۔ ہم دونوں حیران پریشان اُن کے پیچھے ہو لیے۔ ہم نے بار بار دریافت کیا کہ کس کا فون تھا؟ آپ ایکدم ایسے چُپ کیوں ہو گئے؟ مگر وہ ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہے تھے۔ دور خلاؤں میں خالی خالی نظروں سے تکتے آہستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلتے گئے۔ وہ زیرِ لب کہہ رہے تھے "آخر یہ کیسے ممکن ہے؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو اُس نے ہاتھ ہلا کر ہمیں الوداع کہا تھا۔" ہم بضد رہے کہ وہ کچھ بتائیں مگر اُن پر تو عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ کمرے میں جا کر وہ بیڈ روم میں چلے گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہم باہر سٹنگ روم میں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ کافی وقت گذر گیا۔ ہماری پریشانی بڑھتی گئی۔ آخر ہمت کر کے ہم نے دروازہ کھولا۔ وہ بستر پر تکیہ میں منہ چھپائے لیٹے تھے۔ اُنہوں نے سر اُٹھا کر دیکھا، اُن کی آنکھیں

سُرخ ہورہی تھیں جیسے روتے رہے ہوں۔ اُنہوں نے دھیرے سے کہا "ہمیں کچھ پینے کے لیے منگوادیں" ہم نے پھر بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ ہم پھر سے انتظار کرنے لگے۔

اب مشاعرہ کے منتظمین بھی آچکے تھے۔ وہ فیض صاحب کو جلد وہاں لے جانا چاہتے تھے۔ آخر ہمت کر کے ہم ایک بار پھر کمرے میں گئے۔ اب اُن کا حال قدرے بہتر تھا۔ ہم نے بتایا کہ مشاعرے والے آپ کو لینے آگئے ہیں۔ اُنہوں نے بڑی بے بسی اور مجبوری کے ساتھ ہماری طرف دیکھا اور کہا ''ہاں بھئی مشاعرہ تو ہے... چلنا ہی پڑے گا..'' راستے میں بھی وہ بار بار زیر لب یہی کہتے رہے ''آخر یہ کیسے ہوگیا؟'' مشاعرہ کے پنڈال میں پہنچ کر استقبال کرنے والے فیض صاحب کو اسٹیج پر لے گئے۔ ہم سامعین کی پہلی صف میں بیٹھ گئے جہاں فیض صاحب کے بہت سے صحافی دوست بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہم سے کہا'' آپ لوگوں کا کمال ہے جو فیض صاحب کو لے آئے ورنہ اس سانحہ کے بعد ہمیں تو بالکل اُمید نہیں تھی کہ وہ آئیں گے؟''

''کیسا سانحہ'' ہم نے دریافت کیا

''آپ کو معلوم نہیں؟ آج شام کراچی میں لیڈی ڈاکٹر شوکت ہارون اچانک دل کا دورہ پڑنے سے وفات پاگئیں..''

اب سب کچھ ہماری سمجھ میں آ گیا۔ فیض صاحب کو ڈاکٹر ہارون سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ وہ اسی سہ پہر کراچی کے ائیر پورٹ پر انہیں چھوڑنے آئی تھیں۔ واپسی پر ان کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

میرا خیال ہے ڈاکٹر شوکت ہارون کے لئے یہ اشعار جو بعد میں مرثیہ کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ انھوں نے اس شام فلیٹیز ہوٹل کے اسی کمرے میں لکھے تھے جہاں اُنہوں نے کئی گھنٹوں کے لیے خود کو تنہا مقید کر لیا تھا۔

چاند نکلے کسی جانب تیری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا
دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا
گرمئ رشک سے ہر انجمنِ گل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا
صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا
ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا
دیدہ و دل کو سنبھالو کہ سرِ شام فراق
ساز و سامان بہم پہنچا ہے رسوائی کا

☆......☆......☆

سجاد ظہیر کے نام

سجاد ظہیر سے فیض صاحب کی پہلی ملاقات صاحبزادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر پر امرتسر میں ہوئی تھی۔ صاحبزادہ صاحب ایم اے او کالج میں وائس پرنسپل تھے اور فیض صاحب نئے نئے لاہور سے اسی کالج میں لیکچرار ہو کر آئے تھے۔ سجاد ظہیر جنہیں اُن کے قریبی حلقوں میں ''بنے بھائی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا اُن دنوں برصغیر میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھے۔ وہ اس غرض سے ہندوستان کے سارے بڑے شہروں میں گھوم کر انجمن کی بنیادیں اُستوار کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں اپنے اُن دو عزیز دوستوں سے ملنے اور صلاح مشورہ کرنے کے لیے وہ پنجاب آئے۔ اُن کی اصل منزل لاہور تھی جو ملک کے نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا گڑھ تھا۔

فیض صاحب طبعاً شرمیلے اور کم گو آدمی تھے اس لیے کالج میں بھی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ بہت کم لوگوں سے اُن کا ملنا جلنا تھا۔ صرف صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں کا گھر تھا جہاں وہ کبھی کبھی جاتے رہتے تھے۔ اُن دونوں دانشوروں نے نوجوان لیکچرار کے ٹیلنٹ کو کچھ کچھ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اُنہی کے توسط سے فیض صاحب کا سجاد ظہیر سے تعارف ہوا جو آنے والے زمانوں میں دوستی کے بہت قریبی رشتے میں تبدیل ہو گیا۔

لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرنے کا ذکر کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں فیض صاحب کا ذکر اس طرح کیا ہے ''قبل اس کے کہ ہم لاہور جائیں ہمیں غیر متوقع غیبی مدد ملی۔ امرتسر میں میرے دو دن قیام کے بعد ایک روز رشیدہ نے یکبارگی کہا ''محمود وہ تمہارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟'' اور پھر میری طرف مڑ کر کہا ''تم ذرا اس سے بھی مل لو'' محمود بہت سنجیدگی سے انگریزی میں بولے۔ ''تمہارا مطلب ہمارے انگریزی کے لیکچرار فیض احمد سے ہے؟''

سجاد ظہیر مزید لکھتے ہیں ''فیض کی رازداری کا کمال یہ تھا کہ اس وقت تک محمود اور رشیدہ کو اس کا بالکل علم نہ تھا کہ فیض شاعر بھی ہیں اور اُن میں کچھ ترقی پسندی کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔'' بنے بھائی فیض سے ملے اور یوں اس دوستی کا آغاز ہوا جو زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رہی۔

سجاد ظہیر لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے آکسفورڈ سے بی اے پاس کرنے کے بعد بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ اُن کے والد جو لکھنؤ چیف کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ چاہتے تھے کہ بیٹا وکالت میں نام پیدا کرے مگر سجاد ظہیر کو قانون کے پیشہ سے کوئی

فیض صاحب اور سجاد ظہیر

دلچسپی نہ تھی۔ اُن کا طبعی میلان شعروادب کی طرف تھا۔ وہ بڑے انقلابی خیالات کے مالک تھے اور آکسفورڈ میں طالب علمی کے زمانے ہی سے کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔

1939ء میں جب سامراجی جنگ چھڑی اور وطن پرستوں اور ترقی پسندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو سجاد ظہیر بھی گرفتار کر لیے گئے اور 1941ء تک جیل میں رہے۔ آزادی کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ سجاد ظہیر پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل چنے گئے اور اس وقت تک اس عہدے پر قائم رہے جب تک پارٹی کو خلافِ قانون قرار نہ دے دیا گیا۔

اپریل 1951ء میں وہ راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیے گئے اور کم و بیش چار برس اسیر رہے۔ فیض صاحب کی دوستی اور اُن کا ساتھ جیل کے دنوں میں بھی رہا۔ سجاد ظہیر ادبی حلقوں کی ایک معتبر شخصیت سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے افسانے، مضامین اور ڈرامے لکھے۔ شاعری بھی کی اور تنقید نگاری بھی۔ اُردو کے سارے شاعر اور ادیب ان کے شناسا تھے مگر وہ فیض صاحب کو اُن میں سب سے بلند مقام دیتے تھے۔ وہ بھی فیض صاحب کی نظر میں بحیثیت دانشور اور کامریڈ ایک عظیم انسان تھے۔

ستمبر 1973ء میں ماسکو میں ان کے انتقال کے بعد فیض صاحب ان کی میت لے کر دہلی گئے۔ یہیں سے ان کا جنازہ اٹھا۔ ہندوستان کے سب اخباروں میں سجاد ظہیر کی موت پر بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ ساتھ ہی فیض صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ان کی نظم "جام الوداع" کی نقل بھی۔ کسی نے اس موقع پر خوب لکھا کہ اس نظم میں فیض نے نہ صرف اپنے عزیز دوست کو بلکہ اپنی زندگی کے ایک پورے حصّہ کو بھی الوداع کہا ہے۔

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے

نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے

حدیثِ دلبراں باہم کریں گے

نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے

نہ لیلائے سخن کی دوست داری

نہ غم ہائے وطن پر اشکباری

سُنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر

نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں،

بیادِ مستیِ چشمِ غزالاں

بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایّامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلّم
سحر اور اس کا آغازِ تبسّم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحرگہ اب اُسی کے نام ساقی
کریں اِتمامِ دَورِ جام ساقی
بساطِ بادہ و مینا اُٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامُ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

☆......☆......☆

مخدوم کی یاد میں

مخدوم محی الدین فیض صاحب کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اپنے ہم عصر شعراء میں فیض صاحب اُن کو بہت بلند مقام دیتے تھے اور اُن کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ اگرچہ دونوں کے رنگ جدا تھے مگر مقاصد مشترک تھے۔ فیض صاحب اور مخدوم دونوں کمیونسٹ فلسفہ کے قائل تھے۔

مخدوم محی الدین کا پورا نام ابو سعید محمد مخدوم محی الدین تھا۔ اُن کا تعلق ہندوستان کی ریاست حیدر آباد دکن سے تھا۔ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے اور تقریباً پوری زندگی مفلسی میں بسر کی۔ اُن کے پاس نہ رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ تھا نہ کھانے پینے کو کوئی مناسب انتظام۔ اُنہوں نے بڑی دیر اخبار فروخت کر کے روزی کمائی۔ اُن کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے تھا۔

مرزا ظفر الحسن جنہوں نے فیض صاحب پر تحقیقی کام کیا ہے اور جن کا تعلق خود بھی حیدر آباد دکن سے تھا، بڑے دلچسپ انداز میں اپنی تصنیف ''عمر گذشتہ کی کتاب'' میں اپنے عہد کے اُن عظیم شاعروں کی زندگی اور فن میں مماثلت کے پہلو بیان کئے ہیں۔ اُنہوں نے ان کا موزانہ اس طرح کیا ہے۔

''فیض نے ایک سے زیادہ ڈگریاں حاصل کیں۔ مخدوم بی اے سے آگے نہ بڑھ سکے۔''

''دونوں محفل پرست تھے۔ مگر دونوں کے کالج کے زمانے کے دوستوں میں بڑا فرق ہے فیض کے دوستوں میں ن م راشد کے علاوہ ادب کی دنیا کا کوئی بھی بڑا نام نہیں ہے مگر مخدوم کے احباب میں میر حسن، سکندر علی وجد، اشفاق حسین اور میکش حیدر آبادی وغیرہ شامل ہیں۔''

''مخدوم نے طالب علمی کے زمانے میں نہ تو اسکرپٹ لکھے اور نہ طلباء کو پڑھایا۔ جب کہ فیض نے یہ دونوں کام کیے۔''

مرزا ظفر الحسن نے مخدوم کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ''مخدوم ہمیشہ کا دل لگی باز، چرب زبان، محفل پرست، یار باش اور جواں دل تھا۔ اس کے زیادہ تر ساتھی موسیقی کے رسیا تھے مگر اس کو موسیقی سے کبھی لگاؤ نہیں رہا حالانکہ اس کی آواز اتنی خوبصورت تھی کہ جب وہ لہک لہک کر پڑھتا۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

تو سامعین جھوم جھوم جاتے۔

مخدوم محی الدین دکن کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک اہم رکن تھے اور ساری عمر اس کی سزا بھگتتے رہے۔ وہ ریاست کے مختلف قید خانوں میں بند رہے۔ بغاوت ہمیشہ اُن کے مزاج کا حصہ رہی اور اپنے اسی رویہ کی پاداش میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ اُن کی عمر کا بہت بڑا حصہ خانہ بدوشی میں گزرا۔

اشتراکیت سے اُن کی دلچسپی کے سلسلہ میں ان پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ انہیں یہ دلچسپی کیوں پیدا ہوئی البتہ اُن کے قریبی دوست سبط حسن کا کہنا ہے۔ شہر میں حیدر بک ڈپو کے نام سے ایک شاندار دوکان تھی۔ جہاں ہر قسم کی کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ مارکس، اینگلز، لنین اور دوسرے اشتراکی مصنفوں کی کتابیں۔ مخدوم اسی دوکان سے کتابیں حاصل کرتے تھے۔

''فیض کی اُن سے قربت کی وجہ ایک تو سوشلزم سے اُن کی Commitment اور دوسرے اُن کی نہایت معیاری شاعری تھی۔ فیض صاحب کو احساس تھا کہ جو اندازِ فکر مخدوم کی سیاسی زندگی میں جھلکتا ہے اسی اندازِ فکر نے اُن کی شاعری کو بھی ایک نیا لہجہ دیا ہے۔

نکہت یار سے آباد ہے ہر کنج قفس
مل کے آئی ہے صبا اس گلِ تر سے پہلے

****

رات بھر دیدۂ نمناک لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

****

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

ایسے معیاری شعر کہنے والا اگر فیض کا دوست نہ ہوتا تو پھر کس کا دوست ہوتا۔ یہی محبت تھی جس کی بنا پر 1978ء میں ان کی وفات پر فیض صاحب نے مخدوم کی یاد میں دو غزلیں لکھیں۔ اُن دنوں وہ ماسکو میں تھے۔

''آپ کی یاد آتی رہی رات بھر''
چاندنی دل دُکھاتی رہی رات بھر
گاہ جلتی ہوئی، گاہ بجھتی ہوئی
شمع غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیراہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر
پھر صبا سایۂ شاخِ گل کے تلے
کوئی قِصّہ سناتی رہی رات بھر
جو نہ آیا اُسے کوئی زنجیرِ در
ہر صدا پر بُلاتی رہی رات بھر
ایک اُمید سے دل بہلتا رہا
اِک تمنّا ستاتی رہی رات بھر

اور فیض کی یہ غزل جو انہوں نے مخدوم کے لئے مخدوم کے انداز میں لکھی تھی

''اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب''

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پُھوٹی تو وہ پہلو سے اُٹھا آخرِ شب
وہ جو اِک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب
لمسِ جانانہ لیے، مستیِ پیمانہ لیے
حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب
گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
''اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب''

☆......☆......☆

میجر اسحاق کی یاد میں

میجر اسحاق نے ایک طویل عرصہ جیل میں فیض صاحب کے ساتھ گزارا۔ وہ حیدر آباد، ساہیوال اور لاہور کی جیلوں میں ان کے ساتھ رہے۔ انہیں سازش کیس کے دوسرے قیدیوں کی نسبت فیض صاحب کا ساتھ زیادہ نصیب ہوا۔ کچھ ان کی محبت اور خلوص اور کچھ فیض صاحب کی شفقت۔ میجر اسحاق ایک طرح سے فیض صاحب کے چیف آف اسٹاف یا پرائیوٹ سیکریٹری بن گئے۔ ان کی ساری ذمہ داریاں میجر اسحاق نے اپنے ذمہ لے لیں۔ اُٹھنا بیٹھنا، ورزش، کھیل کود، خورد ونوش، باغبانی اور سب سے بڑھ کر ان کی شعر گوئی۔ میجر اسحاق نے کمال مہارت سے حیدر آباد جیل میں اپنی یہ ذمہ داریاں نبھائیں۔ انہیں فیض صاحب کے موڈ سے بھی واقفیت ہوگئی اور اُن کی عادتوں سے بھی۔ جیل کے احاطے میں ہونے والی ساری سرگرمیوں کا انتظام وانصرام میجر صاحب نے سنبھالا ہوا تھا۔

بقول اُن کے مرزا سودا کے غنچے کی طرح فیض صاحب کی بیاض برداری کا کام بھی ان کے ذمہ تھا۔ جب فیض صاحب محفل مشاعرہ میں شرکت کے لئے آتے تو وہ ان کی نوٹ بک اُٹھائے پیچھے پیچھے ہوتے۔ دوسرے ساتھی جب ان کو اس طرح چلتا دیکھتے تو چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس لیے کہ جیل میں فیض صاحب کے تازہ کلام کا ورودِ مسعود جشن سے کم نہیں ہوتا تھا اور پھر جس طرح سے میجر اسحاق چلتے تھے وہ بھی خوش طبعی کی ایک اچھی خاصی مزاحیہ صورت ہوتی تھی۔ فیض صاحب خراماں خراماں مسکراتے ہوئے کچھ گھبرائے گھبرائے کچھ شرمائے شرمائے اور اُن کے پیچھے میجر صاحب ایک لٹھ بند جاٹ کی طرح گردن اکڑائے۔

حیدر آباد جیل میں میجر اسحاق فیض صاحب کے ملحقہ کمرے میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ اُن کے سب موڈوں سے واقف ہوگئے تھے۔ میجر اسحاق کا کہنا ہے ''جب شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو فیض صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ اٹھتے بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتے۔ ہم بھانپ لیتے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں ان کے نواح میں شور وغوغا و دنگا فساد لڑائی جھگڑا حتی الامکان بند کر دیا جاتا تھا۔ فیض صاحب نے بہت نازک طبع پائی تھی۔''

ان سے اپنی اسی قربت کے سبب فیض صاحب نے میجر اسحاق کی وفات پر ایک مرثیہ نما نظم لکھی:

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمانِ وفا اور

میجر اسحاق کے حالات زندگی ان کے ایک دوست کامریڈ دیدار نے پنجابی زبان میں لکھے ہیں۔ ان کوائف کے مطابق وہ 1921ء میں جالندھر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے خاندان کے بیشتر لوگ بالکل سیدھے سادھے، غیر تعلیم یافتہ اور غریب تھے۔ کھیتی باڑی ان کا آبائی پیشہ تھا۔ اسحاق کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا لہٰذا میٹرک کے بعد انہوں نے جالندھر سے ایف اے کیا اور پھر ایم اے او کالج امرتسر میں داخلہ لے لیا۔ یہاں فیض صاحب ان دنوں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ لیکن استاد شاگرد کے علاوہ فیض صاحب

سے ان کا ایک اور رشتہ بھی اُستوار ہوگیا۔ وہ دونوں کا مرید بن گئے اور مارکسزم کا مطالعہ کرنے لگے۔ بی اے کرنے کے بعد محمد اسحاق فوج میں بھرتی ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کشمیر کی جنگ میں میجر جنرل اکبر کے ساتھ شامل رہے۔ پھر انہی کے ساتھ 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد انہوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اپنی ان سرگرمیوں کی وجہ سے انہیں بار بار جیل جانا پڑا۔

فیض صاحب نے اپنے ساتھی میجر اسحاق کی وفات پر ان کی یاد میں بہت محبت سے ایک نظم لکھی۔ اس کے علاوہ ایک مضمون بھی جس میں انہوں نے لکھا ''میجر اسحاق ایک بہت سادہ اور خاموش طبیعت انسان تھے لیکن بہت ذہین اور محنتی۔ وہ گاؤں سے ایم اے او کالج امرتسر پڑھنے آئے تھے۔ تب سے اب تک کتنے زمانے بدلے اور میں نے اسحاق کو کس کس رنگ میں نہیں دیکھا۔ اس چالیس برس سے اوپر کے طویل اور مسلسل جہاد میں کتنے محاذوں پر معرکہ آرائی کی نوبت آئی۔ کتنے تلخ امتحانوں سے گزرنا پڑا۔ کتنے آلام و مصائب کا سامنا ہوا لیکن میجر اسحاق جیسے گنتی ہی کے لوگ ہوں گے جن کے نہ کبھی قدم لڑکھڑائے نہ ایمان اور یقین میں فرق آیا نہ ہمت اور حوصلے میں کمی واقع ہوئی''

فیض صاحب کے مجموعہ ''زندان نامہ'' کا دیباچہ میجر اسحاق نے لکھا ہے۔

''میں کچھ مہینے کم چار سال فیض صاحب کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی احاطے میں ملحقہ کوٹھڑیوں میں گزارا ہے۔ سینکڑوں مرتبہ صبح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں۔ اپنی خوشیاں اور اپنا غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے۔ جیل کے باہر آدمی کا مختلف مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کنی کترا کے نکل سکتا ہے کسی سے محبت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے۔ جیل میں آدمی کی اپنی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے۔ مجھے اس چھوٹی سی دنیا میں فیض صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال رہنے کا موقع ملا ہے۔''

میجر اسحاق کی موت پر یہ اشعار فیض صاحب نے جون 1982ء میں لکھے جب وہ بیروت میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے اپنے عزیز دوست کو خراج پیش کرنے کے لیے غالب کی زمین منتخب کی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ فیض صاحب کی نگاہوں میں اُن کا مرتبہ کتنا بلند تھا۔

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمانِ وفا اور
یہ عہد کہ تا عمرِ رواں ساتھ رہو گے
رستے میں بچھڑ جائیں گے جب اہلِ صفا اور
ہم سمجھے تھے صیّاد کا ترکش ہُوا خالی
باقی تھا مگر اس میں ابھی تیرِ قضا اور
ہر خار رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور
آنے میں تامّل تھا اگر روزِ جزا کو
اچھا تھا ٹھہر جاتے اگر تم بھی ذرا اور

☆......☆......☆

پھولوں کی بارات

فلمی گیت

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو
تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات

منزلیں منزلیں

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری

ہم تیرے پاس آئے

منزلیں منزلیں

وہ ایک بہت بارونق شام تھی۔ راولپنڈی میں مری روڈ پر واقع شبستان سینما کو بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا۔ کشادہ صحن میں چاروں طرف قناتیں لگی تھیں اور رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سینما کی عمارت کی بیرونی دیواروں، دروازوں اور کھڑکیوں کو چھوٹے چھوٹے رنگین بلبوں سے مزین کیا گیا تھا۔

موسم بھی شام کی مناسبت سے بہت خوشگوار تھا۔ سینما کے اندر اور باہر بڑی گہما گہمی تھی۔ جھلملاتی پوشاکوں میں ملبوس آرمی بینڈ والے، باوردی پولیس کے سپاہی اور سادہ کپڑوں میں ایجنسیوں کے کارکن ہر طرف ایستادہ تھے۔ مہمانوں کی ریل پیل تھی۔ صدر پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان کی آمد آمد تھی۔ اُن کے استقبال کے لیے اعلیٰ فوجی افسر، سینئر سرکاری ملازمین، عمائدین شہر اور فنکاروں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی بھیڑ تھی۔ یہ سب لوگ پاکستان ایئر فورس کی سرپرستی میں بنائی جانے والی فیچر فلم ''قسم اُس وقت کی'' کی رسم افتتاح کے لیے جمع ہوئے تھے۔ لاہور سے فلم انڈسٹری کی بہت سی اہم شخصیات بھی اس تقریب میں شرکت کے لیے آئی تھیں۔ اُن میں فلم پروڈیوسرز، اسٹوڈیو کے مالکان، ہدایت کار، فلمسٹار، موسیقار اور گلوکار غرض سب ہی شامل تھے۔

یہ 1969ء کا زمانہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے حالات دگرگوں تھے اور پاکستان اور ہندوستان کے آسمانوں پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ پاکستان ائرفورس والوں نے اپنے جانبازوں کے حوصلے بلند کرنے کی غرض سے اس فیچر فلم کا منصوبہ بنایا تھا، جس کا اسکرین پلے پروفیسر احمد علی نے لکھا تھا۔ ہدایت کار اے جے کاردار تھے اور گیت نگار فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی اور فیاض ہاشمی۔ فنکاروں میں شبنم، طارق عزیز، روزینہ، سورن لتا اور مینا شوری شامل تھے۔

اس فلم کی کہانی ایئرفورس کے ایک پائلٹ کے گرد گھومتی تھی جسے دُشمن گرفتار کر لیتے ہیں۔ بہادر اور حوصلہ مند پائلٹ قید سے فرار ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور آخر کار کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر جب وہ اپنا جہاز اُڑاتا ہوا وطن واپس لوٹ رہا ہوتا ہے تو جہاز کریش ہو جاتا ہے اور پائلٹ شہید ہو جاتا ہے۔ فلم میں مرکزی کردار پاکستان ٹیلی ویژن کے جانے پہچانے اناؤنسر طارق عزیز نے ادا کیا تھا۔

جنرل یحییٰ خان صدر پاکستان کی آمد پر سارے مہمانانِ گرامی سینما کے کاری ڈور میں قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے اور جب یحییٰ خان جھومتے جھامتے خوش و خرم تشریف لائے تو سب نے تالیاں بجا کر اُن کا استقبال کیا۔ وہ قطار میں کھڑے عمائدین اور فلمسٹارز

سے ایک ایک کر کے مصافحہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک عجب مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ جب بینا شوری نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اُنہوں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سب حاضرین خاموش کھڑے تھے مگر اُن میں سے کسی میں بھی بینا شوری کا ہاتھ چھڑانے کی ہمت نہ تھی۔ یہ یحییٰ خان کا زمانہ تھا۔

فلم شروع ہوئی جو اگرچہ واجبی سی تھی مگر ائیر فورس کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ فیض صاحب کی غزل ''سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں'' بہت ہٹ ہوئی۔ فلم میں یہ غزل ایک محفلِ موسیقی میں گائی گئی تھی جو ائیر فورس کے آفیسرز میس میں منعقد ہوتی ہے۔ یہ منظر بنفسِ نفیس فریدہ خانم پر فلمایا گیا تھا۔ تماشبین غزل سُن کر جھوم جھوم گئے اور جب گلوکارہ اس شعر پر پہنچی تو جیسے قیامت آگئی۔

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

شائقین تالیاں بجا بجا کر اور واہ واہ کرتے ہوئے داد دے رہے تھے۔ پھر میں نے اچانک محسوس کیا کہ نشستوں پر بیٹھے ہوئے سارے لوگ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی مڑا تو میں نے دیکھا خصوصی باکس میں صدر پاکستان مست ہو کر بے تحاشا ناچ رہے ہیں۔

یہ اس فلم کی افتتاحی تقریب تھی۔ فلم میں فیض صاحب کے لکھے ہوئے اور نغمے بھی تھے جن میں سے یہ ایک گیت ہے جسے فیض صاحب نے اپنے دیوان میں شامل کیا ہے۔ ''منزلیں منزلیں''

ویسے اس فلم کا تھیم سونگ جوش ملیح آبادی کا لکھا ہوا تھا اور اسی سے فلم کا ٹائٹل لیا گیا تھا۔ ''قسم اُس وقت کی جب زندگی کروٹ بدلتی ہے۔''

فلم ہر لحاظ سے کمزور تھی اور بڑی بُری طرح ناکام ہوئی اس پر طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ ائیر فورس کے نئے چیف نے جب یہ فلم دیکھی تو وہ بے حد خفا ہوئے اور فلم کو بین کر دیا۔ اُن کو اعتراض تھا کہ فلم میں پائلٹ کا کردار کرنے والے ہیرو کی قلمیں پُرانے زمانے کے نوابوں کی طرح تھیں اور اُن کے سر کے بال لمبے لمبے تھے جو ائیر فورس کے قانون کے سراسر منافی تھا۔

منزلیں، منزلیں،
شوقِ دیدار کی منزلیں،
حُسنِ دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں،
پیار کی بے پندرات کی منزلیں،
کہکشاؤں کی بارات کی منزلیں،
سربلندی کی ہمت کی، پرواز کی
جوشِ پرواز کی منزلیں،

راز کی منزلیں،
زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
ہر بلندی کی ہمّت کی، پرواز کی منزلیں،
جوشِ پرواز کی منزلیں،
راز کی منزلیں،
آن ملنے کے دن
پھول کھلنے کے دن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں،
چاہ کی منزلیں
آس کی، پیاس کی،
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں،
منزلیں حُسنِ عالم کے گلزار کی
منزلیں، منزلیں،
موج در موج ڈھلتی ہُوئی رات کے درد کی منزلیں
چاند تاروں کے ویران سنسار کی منزلیں،
اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
حق کے عرفان کی
نورِ انوار کی منزلیں،
وصلِ دلدار کی منزلیں،
قول و اقرار کی منزلیں،
منزلیں، منزلیں

☆......☆......☆

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری

''جاگو ہوا سویرا'' مشرقی پاکستان میں بننے والی پہلی اردو فلم تھی۔ اس کی کہانی فیض صاحب نے لکھی تھی۔ اس کے ہدایتکار اے جے کاردار تھے اور عکاسی انگلستان کے ایک نامور کیمرہ مین واٹر لیزلی (Water Lazalie) نے کی تھی۔ یہ فلم 1959ء میں بنائی گئی اور باکس آفس پر بری طرح ناکام ہوئی۔ یہ ایک آرٹ فلم تھی۔ اس کو بین الاقوامی فلم فیسٹول میں نمائش کے لئے منتخب کیا گیا مگر پاکستان میں اس وقت کے وزیر اطلاعات نے اس کی نمائش پر پابندی لگا دی کہ اس سے اشتراکیت کی بو آتی ہے۔ اسی دوران امریکہ اور چیکوسلوواکیہ کے فلم فیسٹیولز میں اس کو ایوارڈز سے نوازا گیا۔

فلم بنگال کے ساحلی علاقے میں رہنے والے مچھیروں کی زندگی پر مبنی تھی۔ یہ مفلس و نادار مچھیرے جنہیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی کسقدر تنگدستی اور مصیبت کی زندگی گزارتے ہیں اور ہمارے معاشرے کے متمول طبقے کی کیسی کیسی زیادتیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی اس خوبصورت فلم کی کہانی کا محور ہے۔ ساری زندگی بھوک اور بیماری کے عذاب میں گزارنے والے یہ محنتی اور جفاکش لوگ جس حال میں رہتے ہیں، اس کی حقیقی عکاسی فلم میں پُر زور انداز میں کی گئی تھی۔ اس کا سارا کریڈٹ فلم کے کیمرہ مین کو جاتا ہے۔ غربت اور غلاظت کے دلدوز مناظر جس مہارت سے فلمائے گئے تھے وہ انتہائی اثر انگیز تھے۔ ''جاگو ہوا سویرا'' کی کہانی معروف بنگالی ناول نگار مانک مکرجی کے ناول پر مبنی تھی اور اس کی ساری شوٹنگ میگھنا دریا کے کنارے نارائین گنج سے تقریباً 20 میل کے فاصلے پر ''شت نال'' نامی گاؤں میں کی گئی تھی۔

فیض صاحب نے جس لگن اور ذوق وشوق سے یہ فلم بنائی اس کی ناکامی پر وہ خاصہ دلبرداشتہ ہوئے لیکن اُنہیں پہلے ہی سے اس کا احساس بھی تھا کہ ہمارے جیسے ملک میں آرٹ فلموں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا جو سلوک اس فلم کے ساتھ ہوا وہی ہونا تھا۔

فلم بلیک اینڈ وائٹ ہے مگر ایک منظر جس میں رقاصہ رخشی کا ناچ دکھایا گیا ہے، رنگین ہے۔ یہ منظر اس طرح فلمایا گیا ہے کہ ایک عالیشان حویلی کے بڑے کمرے میں رقص وسرود کی محفل برپا ہے جہاں دولت مند زمیندار، صنعت کار، بڑے افسر اور بدچلن سیاستدان دادِ عیش دے رہے ہیں، کمرے کا دروازہ بند ہے۔ غریب اور وفادار ملازم حویلی سے باہر نیم تاریکی میں کھڑے یہ آوازیں سن رہے ہیں۔ کیمرہ مین نے کمال مہارت سے رقص کے مناظر شوٹ کیے ہیں، جو ایک طرح سے ''رنگین'' اور ''بلیک اینڈ وائٹ'' کے

تضاد سے امارت اور غربت کا فرق بھی ظاہر کرتے ہیں۔

موسیقی کے لحاظ سے فلم کو کافی پسند کیا گیا۔ خاص طور پر فیض صاحب کے لکھے ہوئے نغمات جن میں ان کی یہ مشہور نظم بھی شامل تھی جسے اقبال بانو نے اپنی سُریلی آواز میں گا کر سننے والوں کے دلوں پر جادو کر دیا۔

شیشیوں کا مسیحا کوئی نہیں جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

فلم کی موسیقی مشرقی پاکستان کے معروف موسیقار تمر برن نے تشکیل دی تھی۔

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو
تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
کب سے آس لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تم آؤ تو من میں اُترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات

☆......☆......☆

ہم تیرے پاس آئے

فیض صاحب کوفلم سازی سے جذباتی حدتک دلچسپی تھی۔ فلم ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ بولتے کم اور سوچتے زیادہ تھے۔ اُن کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد بھی فلمی صنعت سے وابستہ تھی۔ ان میں خواجہ خورشید انور، رفیق غزنوی، ڈبلیوزیڈ احمد، اے جے کاردار، فرید احمد، ضیاء محی الدین، مسعود پرویز کے علاوہ بیرونی ملکوں خصوصاًروس کے بہت سے نامور فلمساز شامل تھے۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے فیض صاحب نے کئی چھوٹی بڑی فلمیں بنائیں اور چند ایک فلموں کے اسکرپٹ اور گیت لکھے۔ جس فلم نے انہیں سب سے زیادہ پریشان کیا اور جو بہت دکھ کا باعث ہوئی اُس کا نام تھا ''دور ہے سکھ کا گاؤں''۔

1972ء میں ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد ''نیف ڈیک'' کے نام سے فلموں کے فروغ کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے سے فیض صاحب کے بہت سے دوست اور جاننے والے منسلک ہوگئے۔ فیض صاحب نے اپنے انہی احباب کے توسط سے ایک بار پھر اپنی فلم سازی کی ''ٹھرک'' پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ نیف ڈیک کے ساتھ تین فلمیں پروڈیوس کرنے کا معاہدہ ہوا جس میں پہلی فلم تھی ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' اور انگریزی میں اس کا عنوان Of Human Happines تھا۔ فیض صاحب نے فلم کی ہدایت کاری کے لیے اپنے پُرانے دوست اے جے کاردار کو منتخب کیا جو اس سے پہلے بھی اُن کے ساتھ فلمیں بنا چکے تھے۔

اس فلم کو بنانے میں جو مسائل پیدا ہوئے اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہ قصہ اس قدر دلگیر ہے کہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ فیض صاحب جیسے نیک سیرت اور درویش صفت انسان کے ساتھ بھی کوئی ایسا کر سکتا ہے جو اُن کے اپنے پروردہ اے جے کاردار نے کیا۔ فلم تعطل کا شکار ہوگئی اور اے جے کاردار اس کے پرنٹ لیکر انگلستان بھاگ گئے اور چلتے چلتے فیض صاحب کو مارشل لا انکوائریوں اور مقدموں میں پھنسوا گئے۔ اس سلسلہ میں فیض صاحب کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور بلا کسی قصور کے عدالت میں اُن پر نامناسب الزامات اور تہمتیں لگائی جاتی رہیں۔ اس فلم کے معاملات نے اُن کی زندگی کو تلخ بنا دیا اور وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوگئے۔

1980ء میں جب پاکستان ٹیلی وژن سے تبادلہ کے بعد مجھے نیف ڈیک کا سربراہ نامزد کیا گیا تو فیض صاحب ملک سے باہر تھے۔ اُنہوں نے نیف ڈیک کا چارج سنبھالنے کے چند ہی روز بعد مجھے بیروت سے ایک خط لکھا۔ اُس خط کا اقتباس پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسقدر ملول اور پریشان تھے۔ اُنہوں نے لکھا ''یہاں ''جنگ'' اخبار میں دیکھا کہ NAFDEC کی نمبرداری
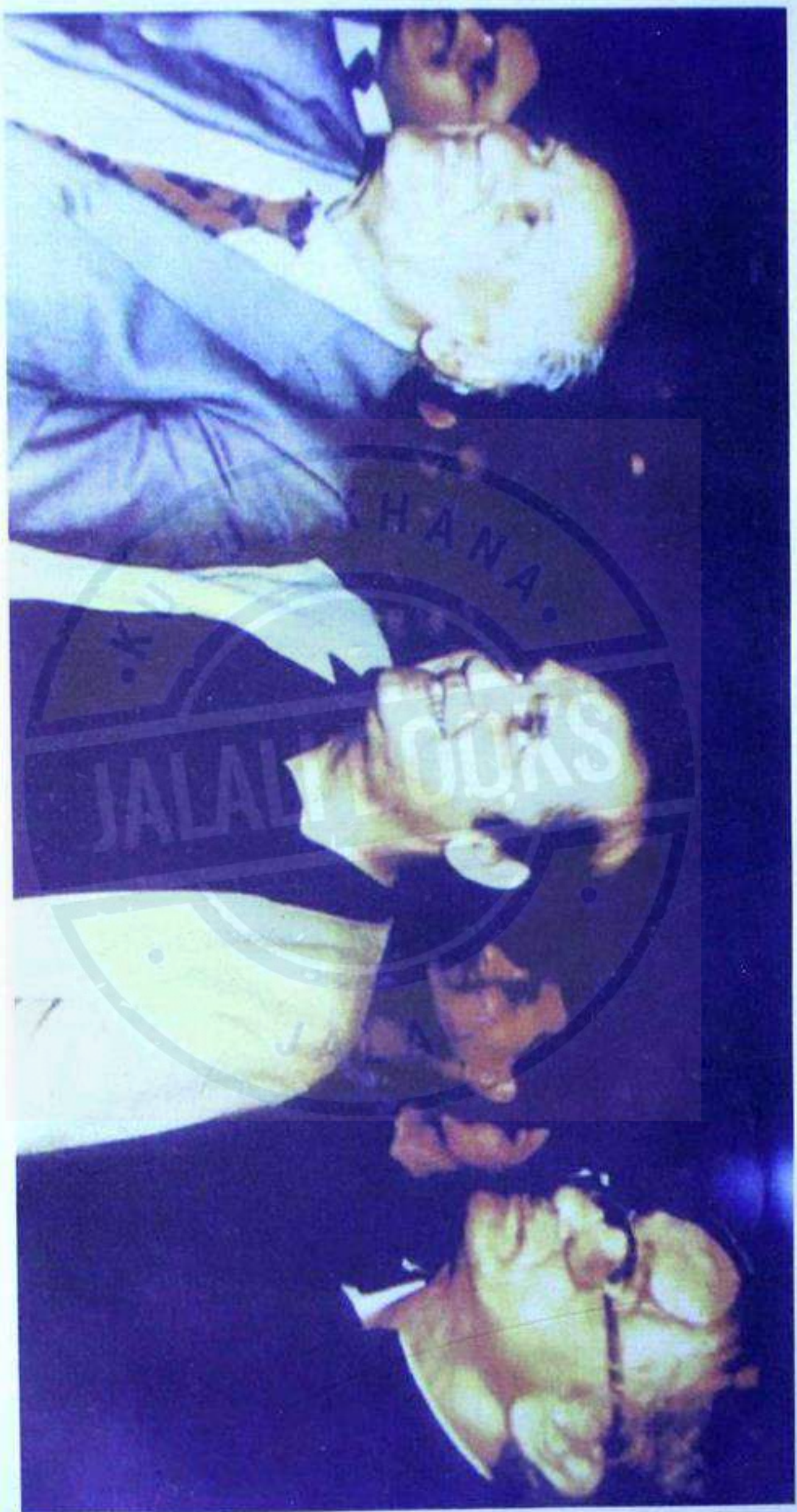
صادقین — آغا ناصر اور فیض احمد فیض

آپ کے سُپرد کردی گئی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو آپ سے تہنیت کا اظہار مناسب ہے یا ہمدردی کا؟'' اس متنازعہ فلم کے بارے میں انہوں نے لکھا ''ہمیں بھی نیف ڈیک سے ایک بہت ناخوشگوار سابقہ درپیش ہے جس کے بارے میں عدالتی کاروائی ہورہی ہے۔ اس نانہجار فلم کے بارے میں اب تک آپ بہت کچھ سُن چکے ہوں گے۔ کاردار ایک طرف اور نیف ڈیک کے ارباب حل وعقد دوسری طرف ہماری بات پر کسی نے کان دھرنا قبول ہی نہیں کیا۔ بہرحال اب تو پانی حد سے گزر چکا ہے۔ مقدمہ بازی سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مصالحت کی کوئی صورت نکل سکتی ہے تو اپنے افسران سے مشورہ کر کے مجھے لکھ دیجیے۔'' یہ فیض صاحب کی بہت دردمند تحریر تھی۔ اُن کے ارشاد کے مطابق مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں نے کیا اور فیض صاحب کی حد تک کچھ بہتری کی صورت پیدا بھی ہوگئی۔ مگر ایک اچھی بھلی فلم جو فیض صاحب کی آخری فلم تھی، ڈبوں سے باہر نہ آسکی اور اے جے کاردار کی دھاندلیوں اور ناروا سلوک نے فیض صاحب کو اسقدر بدظن کیا کہ ایک بار تو یہ خبر بھی گرم ہوگئی کہ فیض صاحب اپنے عزیز دوست کی بے وفائی اور اس کے ہاتھوں ذلت ورسوائی اُٹھانے کے سبب اس حد تک پریشان ہوئے کہ خودکشی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔

اس فلم میں جو کبھی ریلیز نہ ہوسکی فیض صاحب کے لکھے ہوئے بہت سے خوبصورت گیت ہیں۔ اُنہیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
سب چاہتیں بُھلا کر
کتنے اُداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
کیا کیا نہ دل دُکھا ہے
کیا کیا بہی ہیں اکھیاں
کیا کیا نہ ہم پہ بیتی
کیا کیا ہُوئے پریشاں
ہم تجھ سے دل لگا کر
تجھ سے نظر ملا کر
کتنے فریب کھائے
اپنا تجھے بنا کر
ہم تیرے پاس آئے

سارے بھرم مٹا کر

تھی آس آج ہم پر کچھ ہوگی مہربانی

ہلکا کریں گے جی کو سب حالِ دل زبانی

تجھ کو سُنا سُنا کر

آنسو بہا بہا کر

کتنے اُداس آئے

ہم تیرے پاس جا کر

ہم تیرے پاس آئے

سارے بھرم مٹا کر

☆......☆......☆
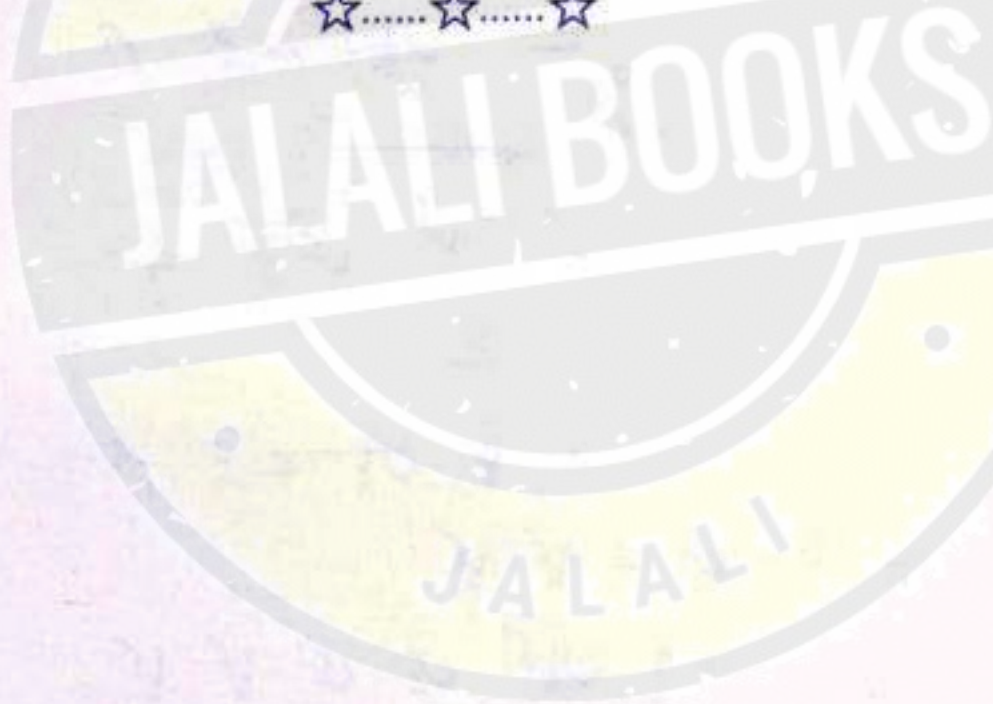
کاگ اڑاواں شگن مناواں

پنجابی نظماں

اج رات اک رات دی رات جی کے
اساں جُگ ہزاروں جی لِتّا اے
اج رات امرت دے جام وانگوں
اینھاں ہتھاں نے یار نوں پی لتا ہے

لمی رات سی درد فراق والی

 کدھرے نہ پیندیاں

  ربا سچیا
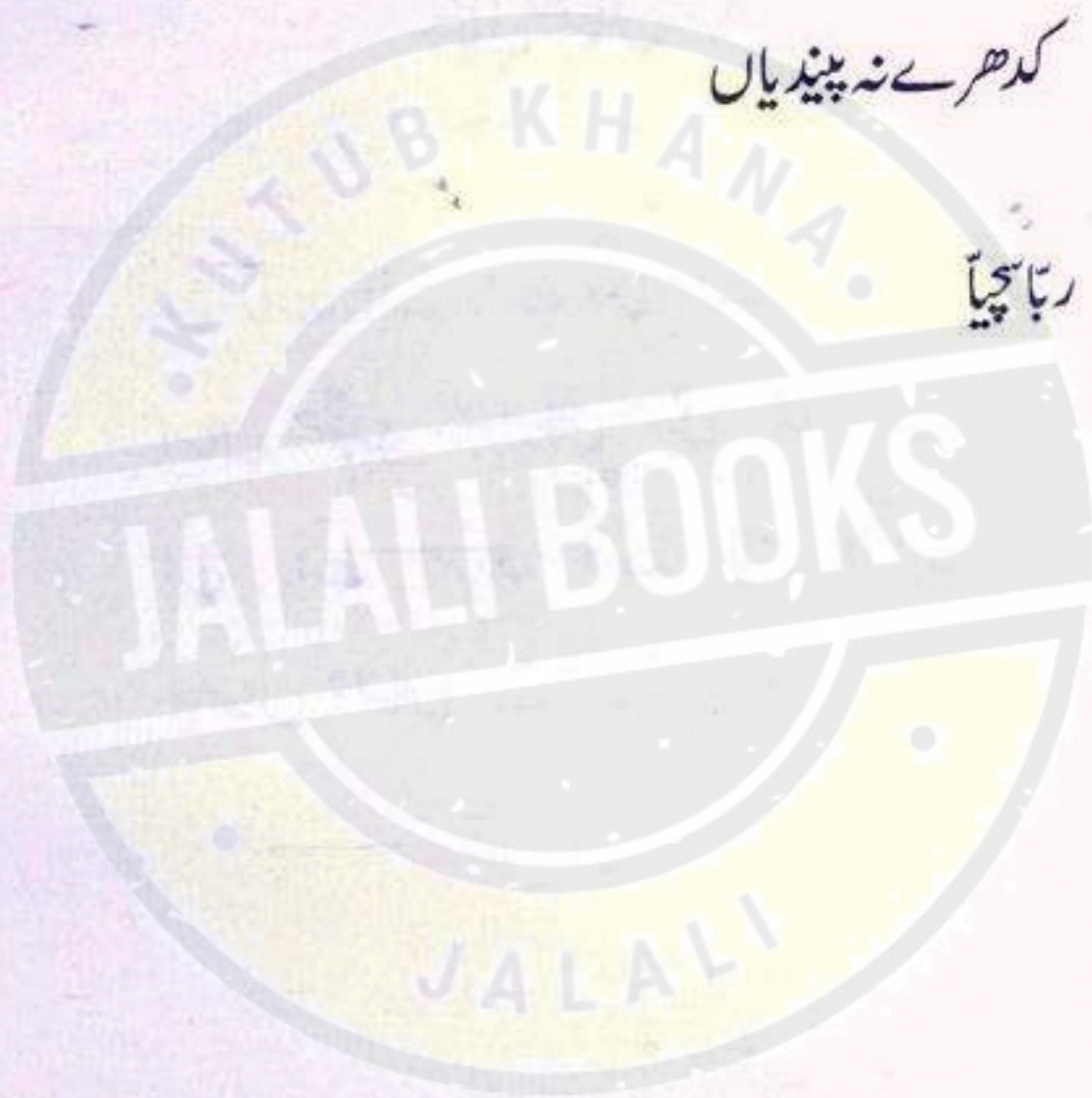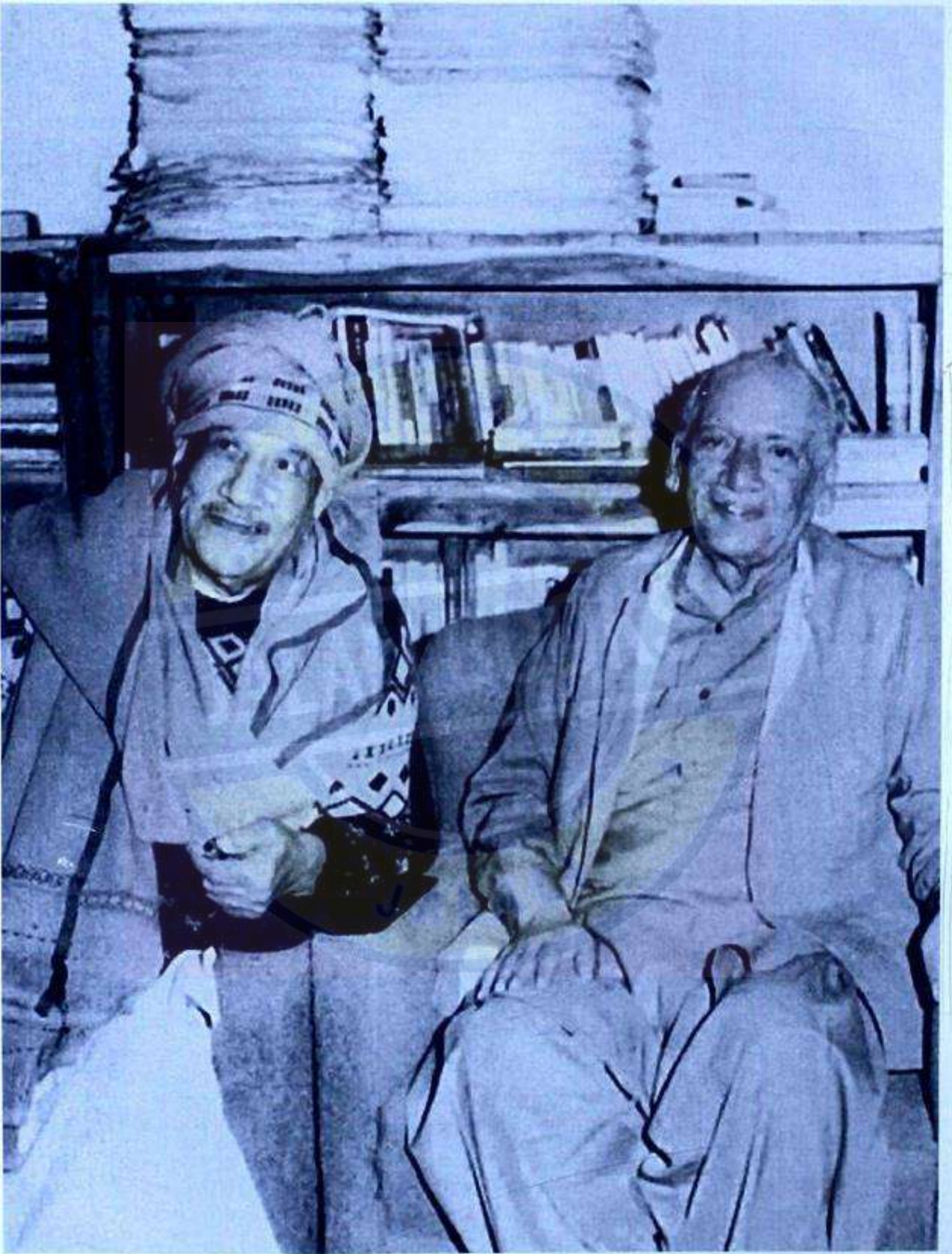
فیض صاحب استاد دامن کے ساتھ

لمّی رات سی درد فراق والی

1971ء میں برسر اقتدار آ کر ذوالفقار علی بھٹو نے ملک میں بہت سی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا مثلاً تعلیمی اصلاحات، لیبر اصلاحات، ثقافتی پالیسی وغیرہ۔اس سلسلہ کی ایک کڑی زرعی اصلاحات تھیں۔

میں نے ان دنوں لاہور ٹیلی وژن کا چارج سنبھالا ہوا تھا۔ایک دن مجھے اسلام آباد سے مینجنگ ڈائریکٹر صاحب کا فون آیا کہ پیپلز گورنمنٹ نے زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا ہے۔یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے جو ملک کی ترقی کے سفر میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوگا۔لہٰذا فیصلہ کیا گیا ہے کہ آج شام پاکستان ٹیلی وژن کے سارے اسٹیشن ''سونی دھرتی'' کے زیر عنوان زرعی اصلاحات کا جشن منائیں اور ساری رات پروگراموں کا سلسلہ جاری رہے۔انہوں نے مزید کہا کہ اسلام آباد کے ٹیلی وژن اسٹیشن پر وہ خود ان خصوصی نشریات کی نگرانی کریں گے۔کراچی میں یہ کام میرے ایک سینئر ہم منصب کو سونپا گیا ہے اور لاہور میں یہ ذمہ داری میری تھی۔مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ زراعت اور کسانوں کے حوالے سے لاہور سب سے اہم اسٹیشن ہے اس لئے کوشش کرو کہ اس خصوصی ٹرانسمیشن کی پیشکش بہتر سے بہتر ہو سکے۔یہ ایک چیلنج تھا۔اتنے کم وقت میں طویل دورانیہ کا خصوصی ٹرانسمیشن ترتیب دینا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔بہر حال میں نے اپنے ساتھیوں کے صلاح مشورے کے ساتھ رنگا رنگ پروگراموں کی منصوبہ بندی کی جن میں موسیقی، انٹرویز، شوز، خاکوں اور تمثیلوں کے علاوہ ایک محفلِ مشاعرہ بھی تھی۔لاہور میں مشاہیر شعرا کی کوئی کمی نہ تھی لہٰذا یہ کام میں نے خاص طور پر اپنے ذمہ لیا اور بذاتِ خود ایک ایک شاعر کو مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی۔میں نے ان سے یہ فرمائش بھی کی کہ اس موقع پر کوئی نئی چیز لکھ کر لائیں۔

فیض صاحب کی شرکت ظاہر ہے محفلِ مشاعرہ میں ضروری تھی۔میں نے ان سے بھی درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو کچھ نئے شعر لکھ دیں اور بہت بہتر ہو کہ یہ شعر پنجابی زبان میں ہوں۔اس سے پہلے فیض صاحب نے پنجابی میں کبھی شعر نہیں کہے تھے۔پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ آئیڈیا ان کو پسند آیا ہے۔اپنی دھرتی اور دھرتی کے بیٹوں کے لئے ان کی اپنی زبان میں شعر کہنا مجھے بڑی مناسب بات معلوم ہوئی۔شام کو جب وہ پروگرام میں شرکت کے لئے اپنے

دوستوں کے جلو میں ٹی وی اسٹیشن آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ انہیں تنہائی چاہیے تاکہ وہ اپنی نظم مکمل کر سکیں۔ میں نے ان کی خواہش کے مطابق انتظام کر دیا اور جب مشاعرہ شروع ہوا اور فیض صاحب اسٹوڈیو میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں اپنی نئی نظم کا مسودہ تھا جو پنجابی زبان میں تھی۔ ''لمی رات سی درد فراق والی۔'' یہ فیض صاحب کی پہلی پنجابی نظم تھی۔

فیض صاحب نے ہمیشہ پنجابی زبان میں طبع آزمائی سے گریز کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پنجابی صوفی شعراء وارث شاہ، بلھے شاہ، بابا فرید، میاں محمد، سلطان باہو وغیرہ کے مقابلے میں وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سب بہت بڑے شاعر ہیں اور درحقیقت اصل عوامی شاعر ہیں۔ ان کی زبان میں شاعری کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اُنہوں نے ایک بار پنجابی شاعروں کے لوک گیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ''ذرا غور کرو ان کے پاس پبلشر کہاں تھے۔ چھاپے خانے کدھر تھے اور ان کے پروموٹر اور دھڑے بند بھائی کہاں تھے۔ مگر اُن کے اشعار اور قصے دیہاتوں میں زبان زدِ عام تھے۔ ان کی بے پایاں مقبولیت، ان کی شاعرانہ عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان لوک گیتوں اور داستانوں میں انہوں نے اس وقت کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت کی بہت مؤثر عکاسی کی ہے۔ اس وقت کے رسم و رواج اور رائج الوقت محبتوں کے اصولوں کو اپنی شاعری میں بہترین اسلوب میں رقم کیا ہے۔'' ایک اور محفل میں ایک بار کسی نے ان سے پوچھا کہ ''فیض صاحب آپ نے پنجابی میں طبع آزمائی کیوں نہ کی'' تو انہوں نے جواب دیا ''بھئی بات یوں ہے اتنا پڑھنے لکھنے اور ریاضت کے بعد ہم شاید غالب جیسا ایک آدھ شعر کہہ لیں گے لیکن اگر ساری عمر بھی لگے رہیں تو بلھے شاہ اور وارث شاہ جیسا ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔''

فیض صاحب میرے اصرار پر اس شام پنجابی کی اپنی پہلی نظم لکھنے پر اس لئے رضامند ہو گئے تھے کہ ان کا خود بھی خیال تھا کچھ موضوعات ایسے ہیں جن کے اظہار کے لئے پنجابی زبان مؤثر ذریعہ ہے۔ اردو میں فوک گیت تو نہیں لکھے جا سکتے۔ زمین کسان اور کھیت کھلیان کا موضوع ہی ایسا تھا جس کے لئے اظہار کا بہتر اور مؤثر ذریعہ پنجابی زبان تھی۔ لہٰذا یہ نظم تخلیق ہو گئی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ استاد دامن نے فیض صاحب کی یہ پنجابی نظم سن کر کہا تھا ''کیا اچھی اردو وچ پنجابی لکھی ہے۔''

لمی رات سی درد فراق والی
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
کوڑا گھٹ کیتی مٹھڑے یار مرے
مٹھڑے یار میرے، جانی یار میرے
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے

جھانجراں وانگ ، زنجیراں چھنکائیاں نیں
کدی کنّیں منِدراں پائیاں نیں
کدی پیریں بیڑیاں چائیاں نیں
تیری تاہنگ وِچ پٹ دا ماس دے کے
اساں کاگ سدّے، اساں سنیہہ گھلّے
رات مُکدی اے، یار آوندا اے
اسیں تکدے رہے ہزار وَلّے
کوئی آیا نہ بناں نُختا میاں دے
کوئی پُجّا نہ سوا اُلاہمیاں دے
اَج لاہ اُلا ہمے مٹھڑے یار میرے
اَج آ ویہڑے وِچھڑے یار میرے
فجر ہووے تے آکھیے بسم اللہ
اَج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں
جیہدے قول تے اساں وساہ کیتا
اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

☆......☆......☆

کدھرے نہ پیندیاں دساں

1971ء وطن عزیز کے لئے انتہائی المناک زمانہ تھا۔ قومی اور بین الاقوامی دونوں حوالوں سے صورتِ حال بے حد تشویشناک تھی۔ 1970ء میں ہونے والے پہلے عام انتخابات کے نتیجے میں شیخ مجیب کی عوامی لیگ شاندار کامیابی کے بعد مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی کی تمام نشستوں پر فتح یاب ہو چکی تھی۔ اِدھر مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی زیر قیادت پاکستان پیپلز پارٹی کے نام کی ایک نئی سیاسی جماعت نے اکثریت حاصل کر لی تھی۔ یہ دونوں رہنما غالباً پاکستان بننے کے بعد پہلے اہم عوامی لیڈرز تھے۔ شیخ مجیب نے ''چھ نکات'' کا نعرہ لگایا تھا اور بھٹو نے ''روٹی کپڑا اور مکان'' کا۔ اُن دونوں لیڈروں کی سب سے بڑی کوالٹی جو اُن میں مشترک تھی، اُن کی خطیبانہ صلاحیت اور زورِ بیان تھا۔ اُن کے جلسوں میں لوگ جوق در جوق شریک ہوتے اور بڑی یکسوئی اور انہماک کے ساتھ اُن کی تقریریں سُنتے۔

الیکشن کے بعد حالات نے بڑی پیچیدگی اختیار کر لی۔ مجیب اور بھٹو میں سے کوئی بھی اپنے اُصولوں سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُدھر یحییٰ خاں کی نیت بھی صاف نہیں تھی۔ اُن کا مقصد صرف اپنے اقتدار کو دوام بخشنا تھا۔ نتیجتاً دونوں بڑی پارٹیاں کسی ایک بات پر متفق نہ ہو سکیں اور جنرل یحییٰ خاں کا سخت گیر رویہ حالات کو بد سے بدترین کرتا رہا۔

مارچ 1971ء کے آرمی ایکشن اور اُس کے بعد عوامی لیگ کی قیادت کی جانب سے آزاد بنگلہ دیش کے قیام کا اعلان اس تابوت میں آخری کیل تھی۔ حالات قابو سے باہر ہوتے گئے اور بنگلہ دیش کی باغی فوج نے جو مکتی باہنی کے نام سے مشہور ہوئی ہندوستان کی حکومت سے ساز باز کر کے خطرناک جنگی حالات پیدا کر دیے۔ دسمبر 1970ء میں ہندوستان نے پاکستان کے خلاف آغازِ جنگ کر دیا اور مختصر مقابلہ کے بعد ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ شہر میں داخل ہو گئیں۔ یوں پاکستان کو اپنی تاریخ کی سب سے بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان جنگ ہار گیا۔ بنگلہ دیش کی آزاد مملکت وجود میں آ گئی۔ پاکستانی فوج نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہتھیار ڈال دیئے تھے اور نوے ہزار پاکستانی قیدی بنا لیے گئے تھے۔ اس ہزیمت کے اثرات بہت اندوہناک تھے اور بحیثیت قوم ہمارے لیے حد درجہ شرمساری کا باعث تھے۔ نہ صرف یہ کہ ہمارے نوے ہزار ہموطن ہندوستان کی قید میں تھے بلکہ اُن کی رہائی کے لیے خود ملک کے اندر

حکومت کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شہید ہونے والوں کے اہلِ خاندان دوست اور عزیز حکومت کے خلاف پُرزور جلوس نکالتے اور ماتم کرتے اپنے پیاروں کی واپسی کا مطالبہ کرتے اور نعرے لگاتے۔ ''ظالموں جواب دو خون کا حساب دو'' جانے کتنے گھروں کے چراغ گُل ہوئے تھے اور کتنے خاندانوں کے بیٹے دشمن کی قید میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ ابھی بھٹو صاحب کو شملہ جا کر اندرا گاندھی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے میں کچھ دیر تھی۔

فیض صاحب صرف چند ماہ پہلے مشرقی پاکستان میں افواجِ پاکستان کی لشکرکشی کے خلاف نظمیں لکھ رہے تھے اور اپنے بنگالی بھائیوں کی آواز میں آواز ملا کر پکارتے رہے تھے ''حذر کرو مرے تن سے۔''

اب وہی فیض صاحب اپنے اہل وطن کی رہائی کے لیے فکرمند تھے اور اُن کی ماؤں بہنوں اور بچوں کے جذبات اور احساسات کی عکاسی اپنی شاعری میں کر رہے تھے۔ اُن کا یہ پنجابی گیت اُسی زمانے کی شاعری کا ایک نمائندہ گیت ہے۔ یہ گیت جب نیرہ نور کی آواز میں ایک ٹیلی وژن پروگرام میں نشر ہوا تو سننے والے دھاڑیں مار مار کر روئے۔

کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں
کاگ اُڈاواں، شگن مناواں
وگدی وادے ترلے پاواں
تری یاد پوے تے رواں
ترا ذکر کراں تاں ہساں
کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں

درد نہ دساں گُھلدی جاواں
راز نہ کھولاں مکدی جاواں
کس نوں دل دے داغ وِکھاواں
کس در اگّے جھولی ڈھاواں
وے میں کس دا دامن کھساں
کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں

شام اُڈیکاں، فجر اُڈیکاں
آکھیں تے ساری عمر اُڈیکاں
آہنڈ گوانڈی دیوے بلدے
ربا ساڈا چانن گھلدے
جگ وَسدائے میں وی وَساں
کِدھرے نہ پیندیاں دَساں
کِدھرے نہ پیندیاں دَساں
وے پردیسیا تیریاں

ربا سچیا

فیض صاحب نے پنجابی زبان میں بہت کم لکھا۔ صرف ''رات دی رات'' کے نام سے شایع ہونے والی ایک مختصر کتاب ہے جس میں اُن کی پنجابی نظمیں اور اُردو شاعری کے کچھ تراجم شامل ہیں۔ اُنہوں نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

''میرے لیے انہاں دا ایہہ کشالا ذاتی احسان مندی توں وکھ ایس پاروں وی خوشی دی گل اے جے ساڈے اُٹھدے فنکار اپنی ماں بولی نوں اینیاں صدیاں دی بے اعتنائی مگروں فکر تے فن دے اظہار دا وسیلہ بنا رہے نیں مینوں اپنے کلام بارے کوئی مغالطہ یا خوش فہمی نہیں۔

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں۔

پر پنجابی ادب دے اتھاہ سمندر چ کجھ قطریاں دے ایس وادھے نوں وی غنیمت جاننا چاہی دا اے۔''

اس پنجابی مجموعے کا آغاز اُن کے ایک خوبصورت پنجابی قطعے سے ہوتا ہے۔

اج رات اِک رات دی رات جی کے
اساں جگ ہزاروں جی لیا اے
اج رات امرت دے جام وانگوں
ایہناں ہتھاں نے یار نوں پی لیا اے

جیسا کہ کہا گیا اپنی مادری زبان میں فیض صاحب بہت کم لکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا پنجابی شعر کہنا ان کو نہیں آتا مگر ملک کے نوجوان پنجابی شعراء کا ان پر دباؤ رہتا تھا کہ وہ پنجابی زبان میں شعر لکھیں۔ مگر وہ اپنے ان تجربوں کو کامیاب نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار ایک روسی رسالہ ''اگنیوک'' کے ساتھ اپنے انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا ''شعر لکھنے کے لئے بول چال کی زبان جاننا کافی نہیں۔ اس زبان میں کسی بھی خیال کا اظہار کرنے کے سب طریقوں پر مکمل قدرت حاصل کرنا ضروری ہے اور اس کے لئے بہت کچھ اور بہت دیر تک سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے پنجابی زبان میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی نہ ہی ہمیں اس زبان میں شعر کہنا آتا ہے۔'' اُن کی پنجابی نظموں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ مگر جو کچھ بھی اُنہوں نے لکھا وہ کسی طرح اُن کی اُردو شاعری سے کم معیاری نہیں ہے۔ اُن کی ساری نظموں میں "ربا سچیا" مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ یہ نظم میں نے بار بار سنی ہے۔

یارِعزیز شعیب ہاشمی جنہیں میں ہمیشہ پپی ہاشمی کہہ کر پکارتا ہوں جس جلسے یا محفل میں موجود ہوں یہ نظم ضرور سناتے ہیں۔ وہ فیض صاحب کے داماد ہونے کے علاوہ نہایت زیرک، حاضر جواب اور بذلہ سنج انسان ہیں۔ اُنہیں فقرہ کہنا بھی آتا ہے اور سننا بھی۔ میرے ساتھ ہمہ وقت اُن کی چھیڑ چلتی رہتی ہے۔ ایک بار یوں ہوا کہ کسی محفل میں سامعین کو یہی نظم سنا کر جب وہ اسٹیج سے نیچے آئے اور میری ساتھ والی نشست پر بیٹھے تو میں نے کہا ''یار پپی ہاشمی! تم نے زندگی میں فیض صاحب کی کوئی خدمت کی ہو یا نہ کی ہو اُن کی وفات کے بعد اپنے سسر کی روح کو ضرور خوش کر دیا ہے۔''

اُنہوں نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا کہ ہم سب واقف ہیں کہ فیض صاحب کو شعر سنانے کا ڈھب نہیں آتا تھا مگر تم تو اُن سے بھی زیادہ برے انداز میں اُن کے شعر سناتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری زبانی اپنا کلام سن کر اُن کی روح ضرور خوش ہوتی ہوگی کہ کم از کم وہ تم سے تو بہتر انداز میں شعر پڑھتے تھے"۔

خیر یہ تو تفریحِ طبع کے لیے یونہی ایک بات تھی ورنہ شعیب ہاشمی اُن کا پنجابی کلام بڑی مہارت سے پڑھتے ہیں خاص طور پر اُن کی نظم ''ربا سچیا۔''

مجھے اس نظم کا پس منظر اور شانِ نزول کا علم تو نہیں مگر جانے کیوں میں جب بھی یہ نظم سنتا ہوں مجھے اقبال کا "شکوہ" یاد آ جاتا ہے۔

''بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے''

فیض صاحب کی نظم بھی اپنے رب کے حضور ایک شکوہ ہے۔

ربا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں
ساڈا نَیب تے عالیجاہ ہیں توں
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی او رب سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں
کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی چ کونج کرلاوندی اے

چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں، محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں دی نکّر منگنا ہاں
میری منّیں تے تیریاں مَیں منّاں
تیری سوہنہ جے اِک وی گَل موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربّا
فیر میں جاواں تے ربّ کوئی ہور لوڑاں

☆......☆......☆

نذرانے

ہدیہ تحسین وتہنیت

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچی ہے سر حرفِ دعا اب مری تحریر
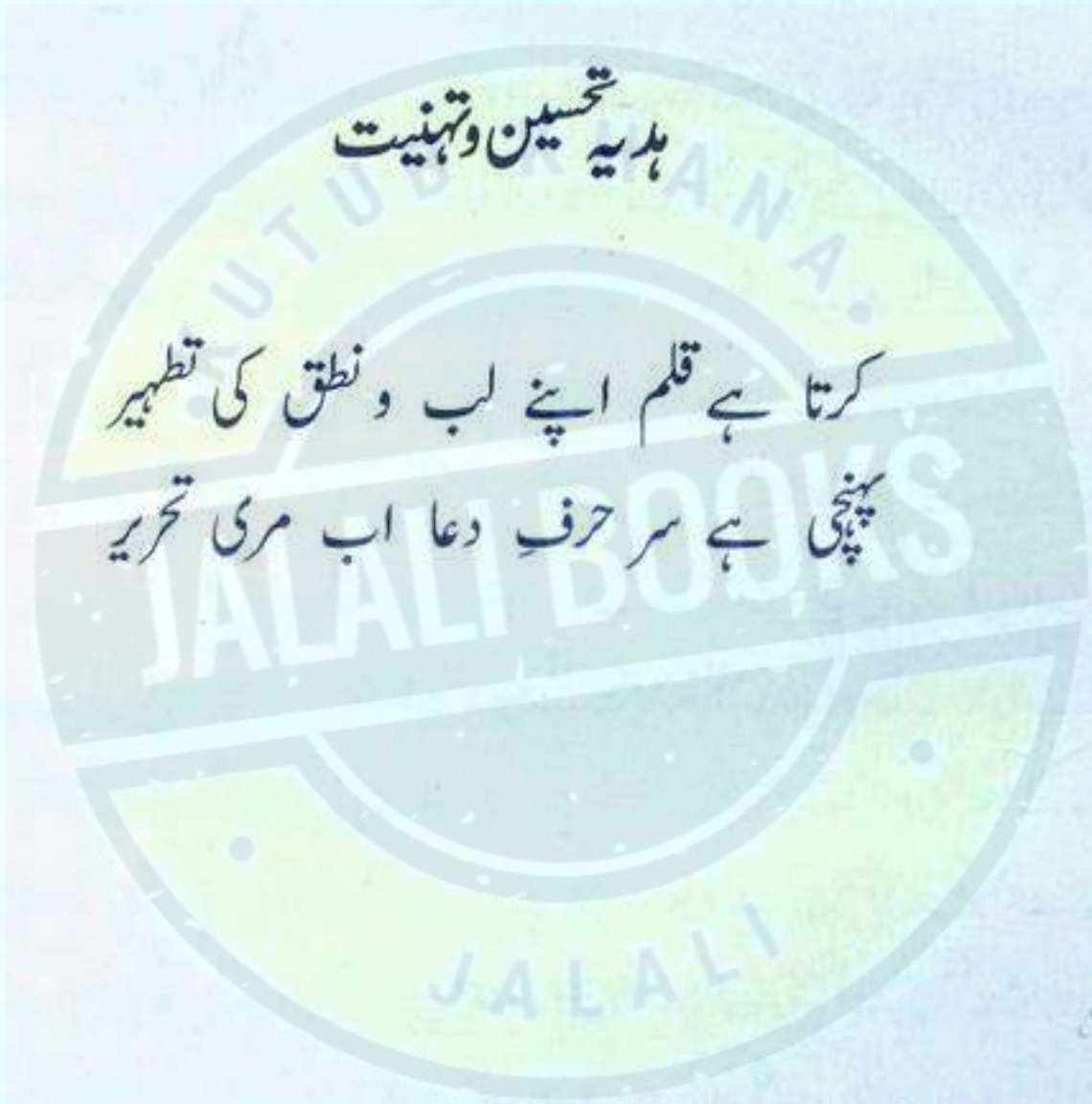
- مدح
- نذرِ حسرتؔ موہانی
- نذرِ غالبؔ
- نذرِ سوداؔ
- موری ارج سنو
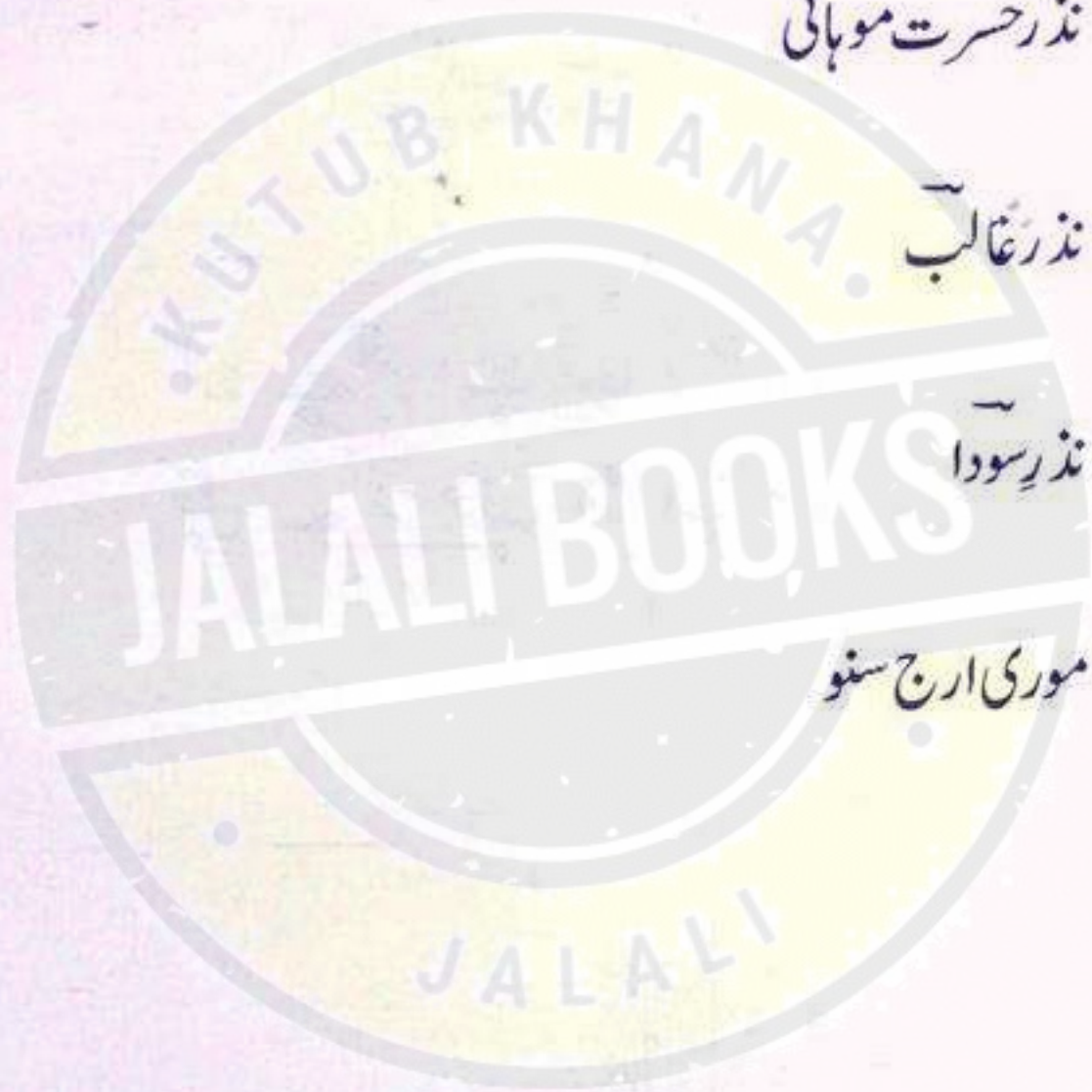
مدح

حسین شہید سہروردی کا شمار ملک کی نامور شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور چوٹی کے وکیل سمجھے جاتے تھے۔ آزادی سے قبل وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک بہت فعال کارکن تھے اور غیر منقسم بنگال میں وزیرِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ عدالتی حلقوں میں اُن کی شہرت ایک حاضر دماغ اور حاضر جواب وکیل کی تھی۔

حسین شہید سہروردی 1892ء میں بنگال کے شہر منڈاپور میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کلکتہ سے گریجویشن کی اور اس کے بعد وکالت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے، جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں وطن واپس آتے ہی سیاست میں لگ گئے۔ اُن کی سربراہی میں 1946ء میں بنگال میں برصغیر کی پہلی مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہندو مسلم فسادات کے سبب اُن کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔

پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے بہت فعال کردار ادا کرتے رہے اور 57-1956ء میں وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے اُنہوں نے بعض بے حد دلیرانہ فیصلے کیے جس کی وجہ سے مغربی پاکستان کے سیاستدان اُن کی حمایت سے دستبردار ہوگئے اور اُنہیں وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دینا پڑا۔ 1958ء میں پہلے مارشل لا کے بعد فوجی حکومت نے اُنہیں بہت سے دیگر سیاستدانوں کے ساتھ نااہل قرار دے دیا۔ وہ ملکی حالات سے بہت دل برداشتہ ہوگئے اور آخر 1963ء میں جب وہ بیروت کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھے، اُن پر دل کا دورہ پڑا اور وفات پاگئے۔

سہروردی ایک چوٹی کے وکیل تھے اور عدالتوں میں اُن کے نام کا سکّہ چلتا تھا۔ سارے جج اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سُنا ہے سہروردی صاحب چونکہ صبح دیر تک سونے کے عادی تھے اِس لیے بسا اوقات عدالت میں شیو کیے بغیر آجاتے تھے اور اپنے ساتھ بیٹری سے چلنے والا ''شیور'' بھی لاتے تھے جس کے استعمال کی اجازت انہیں بطورِ خاص دی گئی تھی۔

وہ ساری زندگی مسلم لیگ سے وابستہ رہے مگر تقسیم کے بعد پاکستان کے ''مسلم لیگیوں'' نے اُنہیں اتنا تنگ کیا کہ 1949ء میں وہ اپنی ایک الگ سیاسی جماعت بنانے پر مجبور ہوگئے جس کا نام ''عوامی مسلم لیگ'' تھا۔ یہی وہ جماعت تھی جو بعد میں ''عوامی لیگ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

1951ء میں جب راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے حیدرآباد جیل میں ایک خصوصی عدالت قائم کی گئی تو حسین شہید سہروردی نے اپنی خدمات ملزمان کی پیروی کے لیے پیش کیں۔ اُنہوں نے پورے اعتماد اور جذبے کے ساتھ مقدمہ لڑا۔ فیض احمد فیض اور ان کے ساتھیوں کا سہروردی صاحب کی دلیلیں سُن سُن کر یہ خیال ہو گیا تھا کہ جیسے ہی بیانات مکمل ہونگے، وہ سب بری کر دیے جائیں گے، مگر سازش کیس کے ملزموں کے خلاف سرکار نے بھی پہلے ہی ''سازش'' کر لی تھی لہٰذا وہی فیصلہ ہوا جو حکومت چاہتی تھی۔

مقدمہ کی پیروی کے دوران میں سہروردی صاحب کی شخصیت اور اُن کے خلوص نے سارے اسیروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ فیض صاحب نے مقدمے کے اختتام پر سہروردی صاحب کے لیے ایک ''سپاس نامہ'' لکھا۔ اس کا عنوان ''مدح'' ہے اور شاید یہ پہلا اور آخری قصیدہ ہے جو فیض صاحب نے کسی زندہ شخصیت کی شان میں لکھا۔

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اک لفظ اِدھر نُطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہُوئے تیر
گرمی بھی ہے ٹھنڈک بھی، روانی بھی سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیے، ہے تاثیر سی تاثیر
اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر
اطرافِ وطن میں ہُوا حق بات کا شُہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہُوئی تشہیر
روشن ہُوئے اُمیّد سے رُخ اہلِ وفا کے
پیشانیٔ اعدا پہ سیاہی ہُوئی تحریر

(۲)

حریّتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
کچھ ننگ نہیں رنجِ اسیری کہ پُرانا

مردانِ صفا کیش سے ہے رشتۂ زنجیر
کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کیے رہتے ہیں تنویر
معلوم ہے ان کو کہ رہا ہوگی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر
آخر کو سرافراز ہُوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جَور کی تعمیر
ہر دَور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر
ہر دَور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبّیر

(۳)

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچتی ہے سرِ حرفِ دعا اب مری تحریر
ہر کام میں برکت ہو ہر اک قول میں قوّت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر
ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر
ہر بات ہو مقبول، ہر اک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر
ہر دن ہو ترا لطفِ زباں اور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ

☆......☆......☆

نذرِ حسرت موہانی

فیض صاحب کو مولانا حسرت موہانی سے خاص نسبت تھی۔ وہ ان سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے اور اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مولانا کی وفات 1951ء میں ہوئی۔ فیض صاحب اس وقت تازہ تازہ گرفتار ہوئے تھے اور پس زنداں تھے۔ مشاہیر اور کلاسیکل رنگ میں غزل کہنے والے شعراء میں حسرت موہانی ان کے ہم عصر تھے اور فیض صاحب ان کے ادبی رتبہ کے معترف تھے۔

ان دو عظیم شاعروں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ سادگی، صاف گوئی اور درویشی ان دونوں کے کردار کا حصہ تھے۔ وضع قطع، رکھ رکھاؤ اور حسن سلوک کے معاملے میں بھی ان کی عادات بہت ملتی جلتی تھیں، لیکن سب سے بڑی اور اہم مماثلت ان دونوں میں شاعری کے حوالے سے تھی۔ فیض نے غزل میں جو نئی طرزِ ادا اختیار کی وہ دراصل حسرت ہی کا فیض تھا۔ اُنہوں نے خود کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ جب ہم نے شاعری شروع کی تو اُس وقت کے جو بھی مشہور شاعر تھے اُن کا اثر قبول کیا خاص طور پر حسرت موہانی کا۔ فیض صاحب کا کہنا تھا کہ شاعر کو چاہیے ہر موضوع پر شعر تخلیق کرے جس میں ذاتی عاشقی بھی شامل ہو اور سیاسی مسلک بھی۔ اس میں ڈھول، دھوپ، چاندنی، زمین، آسمان، بھوک، مفلسی غرض سب کچھ شامل ہے۔ شاعر سب چیزوں کا احاطہ کر کے شعر کہتا ہے۔''

اگر غور کیا جائے تو جو کچھ فیض صاحب نے کہا وہ ساری صفات حسرت کی شاعری میں موجود ہیں۔ حسرت موہانی 1878ء میں پیدا ہوئے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں تغیر اور تبدل کا دور تھا۔ سیاسی اور ادبی ہر دو شعبہ ہائے زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ بلاشبہ یہ ہندوستان کی سیاسی، اقتصادی، ثقافتی، ادبی اور مذہبی احیاء پرستی کے انقلاب اور اتھل پتھل کا دور تھا۔ مولانا کی جائے پیدائش لکھنؤ کے قریب قصبہ ''موہان'' ہے۔ مقامی زبان میں ''موہ'' کے معنی محبت اور ''ہان'' کے معنی ترک کرنے کے ہیں۔ روایت ہے کہ ہندوؤں کے اوتار شری رام چندر جی اپنی بیوی سیتا اور بھائی لچھمن کے ساتھ بن باس کے لیے جب روانہ ہوئے تو ان کے ایک اور بھائی شتر گھن انہیں رخصت کرنے کے لیے اس بستی تک آئے تھے۔

حسرت موہانی کی ابتدائی تعلیم موہان میں ہوئی۔ وہ میٹرک کے امتحان میں پورے صوبے میں اوّل آئے۔ بعدازاں ان کو علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں علی گڑھ کی تعلیم اور تربیت کا اہم کردار ہے۔ مگر اپنے انقلابی خیالات اور بے باکی کے سبب یہاں ان کا گزارہ نہ ہوسکا اور بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی انہیں ان کی ''باغیانہ'' روش کی بنا پر یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ عربی، فارسی اور خاص طور پر اردو شاعری سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ ان کے سیاسی رجحانات کی نشاندہی

تو اسی وقت ہوگئی تھی جب ان کی آزاد خیالی کے سبب انہیں کالج سے نکالا گیا تھا۔ مستقبل میں وہ نہ صرف ایک نامور شاعر بلکہ انتہائی اہم سیاست دان کے طور پر بھی اُبھرے۔ اپنی شعلہ صفت تحریروں کے نتیجے میں شروع زمانہ ہی میں انہیں جیل جانا پڑا اور پہلی ہی قید نے ان کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ انہوں نے سادگی اختیار کی اور اپنی ضروریات زندگی کو انتہائی محدود کرلیا۔ ان کا سراپا اور وضع قطع یوں بیان کی جاتی ہے۔

''گہرے کھتی رنگ کی ٹوپی، آنکھوں پر لوہے کے گول فریم کا چشمہ، ہلکے رنگ کے کپڑے کے جوتے، بادامی رنگ کی شیر وانی، بھری ہوئی داڑھی، وجیہ چہرہ، توانا جسم اور درمیانہ قد۔ ہمہ وقت اپنے ساتھ ایک چھڑی ایک لوٹا اور ایک چادر نما جائے نماز ضرور رکھتے تھے۔''

شاعری میں حسرت نے اپنے لیے "غزل" کا انتخاب کیا۔ اگرچہ انہوں نے چند نظمیں بھی کہیں مگر ان کا اصل میدان غزل تھا جو آج اردو ادب کا گرانقدر اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی بہترین غزلیں وہ ہیں جو انہوں نے پسِ دیوارِ زنداں لکھیں۔

حسرت موہانی نے غزل کا مزاج بدل ڈالا۔ پرانے الفاظ کو اُنہوں نے نئے معنی پہنائے اور نیا اسلوب دیا۔ انہوں نے غزل کے اشعار کو سیاسی فکر اور پیغام کے لیے بھی استعمال کیا۔ یہ چیز ہم بعد میں فیض صاحب کی غزلوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ حسرت کی بعض پوری پوری غزلیں خالص سیاسی ہیں۔ کچھ کھلے انداز میں اور کچھ لفظوں کی نئی معنی آفرینی کے ساتھ۔

رہتی ہے روز اک ستمِ تازہ کی تلاش
بے چین ہے وہ فتنۂ دوراں مرے لیے

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِ وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے

غیر ممکن ہے ہم سے طاعت غیر
اے جفاکار اے غریب آزار

حسرت اصولی طور پر ترقی پسند اور سوشلسٹ تھے اور یہ مسلک انہوں آخر دم تک نہ چھوڑا۔ البتہ سیاسی اور معاشی موضوعات کے ساتھ ساتھ وہ جمال وحسن اور عشق وجنوں کی ایسی شاعری بھی کرتے رہے جس نے غزل کی مقبولیت کو بلند درجہ عطا کیا اور فیض جیسے شاعر نے ان کی طرز آہنگ کو اپنایا۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

لایا ہے دل پر کیسی خرابی۔ اے یار تیرا حُسنِ شرابی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین۔ یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے
حُسن بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

اردو کے اس بے بدل شاعر اور اپنے مرشد کو ہدیہ تحسین پیش کرنے کے لیے فیض صاحب نے 1982ء میں یہ ابیات لکھیں۔

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترک روایت نہ کریں گے
کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے
شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے
یہ فقر دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے
ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

☆......☆......☆

نذرِ غالبؔ

غالبؔ سے فیض کو والہانہ عقیدت تھی۔ وہ غالبؔ کو اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور اپنی اس رائے کے سلسلہ ان کے ذہن میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ غالبؔ سے ان کا تعلق ایک خاص نوعیت کا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ غالبؔ کے دیوان کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے ہوتا ہے۔

اکثر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ سترہویں صدی سے وسط انیسویں صدی تک کے شعری تجربات کا نچوڑ غالبؔ کے کلام میں موجود ہے۔ ان کے ہاں غضب کی مضمون آفرینی ہے۔ وہ لفظی شعبدہ بازی نہیں کرتے۔ فیض صاحب کہتے تھے ''میں اکثر اور بعض حالات میں روزانہ غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں اور اسے اپنی شاعری میں شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں۔''

فیض صاحب کے ایک مکالمے میں تحریر ہے'' غالبؔ کے کلام میں زبان اور مضامین کے مختلف مدارج کے باوجود ہم ایک واضح اور نمایاں وحدت محسوس کرتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ غالبؔ کے کلام کی وحدت ایک ہی موڈ کی وجہ سے ہے۔ اگر موڈ کا ترجمہ ہم کیفیت کر سکیں تو یوں کہنا چاہیے کہ غالبؔ کے ہاں تمام مضامین اور تمام تجربات مختلف اور متنوع ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہم رنگ کیفیت کے حامل ہیں۔ غالبؔ کے کلام کی یہ بنیادی کیفیت کیا ہے؟ اگر اس کے لئے میں کوئی ایک لفظ سوچ سکتا ہوں تو وہ اداسی ہے۔ اور اگر ہم اس کیفیت کا تجزیہ کرنا چاہیں تو ہمیں اس میں تین عناصر ملتے ہیں۔ کچھ ماضی کی یاد اور اس کے کھو جانے کا غم، کچھ حال کی بے کیفی اور ویرانی کا احساس اور کچھ مستقبل میں ماضی کے لوٹ آنے کی حسرت۔''

اگر غور کریں تو یہی خصوصیت خود فیض صاحب کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ بعینہ یہی بات خود فیض صاحب کی غزلوں پر صادق آتی ہے۔ ان کی زیادہ تر غزلوں میں خیال کی اکائی اور اشعار میں ایک ربط موجود ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ فیض صاحب پر غالبؔ کی شاعری کا کتنا گہرا اثر ہے۔ مرزا ظفر الحسن نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے "فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس کی اسیری کے زمانے میں اپنے ساتھیوں کو غالبؔ پڑھایا کرتے تھے۔ غالبؔ اور فیض کا باہمی رشتہ سمجھنے کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ مرزا غالبؔ خود جیل گئے سو گئے۔ فیض کے ساتھ بھی جیل میں رہے۔"

اردو کا یہ عظیم شاعر جسے ساری دنیا غالبؔ کے نام سے جانتی ہے 1797ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوا۔ ان کا اصل نام اسداللہ خاں تھا اور ان کا تعلق ترک قوم سے تھا۔ ان کے اجداد جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی۔ مغلوں کی عظمت و شوکت کا درخشاں دور گزر چکا تھا تاہم جانبازوں، عالموں، دانشوروں اور اہل قلم کی طلب ابھی تک باقی تھی۔ ہجرت کر کے آنے کے بعد غالب کے خاندان نے پہلے آگرہ میں قیام کیا اور بعد ازاں دہلی کو اپنا مسکن بنایا۔ ''دیوانِ غالب'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ غالبؔ کی

اردو شاعری کے بارے میں ایک افسانہ مشہور ہے کہ نواب حسام الدین حیدر خاں نے جب غالبؔ کا ابتدائی کلام لکھنؤ میں میر تقی میرؔ کو دکھایا تو میر صاحب نے کہا ''اگر اس لڑکے کو استاد کامل نے سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل لکھنے لگے گا۔'' استاد کامل انہیں ملا یا نہ ملا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ "یہ لڑکا" اردو زبان کا ایک "لاجواب" شاعر بن گیا۔

غالب کی وفات 1869ء میں ہوئی۔

وحشتؔ و شیفتہؔ اب مرثیہ کہویں شاید
مرگیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالبؔ سے فیض صاحب کی بے پناہ وابستگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے اور پانچویں شعری مجموعے کے عنوان ''نقشِ فریادی'' اور ''دست تہہ سنگ'' غالبؔ کے اشعار سے اخذ کیے۔ اس کے علاوہ ان کی کلیات کا عنوان ''نسخہ ہائے وفا'' بھی غالبؔ ہی کی غزل کے ایک شعر سے لیا گیا ہے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فیض صاحب نے اپنی غزلوں اور نظموں میں بھی کئی جگہ غالبؔ کے اشعار اور مصرعے استعمال کیے ہیں۔

انہوں نے نذر غالبؔ کے طور پر غالبؔ ہی کے رنگ میں یہ اشعار لکھے ہیں۔ یہ اردو کے ایک ''بڑے شاعر'' کا اردو کے ''سب سے بڑے شاعر'' کے حضور ہدیہ تحسین و تہنیت ہے

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بُتاں کا ارادہ رکھتے ہیں
بہار آئے گی جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں گرچہ بادہ رکھتے ہیں
تری نظر کا گِلہ کیا؟ جو ہے گلہ دل کا
تو ہم سے ہے، کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں
نہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں
غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں
جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیضؔ ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرف سادہ رکھتے ہیں

☆......☆......☆

نذرِ سوداؔ

مرزا رفیع سوداؔ کو فیض صاحب اردو کے اساتذہ شعراء میں غالبؔ کے بعد سب سے بلند مقام دیتے تھے۔ سوداؔ کا اسلوب، انتخاب الفاظ اور اختراع پسندی سے فیض صاحب بہت متاثر تھے۔ فیض صاحب نے صرف پانچ شاعروں کے لئے نذرانۂ عقیدت قلم بند کیے جن میں خسروؔ، حافظؔ، غالبؔ اور حسرتؔ موہانی کے علاوہ سوداؔ شامل ہیں۔ فیض صاحب نے اپنے ایک مجموعہ ''زندان نامہ'' کے آغاز میں سوداؔ کا یہ شعر بھی لکھا ہے۔

اے ساکنانِ کنجِ قفس صبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو

اس شعر کا لب ولہجہ اور انداز فیض سے اتنا ملتا جلتا ہے کہ کبھی کبھی تو گمان ہوتا ہے کہ یہ شاید فیض صاحب کا شعر ہے۔ ہمارے دور کی معروف افسانہ نگار اختر جمال کا کہنا ہے کہ ''سوداؔ کے تخیل کی رنگینی اور رعنائی اور ان کی طبیعت میں خوشی اور سرمستی کا جو احساس ہے وہ فیض کو سوداؔ کے قریب لے آتا ہے۔''

فیض صاحب اکثر ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ سوداؔ ان کے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ ''اردو شاعری کی روایت کے دو بڑے ستون ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ۔ میرؔ کی جو روایت تھی اس کے بڑے نمائندہ شاعر فراقؔ تھے اور سوداؔ کی جو روایت تھی، اس کے بڑے شاعر جوشؔ تھے۔ یہ دونوں روائتیں اردو ادب میں ساتھ ساتھ چلتی آئی ہیں۔''

سوداؔ 1716ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے اور یہیں آباد ہو گئے۔ ان کا کاروبار یہاں خوب پھلا پھولا جس کی وجہ سے ان کا شمار دلّی کے دولت مندوں میں ہونے لگا۔ سوداؔ نے عربی اور فارسی کی مروجہ تعلیم اپنے والد کے زیرِ سایہ حاصل کی۔ شروع شروع میں فارسی میں شعر کہتے تھے مگر خان آرزو کے کہنے پر اردو میں شعر کہنا شروع کر دیئے۔ جلد ہی ان کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی اور خود بھی اساتذہ میں شمار ہونے لگے۔

جب دہلی کے حالات خراب ہو گئے اور افراتفری کا عالم پیدا ہوا، تو سوداؔ کو بھی دوسرے شاعروں کی طرح دلّی چھوڑ کر فرخ آباد جانا پڑا۔ ساٹھ سال کی عمر میں یہ حادثہ ان کے لئے بڑا جانکاہ تھا۔ مگر چارو ناچار فرخ آباد پہنچے اور نواب احمد خان بنگش کے ہاں ٹھہرے۔ پھر ان کی وفات کے بعد نواب شجاع الدولہ کے پاس چلے گئے جہاں آخر عمر تک مقیم رہے۔

شمس العلماء محمد حسین آزاد نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''آبِ حیات'' میں سودا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''جن اشخاص نے زبان اردو کو پاک صاف کیا مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انہوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادے کو دوسرے مادے میں جذب کر دیتا ہے۔ انہیں کا زورِ طبع تھا جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترتیب پا کر تیسری زبان پیدا ہوگئی اور اسے ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آئندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان ٹھہری۔ اور یوں ہماری زبان نے فصاحت اور انشا پردازی کا تمغہ لے کر شائستہ زبانوں کے دربار میں عزت پائی۔ اہل ہند کو ان کی عظمت کے سامنے ہمیشہ ادب اور ممنونی کا سر جھکانا چاہیے ایسی طبیعتیں کہاں پیدا ہوتی ہیں۔''

سودا کا تعلق دبستانِ دلی سے تھا۔ وہ ان اساتذہ میں ہیں جنہوں نے اصناف نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، ہجو، مرثیہ، شہر آشوب ان کے خاص میدان ہیں۔ ہجوگوئی میں آج تک ان جیسا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ ''آبِ حیات'' میں درج ہے۔ ''ذرا سی ناراضگی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے۔ غنچہ نام ان کا ایک ملازم تھا۔ ہر وقت خدمت میں حاضر رہتا اور ساتھ قلم دان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے ''ارے غنچہ لا تو میرا قلمدان۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں'' پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے۔ گرمیٔ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخی طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی۔ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی کسی طرح کے فکر و تردد کو پاس نہ آنے دیتی تھی۔ گرمیٔ مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی اور اس شدت کے ساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا نہ کوئی خطرہ اسے دبا سکتا تھا۔''

سودا ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ اپنے اظہار کے لئے بڑی سنگلاخ زمینیں منتخب کرتے ہیں مگر اپنے زورِ بیان اور زبان آوری کی وجہ سے ہر شعر اس روانی سے کہتے کہ مشکل سے مشکل بحر پانی ہو جاتی ہے۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

****

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

****

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

اور یہ شعر تو زبان زدِ خاص و عام ہے

دل کے پرزوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

''آبِ حیات'' میں ایک حکایت درج ہے کہ جب فخرِ شعرائے ایران شیخ علی حزیںؔ واردِ ہندوستان ہوئے۔ پوچھا کہ

شعرائے ہند میں آجکل کوئی صاحب کمال ہے۔ لوگوں نے سودا کا نام لیا۔ سودا خود ملاقات کو گئے۔ شیخ کی عالی دماغی اور نازک مزاجی شہرہ آفاق تھی۔ نام ونشان پوچھ کر کہا کچھ اپنا کلام سناؤ۔

سودا نے کہا۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شاعری کی ایک اور صنف جس میں سودا نے بڑا نام پیدا کیا وہ ہے ''شہر آشوب۔'' ان کا سب سے مشہور ''شہر آشوب'' دلّی شہر کی تباہی و بربادی کے موضوع پر ہے۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانوا ڈول

انہوں نے اپنے شہر آشوبوں میں اپنے عہد کے معاشرے کی خامیوں اور کمزوریوں سے پردے اٹھائے ہیں اور جس طرح سماجی، اخلاقی اور سیاسی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان سے سلطنت مغلیہ کی کسمپرسی کا حال بڑی خوبی سے واضح ہوتا ہے۔ عوام کی مجبوری و فاقہ کشی، غنڈوں اور بدمعاشوں کی چیرہ دستیاں اس طرح ہمارے سامنے آتی ہیں کہ اس سے مغل بادشاہی کی بے بسی اور اس دور کی افراتفری کی ایک تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

فیض صاحب نے سودا کے بہت سے اشعار کو حسبِ ضرورت اپنی غزلوں اور نظموں میں پرودیا ہے۔ ان کی ایک مشہور نظم ہے ''ہم تو مجبورِ وفا ہیں''، جس کے آخری بند میں سودا کے یہ دو شعر انہوں نے اس خوبصورتی سے جڑے ہیں کہ بعض لوگ تو ان کو فیض ہی کے شعر سمجھتے ہیں۔

بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
جو گزری ہم پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

سودا کی شاعری کا یہی سحر ہے۔ جس نے فیض صاحب سے ان کی مدح میں یہ غزل کہلوائی

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں
قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں
یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں
گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغِ غزلخواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمئ گفتار کروں یا نہ کروں
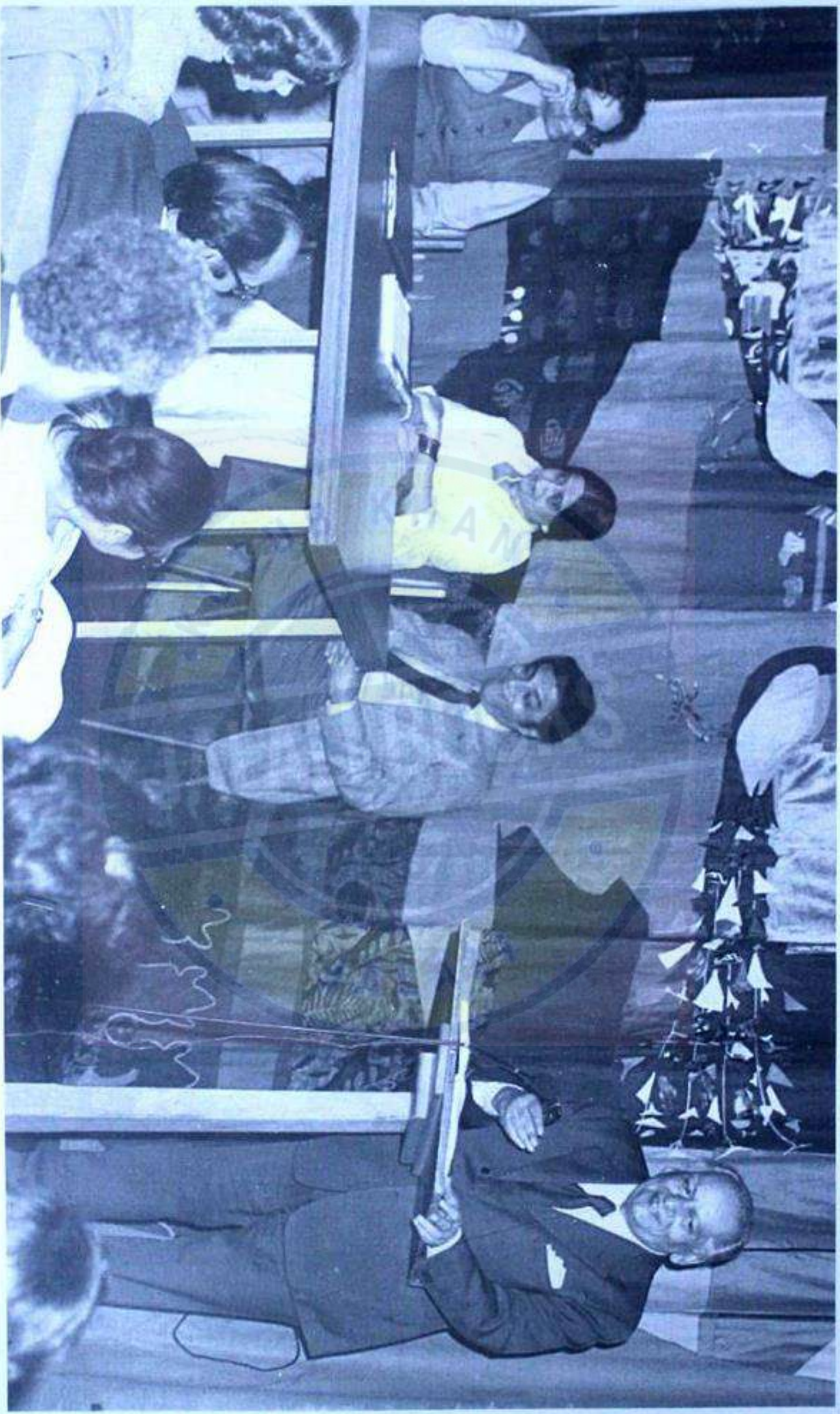
اردو مرکز لندن۔ فیض صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ اسٹیج پر ضیاء محی الدین، زہرہ نگاہ اور افتخار عارف

موری ارج سنو

اردو زبان کے پہلے شاعر امیر خسرو سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں آگرہ کے نزدیک ایک بستی پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ترکوں کے لاچن قبیلے سے تھا اور چنگیز خان کے حملے کے وقت اُن کے آباؤاجداد بھاگ کر پٹیالی آ گئے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی زندگی میں دہلی سلاطین کے تین خاندان دیکھے۔ خاندانِ غلاماں، خاندانِ خلجی اور خاندانِ تغلق۔ وہ بچپن ہی سے بڑے ذہین اور تخلیقی ذہن کے مالک تھے اور 20 سال کی عمر تک تمام مروجہ علوم پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک عظیم صوفی بھی تھے۔ وہ دنیا کے اُن ارباب کمال میں تھے جنہیں بلاشبہ Genius کہا جا سکتا ہے۔

امیر خسرو کو ہندوستانی موسیقی سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ انہوں نے بہت سے ساز ایجاد کیے جن میں ستار اور طبلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے عقیدت مند اور نہایت چہیتے شاگرد تھے۔ فن موسیقی، طریقت اور تصوف میں انہیں خواجہ صاحب کی صحبت ہی سے فیض ملا۔ گلوکاری کے ضمن میں قوالی کی ایجاد بھی انہوں نے اپنے پیرو مرشد کی خواہش پر کی۔ اس کا پس منظر تاریخ میں یوں رقم ہے کہ علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں ایک نامور موسیقار گوپال داس اپنے ساتھیوں کو لیکر دہلی پہنچا تاکہ دربار میں اپنی مہارت کا سکہ جما سکے۔ وہ چاہتا تھا کہ فن موسیقی میں امیر خسرو سے مقابلہ کرے۔ اس ضمن میں امیر خسرو نے اپنے پیرومرشد کی اجازت سے بارہ بچوں کی ایک ٹولی تشکیل دی، جنہوں نے دنیا کی پہلی قوالی پیش کی۔ دربار میں موسیقی کے اس مناظرے نے ایک سماں باندھ دیا۔ قوالی سننے کے بعد گوپال داس اور اس کے ساتھی اس نئے دھرم سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُن سب نے اسلام قبول کر لیا۔ ان بارہ بچوں کی ٹولی اور ان کی آئندہ نسلیں "قوال بچوں کے گھرانے" سے موسوم ہوئیں۔ یہ کڑی آج تک چلی آ رہی ہے۔

فیض صاحب امیر خسرو کے بے حد گرویدہ تھے۔ ان کے زمانے سے تقریباً چھ سو سال بعد پیدا ہونے والے فیض احمد فیض میں اور خسرو میں بہت سی اقدار مشترک تھیں۔ دونوں کلاسیکل شاعر تصور ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان دونوں کی شاعری کی جڑیں عوام میں ہیں اور اُن کے شعر اپنے اپنے دور کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ مماثلت یہ بھی تھی کہ خسرو کی طرح فیض صاحب نے بھی سات سے زیادہ حکمرانوں کے زمانے دیکھے۔

امیر خسرو اپنے دور کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ خصوصاً عام لوگوں میں اُن کی بہت مقبولیت تھی۔ انتظار حسین نے

بڑے شگفتہ انداز میں اپنی کتاب ''دلّی جو ایک شہر تھا'' میں ان کا ماجرا یوں قلمبند کیا ہے۔

''ایک نئے معاشرے کی نمود ہے۔ ایک نئی تہذیب ظہور کر رہی ہے۔ دربار کی اپنی شان ہے۔ خانقاہوں کا اپنا وقار۔ گلی کوچوں کی اپنی اپنی گہما گہمی۔ بازاروں کا اپنا بھیڑ بھڑکا اور ایک شاعر ہے جس کا ایک قدم دربار میں ہے اور دوسرا خانقاہ میں۔ پھر شہر کے گلی کوچے اور بازار بھی اس کے قدموں کی زد میں ہیں۔ دربار میں اور دربار سے دور شیراز تک اس کی فارسی شاعری کا طوطی بولتا ہے۔ اس زور پر ''طوطی ہند'' کا خطاب پایا ہے۔ مگر گلیوں بازاروں میں دوسری ہی زبان میں رواں نظر آتا ہے۔

ایک نکڑ پر ایک ساقن نے اپنا بھنگر خانہ سجا رکھا ہے۔ بھنگی چرسی یہاں آکر پھڑ جماتے ہیں۔ شاعر کا اُدھر سے گزر ہوتا ہے تو ساقن اُٹھ کر سلام کرتی ہے۔ حقہ بھر کر پیش کرتی ہے۔ شاعر نے حقہ کی نے منہ میں دبائی دو گھونٹ لیے، ساقن سے دو میٹھے بول بولے اور اپنی راہ لی۔ ساقن نے ایک روز عجب سوال ڈالا کہ ''اے امیر میں تیرے واری صدقے۔ تو نے کتنے راگ راگنی بنائے۔ غزلیں اور گیت کہے۔ اس بخت ماری بھٹیارن کے کہنے پر اس کے لونڈے کے لیے ''خالق باری'' بھی لکھ دی۔ ارے کوئی چیز اس لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔'' طبیعت رواں تھی۔ ساقن کی فرمائش فوراً پوری ہوئی۔

اوروں کی چوپہری باجے چھو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں، آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جن میں ناہیں تومل
اور کے جہاں سینگ سماوے چھو کے ہاں موسل''

فیض صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں خسرو کے بارے میں یہی بات بہت صراحت کے ساتھ لکھی ہے۔

''امیر خسرو صحیح معنی میں انسان دوست تھے۔ وہ بیک وقت نسل و نسبت کے جاگیردارانہ تصوّر کے مخالف تھے اور کٹر ملائیت کی سنگ دلی کے بھی۔ وہ ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتوں، بادشاہوں کے ساتھ بھی اسی طرح گھل مل جاتے تھے جیسے ادنیٰ جولاہوں، دھوبیوں، کسانوں اور مزدور پیشہ عورتوں کے ساتھ۔ وہ ان سبھی کے لئے لکھتے اور نغمہ سرائی کرتے۔ انہوں نے بادشاہوں اور سرداروں کی شان میں مرصع قصیدے تصنیف کیے، اہل علم کے لئے گہری تاریخی اور فلسفیانہ موشگافیاں کیں۔ دینداروں اور عامیوں کے لئے نرم و نازک اور پُر اثر غزلیں کہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے دو سخنے، گھر والیوں کے لئے پہیلیاں، کہہ مکرنیاں۔ تھکے ہوئے بوڑھوں اور محبت کی متوالی دوشیزاؤں کے لئے سیدھے سادے گیت۔''

تو یہ تھے طوطی ہند امیر خسرو، جن کو فیض صاحب اپنا مرشد گردانتے تھے اور جن کے حضور انہوں نے یہ ارج گزاری ہے۔

''موری ارج سنو دست گیر پیر''

''مائی ری، کہوں کا سے میں
اپنے جیا کی پیر''

"نیا باندھورے،
باندھورے کنار دریا،"
''مورے مندر اب کیوں نہیں آئے''

اِس صورت سے
عرض سناتے
درد بتاتے
نیا کھیتے
منّت کرتے
رستہ تکتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
اب جا کر یہ بھید کُھلا ہے
جس کو تم نے عرض گزاری
جو تھا ہاتھ پکڑنے والا
جس جا لاگی ناؤ تمہاری
جس سے دُکھ کا دارُو مانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تو تمہیں تھے
وہ تو تمہیں تھے

☆......☆......☆

خونچکاں دہر کا خونچکاں آئینہ

بین الاقوامی واقعات

یہ تیرا کفن وہ میرا کفن، یہ میری لحد وہ تیری ہے
ہستی کی متاع بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
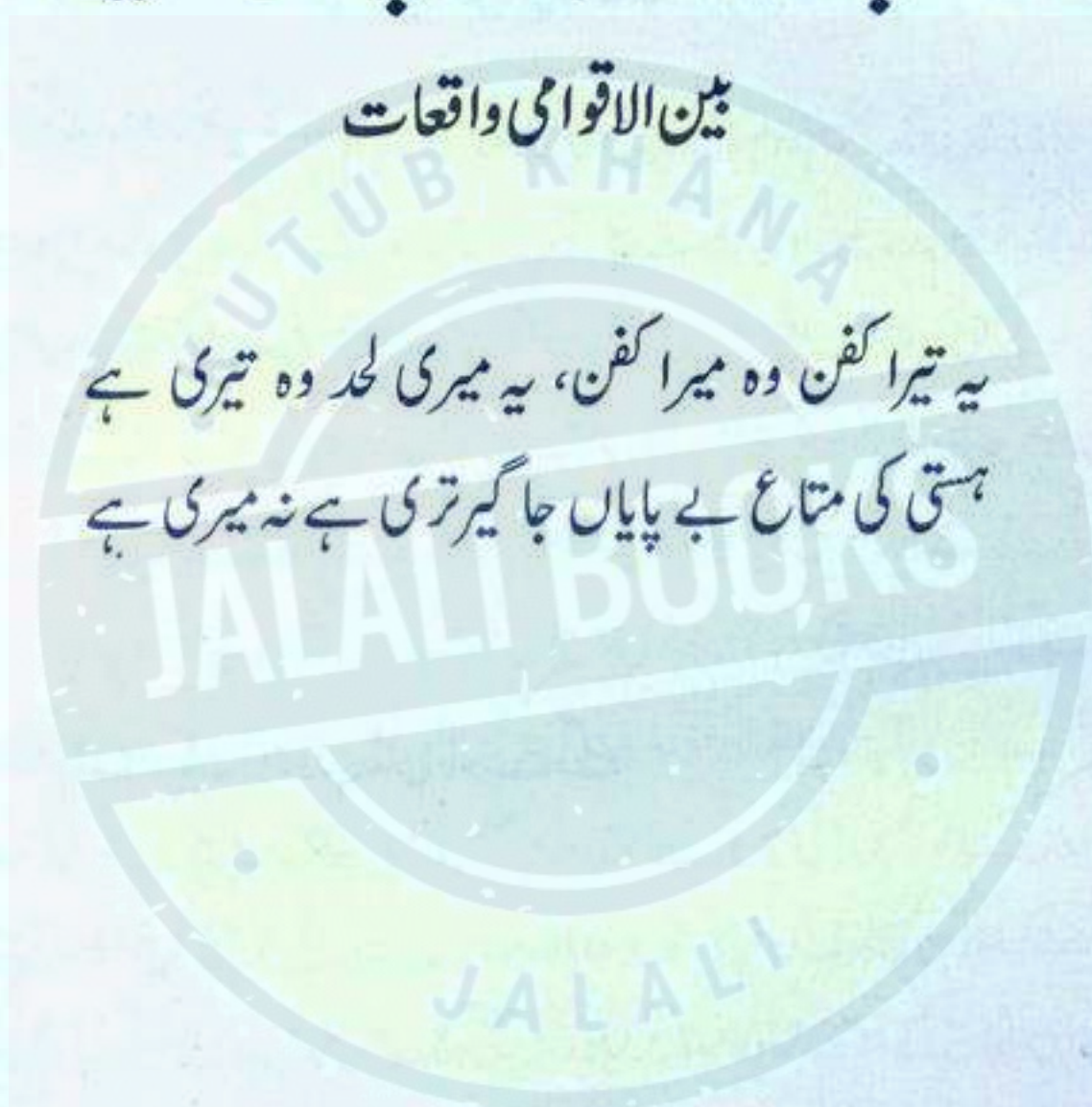
اے دلِ بیتاب ٹھہر

پیکنگ اور سنکیانگ

مرے ہمدم مرے دوست

سیاسی لیڈر کے نام

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
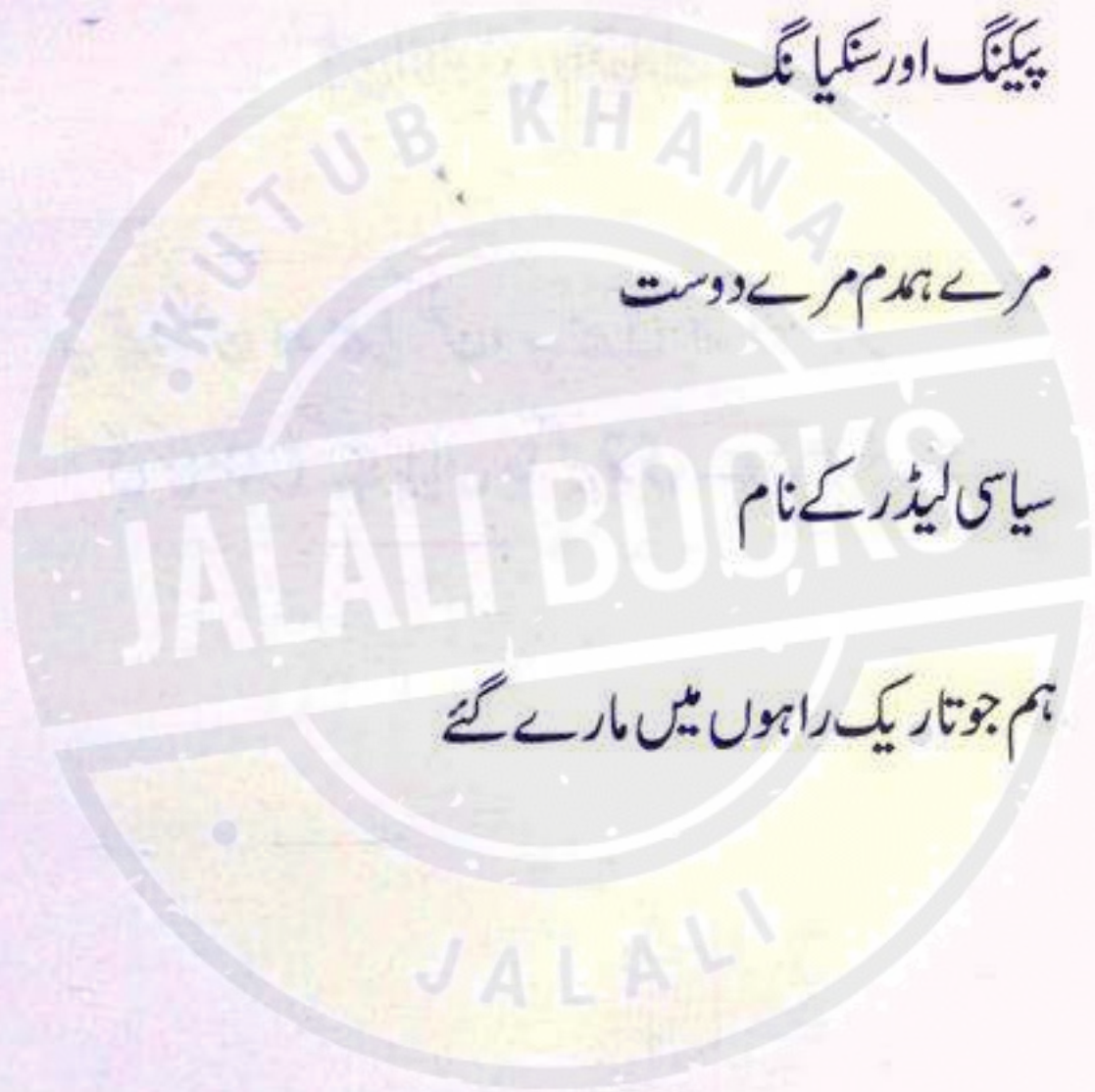
اے دلِ بیتاب ٹھہر

1940-41ء میں جنگِ عظیم دوم کے مہیب سائے ساری دُنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ہٹلر اور اُس کے حواریوں نے کمیونسٹوں، جمہوریت پسند قوتوں اور یہودیوں کو نیست و نابود کرنے کے بھیانک جرائم کا بازار گرم کیا ہوا تھا۔ یورپ کے بیشتر ملکوں کو فتح کرنے کے بعد اٹلی اور جرمنی کی فاشسٹ افواج نے افریقی براعظم پر بھی یلغار کر دی تھی۔ انگلستان اور اس کے یورپی حلیفوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا تھا۔ اُدھر جاپان بھی فسطائی طاقتوں کی جانب سے جنگ میں شامل ہونے کے لیے پر تول رہا تھا اور چین کے بہت سے علاقوں کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد مشرقِ بعید کی یورپی کالونیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ 1943ء میں جاپان نے برما پر بھرپور حملہ کر دیا تو برطانوی فوج اس کی تاب نہ لاتے ہوئے تتر بتر ہو گئی۔ اُدھر ہٹلر مکمل طور پر یورپ کے زیادہ تر ملکوں کو تاراج کر کے اُن پر غلبہ پا چکا تھا اور فتوحات کے نشہ میں چُور اب اس نے سوویت یونین کے خلاف بھی جنگ کا آغاز کر دیا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں روس کے اندر گھس آئی تھیں۔ برطانوی وزیرِاعظم ونسٹن چرچل نے جو یوں تو کمیونسٹوں کے جانی دشمن تھے، اس نازک لمحہ کو گرفت میں لے کر اسٹالن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور سوویت یونین نے جو پہلے ہی فاشزم کو آزادی اور انسانیت کا دُشمن قرار دے چکا تھا۔ اتحادی افواج کے ساتھ اتحاد کا فیصلہ کر لیا۔ روس کی جنگ میں شمولیت نے صورتِ حال کو یکسر بدل دیا۔ دنیا بھر کے کمیونسٹوں کے نزدیک اب یہ جنگ ''پیپلز وار'' قرار پائی۔

ہندوستان میں بھی اس اتحاد کا فوری اثر یہ ہوا کہ جیلوں میں بند ہندوستانی کامریڈوں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو رہا کر دیا گیا اور بائیں بازو کی تنظیموں سے پابندی اُٹھالی گئی۔ اُن انقلابیوں نے جنگ میں حصہ لینے اور اتحادیوں سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا اور سامراجی قوتوں کی بھرپور مدد کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ہندوستان کے ترقی پسند اہلِ قلم کی ایک بڑی تعداد جس میں مجید ملک، ایم ڈی تاثیر اور چراغ حسن حسرت شامل تھے، برطانوی فوج کی ملازمت میں آ گئی۔ نوجوان فیض احمد فیض بھی اپنے بزرگ دوستوں کے مشورے سے فوج کے تعلقاتِ عامہ کے محکمہ سے منسلک ہو گئے۔ گو اپنے اس عمل کی وجہ سے وہ سب تنقید کا نشانہ بھی بنے خاص طور پر فیض صاحب کا تو ساری زندگی اس سوال سے پیچھا نہیں چھوٹا کہ اُنھوں نے فرنگی فوج کی افسری کیوں قبول کی۔ اُنھوں نے بار بار اس کی وضاحت کی اور اپنے ناقدین کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ''جب ہٹلر اور مسولینی کی قیادت میں نازی اور فسطائی تحریکوں نے زور پکڑا تو

دنیا بھر کے باشعور دانشور اس عالمگیر خطرے کی مخالفت میں کمربستہ ہو گئے۔ ابتدا میں تو یہ جنگ سامراجی طاقتوں کے درمیان جنگ تھی مگر جب جاپانی جنگ میں آدھمکے اور برما کو فتح کر کے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئے تو ہمارے لیے یہ دور دراز حریفوں کی جنگ نہ رہی بلکہ اس کے شعلوں کی آنچ اپنے گھر تک آپہنچی۔ تب ہم نے محسوس کیا کہ اب غیر جانبداری ناممکن ہے۔"

بہرکیف جب جنگ اپنے اختتام کو پہنچنے والی تھی اور اتحادی افواج کی فتح و کامرانی یقینی ہو گئی تھی تو فیض صاحب نے یہ محسوس کر لیا کہ اب مغربی طاقتوں کے عزائم کچھ اور ہیں۔ جنگ ختم ہو رہی تھی مگر ایک نئی جنگ شروع ہو چکی تھی جسے تاریخ نے "سرد جنگ" کا نام دیا۔ مغربی ممالک کی روس کے خلاف اس سازش نے اس کے حمایتیوں کے سارے خواب ملیامیٹ کر دیے۔ اُن کی یہ اُمیدیں کہ جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستان غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کر لے گا، ختم ہو گئیں۔ فیض صاحب نے فوج سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس اُمڈتی ہوئی تیرگی کی آمد میں نوحہ کناں ہو گئے۔ اس زمانے کی یہ نظم انہیں احساسات کا عکس ہے۔ وہ صورتِ حال سے فکرمند اور غم زدہ ہیں مگر اس اندھیرے میں بھی دور سے انہیں "صبح کی دھڑکن" کی صدا آ رہی ہے۔

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر
ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی
اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گراں باریٔ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

☆......☆......☆

احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض

پیکنگ اور سنکیانگ

انقلابِ چین اور قیام پاکستان تقریباً ایک ہی زمانہ کی بات ہے۔ ہمالیہ کے دونوں طرف آباد یہ دونوں ملک اس لحاظ سے ہم عمر ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے رشتے صدیوں پُرانے ہیں۔ نہ صرف تجارتی اور ثقافتی بلکہ سفارتی اور سیاسی سطح پر بھی دونوں ملکوں نے سامراجی طاقتوں کے ظلم برداشت کیے اور دونوں نے غلامی اور محکومیت کی زندگی کا طویل عرصہ گزارا۔ دونوں ملکوں میں پائے جانے والی بے چینی، اور بدلتے ہوئے حالات سے اہل علم و دانش واقف تھے۔ تب ہی تو علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

یہ اشعار انقلابِ چین سے برسوں پہلے لکھے گئے۔ انہیں دنوں اقبال نے یہ بھی کہا تھا۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

یہ انقلاب کی آمد تھی۔ چین میں بھی اور برصغیر میں بھی۔ برصغیر میں جمہوری تحریک کے ذریعہ تبدیلی آئی اور چین میں اشتراکی انقلاب کے زور پر۔

1949ء میں چین کے انقلاب نے یہ ثابت کردیا کہ قوت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں۔ اُن کے جذبے میں بڑی طاقت ہے۔

جذبہ کے سامنے بڑی بڑی استحصالی طاقتیں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ اشتراکیت کا نظام سب سے پہلے روس میں قائم ہوا تھا اور سوویت یونین دنیا کا پہلا اشتراکی ملک تھا۔ چین کے انقلاب کے بعد اشتراکیت کے پیروکار یہ کہنے لگے کہ سوشلزم اب اس دنیا کا مقدر ہو چکا ہے۔ انسان جاگ اٹھا ہے۔ اگرچہ جنگ طویل اور دشوار ہوگی مگر لازمی طور پر اس کا اختتام ایک ایسے معاشرے کی تخلیق پر ہوگا جہاں ظلم وستم کی رات ختم ہو جاتی ہے۔ چین کے انقلاب کے بعد سوشلزم ایک بڑی طاقت کے طور پر اُبھرا مگر جلد ہی روس اور چین کے اختلافات نے اس طاقت کو کمزور کر دیا۔ روسی اور چینی اشتراکیت کے نظریوں اور طرزِ عمل میں جو فرق تھا وہ آنے والے وقت میں بڑھتا گیا اور یہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان دو دھڑوں کو مارکسٹ اور ماؤسٹ کے ناموں سے پہچانا جانے لگا۔ فیض صاحب روسی کمیونزم کے طرف دار تھے۔ مگر اپنی روایتی نرم مزاجی اور صلح پسندی کی وجہ سے کہتے تھے ''بھئی مجھے یہ روس اور چین کا جھگڑا پسند نہیں ہے۔ اب اگر انہوں نے جھگڑا کھڑا ہی کر دیا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

اُن کا مؤقف تھا کہ سوشلزم تو ایک طریق کار ہے۔ کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ ایک بار انہوں نے ذاتی طور پر وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ "ہم روسی کمیونسٹوں کے حامی ضرور ہیں مگر نظمیں تو ساری ہم نے چین پر لکھی ہیں۔ روس پر تو ایک بھی نہیں لکھی۔"

چین کے بارے میں ان کی تین نظمیں ہیں جو فیض صاحب نے 1956ء میں اپنے چین کے دورے کے بعد لکھیں۔ وہ پاکستان کے صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ چین گئے تھے۔

چین کی جرنلسٹ یونین نے اس وفد کی بڑی خاطر مدارات کی اور ایک مہینے کے طویل قیام کے دوران اپنے وسیع ملک کے طول وعرض کے دورے کرائے۔ صحافیوں کا یہ وفد جس کی قیادت فیض صاحب کر رہے تھے چین کے جس شہر میں بھی پہنچا وہاں کے رہنے والوں نے اپنے پاکستانی ساتھیوں کا پُر جوش استقبال کیا۔

فیض صاحب چین کے اس دورے سے بہت متاثر ہو کر واپس آئے تھے۔ انہوں نے دو نظمیں وطن واپسی کے بعد لکھیں اور یہ نظم چین کے شہر ''ہانگ چاؤ'' میں لکھی۔ یہ نظم بڑے خوبصورت اشعار سے مزین ہے۔

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

اور آخری شعر

ملے کچھ ایسے جُدا یوں ہوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گُل ہے داغ نہیں

دوسری نظموں کے عنوان بھی چین کے دو بڑے شہروں پر ہیں۔ ایک ''پیکنگ'' جو عوامی جمہوریہ چین کا دارالحکومت ہے اور اب بیجنگ کہلاتا ہے اور دوسرا ''سنکیانگ'' جو ملک کا ایک بڑا شہر ہے۔

پیکنگ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

مرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
مرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
مری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کن فیکوں

سنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہ سوار
صبحدم موت کی وادی کو روانہ ہوگا!
اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا
کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں
وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا
اب کوئی جنگ نہ ہوگی مئے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

☆......☆......☆

مرے ہمدم مرے دوست

1930ء کی دہائی ہماری دنیا کی تاریخ میں شاید سب سے المناک زمانہ تھا۔ اس کا آغاز اسپین کی خانہ جنگی سے ہوا۔ یورپ کی فسطائی قوتوں نے گٹھ جوڑ بنالیا اور بعد ازاں جرمنی اور اٹلی کے ساتھ جاپان بھی اس انسانیت سوز معرکہ میں شریک ہوگیا۔ پہلے یورپ اور پھر ساری دنیا اس ہولناک جنگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ تاریخ نے ہلاکت اور ظلم واستبداد کے ایسے نظارے دیکھے جن کا تصور بھی مشکل تھا۔ لاکھوں انسان ہلاک ہوئے۔ ان گنت عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوگئے۔ اس تباہی اور بربادی کو روکنے کے لئے ساری آزاد دنیا کی جمہوری قوتیں متحد ہوگئیں اور جس حد تک ممکن تھا، قتل وغارت گری کے بڑھتے ہوئے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس جنگ کی آگ کی لہریں اور تپش افریقہ اور ایشیا کے ملکوں تک بھی پہنچی جن میں ہندوستان بھی شامل تھا۔ چار پانچ برسوں پر محیط اس جنگ نے ساری دنیا کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ کرہ ارض پر پھیلے ہوئے ہر ملک میں ہر صبح آنسوؤں، سسکیوں، آہوں اور چیخ وپکار کے ساتھ طلوع ہوتی تھی اور ہر شام ماتم اور آہ وزاری کی صداؤں کے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ دنیا مکمل طور پر ہلاکت اور بربریت کے طوفان میں گھری ہوئی تھی۔

ہندوستان اور ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے یہ ایک طرح سے دہرا معرکہ تھا۔ اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کی غلامی سے نجات اور فسطائی قوتوں کے دہشتناک چنگل سے محفوظ رہنے کی کوشش کی۔ اب برصغیر کے لوگ بھی بلاواسطہ اور بلواسطہ اس جنگ میں شریک ہوگئے تھے۔ فیض صاحب کی یہ مشہورِ زمانہ نظم اسی دور کی تخلیق ہے۔ اس دور کے دوسرے ہندوستانی شاعر بھی جن میں مجاز، مخدوم، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور ن م راشد وغیرہ شامل تھے۔ فسطائیت کے زوال کے ساتھ ساتھ سامراجی طاقتوں کی پسپائی کے بھی آرزومند تھے۔ ''میرے ہمدم میرے دوست'' اسی پس منظر میں لکھی گئی ایک لافانی نظم ہے۔ عزیز حامد مدنی نے اپنے مخصوص دانشورانہ انداز میں اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''دوسری جنگِ عظیم میں یورپین اور انگریزی زبان کے شعراء کے جذبات میں ان کے ذاتی کرب کے ساتھ اس ہلاکت کے طوفان میں انسانیت کے لئے مماثل دکھ ہے۔ اس مماثلت کی مثال لوئی آراگوں اور فیض کی نظموں میں اپنی اپنی تاریخ کی تفریق کے ساتھ ملتی ہے۔ لوئی آراگوں کی نظم کا عنوان ہے ''وہ یقین نہیں کریں گے۔''

وہ یقین نہیں کریں گے کہ میں نے اپنی موجِ نفس کے ساز پر

عوامی دھنوں میں کیف آگیں گیت گائے تھے
کہ آمد بہار کی رو میں اور ارغنوں پر
آسمانی لب و لہجے اور تمام اشیا کے آہنگ کی یکتائی میں
میں نے یہ گیت کہے تھے

یقین دلوانا رائیگاں ہوگا کہ میں نے یہ گیت
وحشی سازوں پر گائے تھے
ہر خطِ فاصل سے ٹکراتے ہوئے کہے تھے
اس طرح کہے تھے جیسے قومی جنگل کو آگ لگا دی جائے
جس طرح اعلانِ جنگ کیا جائے
جس طرح روئی کے انبار سے دوزخی شعلے اُگل رہے ہوں"

لوئی آراگوں کی نظم میں آزاد ملک کے عوام کی نفسیات ہے جو شاعر کی ابیات کو ان آفات میں بھی ایک نغمہ سمجھ کر زندگی کی دشواریوں کی توقیر کرتے ہیں اور شاعر پلٹ کر ان سے کہتا ہے کہ یہ گیت کیا میں خود تمہارا ہوں۔ فیض کے یہاں بھی یہی آرزو ہے مگر وہ جانتے ہیں کہ اس نامرادنا سور کا جو غلامی نے پیدا کر دیا ہے نشتر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ دونوں نظموں میں روایات الگ الگ ہیں۔ ماحول الگ الگ ہے مگر حسن کاری ایک سی ہے۔ اس پُر درد نظم کا مخاطب ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام ہیں۔

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر تیرا اُجڑا ہُوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے ڈھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست!
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں

میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیّاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہُوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفّاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لئے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بُنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دُکھ کا مُداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

☆......☆......☆

سیاسی لیڈر کے نام

یہ نظم ایک سیاسی لیڈر کے نام ہے اور خیال ہے۔ اس کے مخاطب مہاتما گاندھی ہیں۔ یہ نظم اس وقت لکھی گئی جب دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی اور فسطائی طاقتیں آزاد ملکوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرتی جا رہی تھیں۔ ایشیا میں جاپان نے بھی ان کے ساتھ شمولیت اختیار کرلی تھی۔ فاشسزم کے اس خطرناک سیلاب کو روکنے کے لیے ساری جمہوری اور اشتراکی قوتیں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا تھا مگر یہاں کا ماجرا کچھ جدا تھا۔ ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی منزل اگرچہ ایک تھی مگر دونوں کے نظریات مختلف تھے۔

فاشسزم اپنی برتر عسکری صلاحیتوں اور موثر پروپیگنڈے کی وجہ سے ان ملکوں میں تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا جہاں کے عوام ناخواندہ، کم علم اور سیاسی حالات سے بے خبر تھے۔ دانشوروں، صحافیوں اور ادیبوں کے ساتھ سیاسی جماعتوں میں بھی فسطائی سوچ کا رجحان پیدا ہونے لگا تھا۔ ایک بار فیض صاحب نے کانگریس پارٹی میں فاشسزم کے بڑھتے ہوئے عمل دخل کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ یہ بات جنگِ عظیم کے آغاز سے پہلے کی ہے جب اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہو رہا تھا، لیکن 1941ء کے بعد کہ جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور کمیونسٹ کھل کر فاشسزم کی مخالفت کرنے لگے تو فیض صاحب کو مہاتما گاندھی کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی جو Quit India ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے اعلان سے متعلق تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے مہاتما گاندھی کے رتبہ کا سیاستداں فاشسزم فلسفہ کا ہمنوا ہونے لگا ہے۔ مہاتما گاندھی بلاشک ہندوستان کے بہت بڑے سیاسی رہنما تھے اور جس طرح قائداعظم محمد علی جناح مسلم لیگ کے سب سے عظیم لیڈر تھے اسی طرح مہاتما گاندھی انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے بڑے نیتا تھے۔

مہاتما گاندھی کا اصل نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ وہ کاٹھیاواڑ کے رہنے والے تھے اور وہاں کی ریاست راجکوٹ میں 1869 میں پیدا ہوئے تھے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور وہاں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وطن واپس آئے۔ انہوں نے بمبئی میں وکالت کا آغاز کیا مگر کامیابی نہ ہوئی اور وہ جنوبی افریقہ چلے گئے جہاں بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کی آبادی تھی۔ وہاں ہندوستانیوں کے ساتھ انگریز حاکموں کا ذلت آمیز سلوک دیکھ کر گاندھی جی نے اپنے ہم وطنوں کے حقوق کے لیے آواز اُٹھائی اور جلد ہی ایک مقبول لیڈر بن گئے۔ اُنہوں نے افریقہ میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی۔ دنیا کے لیے یہ

مدافعت کا ایک بالکل انوکھا طریقہ تھا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے مغربی طور طریقوں سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرلی۔ مغربی لباس ترک کر دیا اور کھدر کی دھوتی کُرتا اور پگڑی پہننے لگے۔ بعد میں دھوتی اور کُرتے کو بھی خیر آباد کہہ دیا اور صرف لنگوٹی کو اپنی پوشاک بنالیا۔ مرتے دم تک اُن کا یہی طریقہ رہا۔

پہلی جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی وہ افریقہ چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گئے اور انگریزی سامراج کے خلاف اپنی طویل جدو جہد کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے اہنسا یعنی عدم تشدد کی راہ اپنائی۔ وہ اپنا پیغام انگریز حکومت اور ساری دنیا کو پہنچاتے رہے۔ کبھی لانگ مارچ کے ذریعہ، کبھی مرن برت کے ذریعہ اور کبھی سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعہ۔ 1942ء میں جب انہوں نے Quit India کی تحریک چلائی تو جنگ عظیم میں اپنی کمزور پوزیشن کے سبب انگریز ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ مراعات دینے کے لئے تیار تھے۔ وہ جنگ ہار رہے تھے۔ مہاتما گاندھی نے ایسے وقت میں Quit India یعنی ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ لگایا۔ یہ تحریک بڑی سرعت کے ساتھ سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے حکومت کے لئے ایک بڑا مسئلہ بن گی۔ اس کا زور اتنا بڑھا کہ حکومت بوکھلا گئی مگر پھر اچانک بلا کسی سبب کے گاندھی جی نے تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ترقی پسند حلقوں نے اسے نہ صرف ہندوستانیوں کے مفاد کے خلاف سمجھا بلکہ ایک طرح بالواسطہ طور پر فسطائی طاقتوں کی پوزیشن مضبوط کرنے کے مترادف قرار دیا۔ فیض صاحب نے انہیں حالات میں یہ نظم تخلیق کی جس پر ڈاکٹر آفتاب احمد نے مختصر لیکن بہت جامع انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''سیاسی لیڈر کے نام اسوقت لکھی گئی جب گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کرنے کے بعد عین اس وقت اسے روک لیا جب وہ اپنے عروج پر تھی اور جمہوری قوتوں کی تحریک بنتی جا رہی تھی۔''

لدمیلا وسلیئیوا کا اس نظم کے بارے میں خیال ہے کہ'' دوسری جنگِ عظیم کے ابتدائی سالوں میں لکھی گئی اس نظم کا تخاطب جیسا کہ خود فیض نے صراحت کی ہے مہاتما گاندھی سے ہے۔ فیض آزادی کی جدوجہد کے ذرائع کے بارے میں گاندھی جی کے نظریات سے متفق نہیں تھے اور سب ہی مسائل کے حل کے لئے ہر حالت میں عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہنے کو نظریاتی اور عملی اعتبار سے انتہائی مضر سمجھتے تھے۔''

ایک ہندوستانی ادیب رام لال نے لکھا ہے کہ دہلی کی مشہور تعلیمی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین کی زیر صدارت ایک مشاعرہ ہوا۔ اس یادگار موقع پر مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح بھی مدعو تھے اور یہ دونوں عظیم لیڈران اسٹیج پر موجود تھے۔ اس مشاعرے میں پہلی بار فیض نے اپنی یہ نظم پڑھی۔ مگر انہیں اس محفل میں خاطر خواہ داد نہیں ملی۔ یہ 1946ء کا واقعہ ہے۔

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہُوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نُور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہوجائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

☆......☆......☆

ہم جوتاریک راہوں میں مارے گئے

ایتھل اور جولیس روزن برگ جوڑے کو جو امریکی شہری تھے، 1953ء میں سوویت یونین کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں موت کی سزادی گئی تھی۔ ان پر اس دور کی سب سے بڑی متنازعہ عدالتی کارروائی کے بعد 30 مارچ 1951ء میں ملک سے غداری کے الزام میں یہ فیصلہ سنایا گیا تھا۔ روزن برگ کی غداری کی خبر سب سے پہلے 1950ء میں مشتہر ہوئی جب ایک جرمن سائنسدان نے جسے لندن میں گرفتار کیا گیا تھا، حکومت برطانیہ کو امریکہ میں سوویت یونین کے ایک خفیہ گروہ کے بارے میں تفصیلات مہیا کیں۔ اس نے یہ انکشاف کیا کہ امریکن آرمی کے سگنل کور میں کام کرنے والے جرمن نژاد سائنس دان جولیس روزن برگ جوہری توانائی سے متعلق خفیہ معلومات سوویت یونین کو فراہم کرتے ہیں۔

عزیز حامد مدنی نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے "فیض صاحب کی یہ معرکۃ الآرا نظم فکری دنیا کے ایک بنیادی سوال سے تعلق رکھتی ہے کہ کیا کوئی بھی تخلیقی کام، دریافت یا ایجاد جس کا تعلق پوری انسانیت سے ہو کسی قومی مفاد کے لیے صیغہ راز میں رکھی جاسکتی ہے؟۔ دانشوروں کے لئے یہ مسئلہ اس صدی میں ایک اہم بحث کا موضوع بنا۔ اس واقعہ کو سائنسی دنیا کی ایک بڑی تمثیل سمجھا گیا جس میں شہادتیں بھی دنیا کے بڑے سائنسدانوں کی تھیں۔''

عدالتی کارروائی کے دوران امریکی عوام میں ملزم کے لیے ہمدردی کے جذبات فروغ پانے لگے۔ اس زمانے میں امریکہ میں کمیونسٹ دشمنی کی زبردست تحریک چلی ہوئی تھی جس کے روح رواں امریکی سینیٹر جوزف میکارتھی تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سوویت یونین کو ختم کردیا جائے۔ ان کے اس فلسفے کو ''میکارتھی ازم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کی تشہیر اس قدر موثر انداز میں کی کہ دنیا بھر میں خاصی بڑی تعداد میں لوگ ان کے ہمنوا ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کے اثرات سے امریکہ کی عدلیہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جس جج نے روزن برگ کو سزا سنائی۔ اس کا یہ فقرہ اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ ''مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ کی حرکتوں اور کارکردگی کی وجہ ہی سے کوریا میں کمیونزم کو فروغ ملا جس کے نتیجہ میں پچاس ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے۔''

سزائے موت کے اس فیصلہ کو ساری دنیا کے روشن خیال لوگوں نے ایک سنگین فیصلہ قرار دیا۔ عدالتی فیصلہ نے جولیس روزن

برگ کو براہِ راست اس جرم کے ارتکاب اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹمی راز ماسکو کے حکمرانوں کو فراہم کرنے کا مجرم قرار دیا۔ ساتھ ہی اس کی بیوی ایتھل کو بھی اس کا شریک جرم قرار دیتے ہوئے موت کی سزا دی گئی۔ دنیا بھر میں اس ناانصافی پر احتجاج کی لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ پاپائے روم نے بھی اس فیصلہ کے خلاف آواز بلند کی مگر جب آنکھیں آہن پوش ہوں تو انصاف کیسے ممکن ہے۔ اس جوڑے کو ایک صبح امریکہ کے ایک زنداں میں ''بجلی کی کرسیوں'' پر بیٹھا کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایتھل اور جولیس روزن برگ سے امریکہ کی حکومت نے کہا تھا کہ اگر وہ اعتراف کر لیں تو ان کی سزا بدلی جا سکتی ہے لیکن اُنھوں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔

فیض صاحب جو اُن دنوں منٹگمری جیل میں تھے جب ان تک یہ خبر پہنچی تو وہ بے حد مضطرب ہوئے۔ انہوں نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی جسے ادبی ناقدین نے ایتھل اور جولیس روزن برگ کا ''نغمۂ مرگ'' قرار دیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فیض صاحب کے نزدیک اپنے آدرش کے لیے جان قربان کر دینے والوں کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

یہ ایک آفاقی نظم ہے جو وقت، زمانے اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی کسی معصوم کو ناحق سولی پر لٹکایا جائے گا، اس نغمہ کی گونج دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔ سولی پر لٹکائے جانے والا پاکستان کا ذوالفقار علی بھٹو ہو، ترکی کا عدنان مینندریس ہو یا لیبیا کا عمر مختار۔ ان سب کی موت تاریخ اور وقت کو ایک ہی پیغام دیتی ہے کہ مستقبل میں آنے والی نسلیں ہمیشہ عزم اور جہدِ مسلسل کے پرچم بلند کرتی رہیں گی۔

اس نظم پر 15 مئی 1954ء کی تاریخ درج ہے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی تیرے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عُشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

☆......☆......☆

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

متفرق عنوانات

وہ لوگ بڑے خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

اے روشنیوں کے شہر

فیض صاحب کو لاہور سے بہت اُنسیت تھی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں ان کا عہد شباب گزرا اور جہاں کے تعلیمی اداروں میں انہوں نے اپنی طالب علمی کے دن گزارے تھے۔ جہاں انہیں وفا شعار اور مخلص دوست ملے تھے۔ جس کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے انہوں نے فرقت کے دن اور ہجر کی راتیں بسر کی تھیں۔ جہاں ان کی عشقیہ شاعری کا بیشتر حصہ تخلیق ہوا تھا اس دلنواز محبوبہ کے لئے جو اس شہر سے دور کسی چھوٹے سے بے نام گھر میں شاید اُن کی منتظر تھی یا شاید نہیں تھی۔ یہ فیض صاحب کی شاعری کا وہ دور تھا جب وہ سرتاپا محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ابھی اُن کی شاعری کا وہ سیاسی رنگ بھی آشکار نہیں ہوا تھا جو بعد ازاں ان کا طرہ امتیاز ٹھہرا۔ اُس زمانے میں اُن کے اشعار میں قدیم اور کلاسیکل شاعروں کے اُسلوب کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ مثلاً

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

****

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

****

فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

فیض صاحب کو زمانہ طالب علمی میں جو دوست اس شہر میں ملے وہ تاحیات ان کے رفیق اور غمگسار رہے۔ شیر محمد حمید، آغا عبدالحمید، چوہدری نبی احمد اور خواجہ خورشید انور نے اس زمانے میں انہیں اپنی پناہ میں لیا جب وہ نئے نئے لاہور آئے تھے اور بیگانے بیگانے سے پھرتے تھے۔ ان کا عشق معراج پر تھا اور اس اجنبی شہر میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو اپنا حال سنا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکیں۔ اسی شہر میں بعد ازاں انہیں معروف ادیبوں اور شاعروں کا ساتھ بھی نصیب ہوا اور قابلِ احترام اساتذہ کی صحبت بھی جن میں پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر اور صوفی تبسم جیسے لوگ شامل تھے۔ لاہور شہر کی محفلیں، یہاں کے روز و شب، اور ثقافتی رنگ سب کچھ ان کے دل میں نہ مٹنے والے نقوش کی طرح ثبت ہوتے گئے اور وہ خود کو لاہور شہر کے بغیر اُدھورا اُدھورا سا محسوس کرتے۔

ایک بار کسی نے فیض صاحب سے پوچھا کہ ''لاہور سے آپ کو اتنی چاہت ہے پھر آپ نے اس شہر کے بارے میں کچھ لکھا کیوں نہیں؟'' اُن کا جواب تھا ''یہ تاثر غلط ہے۔ ہم نے تو لاہور پر بہت لکھا ہے۔ جب ہم نے پوچھا ''ان دنوں رسم ورہ شہر نگاراں کیا ہے؟ تو یہ لاہور ہی کی بات تھی۔ یا جب ہم طویل عرصہ ملک سے باہر رہ کر واپس آئے اور ہم نے کہا ''یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا'' اور سب سے بڑھ کر ہماری ایک پسندیدہ نظم بھی تو اسی شہر کے بارے میں ہے جس کا عنوان ہے ''اے روشنیوں کے شہر''۔

ان کے جیل کے ساتھی میجر اسحاق نے اس کا احوال یوں لکھا ہے ''لاہور سے فیض صاحب کو والہانہ محبت ہے وہ لاہور آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے دل پر بار گزرے گا۔ لیکن یہاں آکر لاہور کا پانی پیا، اس کی فضا میں سانس لیا، لاہور کی آوازیں سنیں تو اس دلدوز نظم کا ظہور ہوا جس پر کوئی شہر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ ''پرورش لوح وقلم'' کی مصنفہ نے بڑے خوبصورت پیرائے میں یوں لکھا ہے ''لاہور میں شاعر اور آزاد دنیا کے درمیان اونچی اونچی دیواریں تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کو یوں لگتا تھا کہ گویا وہ اپنے عزیز شہر میں لوٹ آئے ہیں۔ فیض جیل کے دریچے میں لگے جنگلے سے لاہور کو تکتے رہتے اور ان کا دل درد سے سمٹتا رہتا کہ کاش ان سڑکوں پر قدم رکھیں اور جانی پہچانی گلیوں سے ہوتے ہوئے اپنے گھر کا رخ کریں، دوستوں کے ہاں جھانکیں اور شہر کی خبریں سنیں۔''

فیض صاحب نے یہ نظم مارچ 1954ء میں لکھی تھی۔

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لَو

☆......☆......☆

ہارٹ اٹیک

فیض صاحب ایک صحت منداور تندرست انسان تھے۔ چھوٹی موٹی بیماریوں کے علاوہ وہ کسی مہلک مرض کا شکار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ چاق و چوبند اور چست نظر آتے۔ البتہ چند بری عادتیں تھیں جنہیں چھوڑنا اُن کے لئے مشکل تھا۔ ان میں ایک تمباکونوشی بھی تھی۔ وہ اوائل عمر ہی سے سگریٹ پینے کے شوقین تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق ایک لت میں تبدیل ہوگیا۔ سگریٹ نوشی ان کے لئے بہت مضر تھی خاص طور پر کھانسی اور دمہ کے حوالے سے مگر ان کی مجبوری تھی کہ اس بری عادت سے نجات پانا اُن کے بس میں نہ تھا۔ فیض صاحب زمانہ طالب علمی سے سگریٹ پیتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر ایوب مرزا نے بھی کیا ہے۔ ایک مرتبہ امتحان کے دوران صوفی غلام مصطفےٰ تبسم امتحان کے نگراں تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ نوجوان فیض سوالنامہ سامنے رکھے خاموش دور خلا میں تک رہا ہے۔ ان کے ہاتھ میں قلم نہیں تھا۔ صوفی صاحب نے قریب جاکر پوچھا کہ تم پرچہ کیوں نہیں کر رہے ہو۔ فیض صاحب نے ان کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا اور پوچھا ''کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟'' صوفی صاحب کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ آج تک کمرۂ امتحان میں کسی طالب علم نے یہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ فیض کو گھورتے ہوئے خاموشی سے پیچھے ہٹے، کاری ڈور میں کالج کے پرنسپل پطرس بخاری نظر آئے۔ انہوں نے بخاری صاحب کو فیض کی طلب بیان کی اور دریافت کیا ایسے میں وہ کیا کریں۔ بخاری صاحب نے کہا'' پینے دو۔''

اس کے علاوہ انسان کو اچھی صحت رکھنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً چہل قدمی یا ہلکی پھلکی ورزش وغیرہ۔ ان میں سے کوئی کام بھی ان کے بس کا نہیں تھا۔ دراصل فیض صاحب بہت سست واقع ہوئے تھے۔ ان کی کاہلی کا یہ عالم تھا کہ کچھ لوگوں نے ان سے یہ قول منسوب کر دیا تھا کہ ''اگر کوئی کام کل پر ڈالا جا سکتا ہے تو پھر اسے آج کیوں کیا جائے۔'' ان کی سست مزاجی کا اندازہ آپ ان کے جیل کے ساتھی ظفر اللہ پوشنی کی اس تحریر سے لگا سکتے ہیں کہ جب فیض صاحب کی تجویز پر حیدر آباد جیل میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ طے کیا گیا کہ سارے ساتھیوں کو مشاعروں میں اپنی نظم یا غزل پیش کرنا ہوگی لہٰذا ہر شخص کو ایک تخلص عطا کیا جائے گا۔ اس کام کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس نے بڑے غور و خوض کے بعد ہر شخص کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کے مطابق ایک عدد تخلص الاٹ کیا۔ اس سب کمیٹی نے جو تخلص تجویز کیے ان میں فتوری، سارس، پٹاخہ اور خبطی وغیرہ شامل تھے۔ فیض صاحب کے لئے ''کاہل،'' کا تخلص منتخب کیا گیا۔

آنے والے زمانوں میں فیض کی سگریٹ نوشی بام عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ایلس کی ہمہ وقت نکتہ چینی اور تنبیہ کے باوجود وہ "چین اسموکر" ہی رہے اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ ہارٹ اٹیک کے اسباب میں تمباکو نوشی اور کسی حد تک مے نوشی کے علاوہ شدید ذہنی دباؤ، ابتر ملکی حالات اور معاشی پریشانیاں شامل تھیں۔

ہارٹ اٹیک بہت سخت تھا۔ سینے میں شدید درد اٹھا جس سے سارے قویٰ مضمحل ہو گئے اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ ان کو فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ مگر درد اتنا تھا کہ ساری کوششوں کے باوجود دل ٹھہر نہ سکا۔ یہ 1958ء کی بات ہے۔ اسی درد نے اس نظم کو جنم دیا۔

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بنِ مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور ترے صحن میں گویا
پتا پتا مرے افسردہ لہو میں دھل کر
حسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تیری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

☆......☆......☆

اشک آباد کی ایک شام

فیض صاحب کا سوویت یونین آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ماسکو، تاشقند، سمرقند، بخارا، دوشنبہ، اشک آباد غرض انہوں نے یہ تمام شہر گھومے پھرے تھے۔ وسطی ایشیائی ریاستوں کے ان شہروں سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ سوویت یونین میں فیض صاحب کو ایک بہت ہی اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا۔ ان کی شاعری اور ترقی پسندانہ فکر کے سبب اور اس سے بھی زیادہ اس لئے کہ وہ ''لینن امن ایوارڈ یافتہ'' تھے۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو روس کے باہر بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا تھا۔

ان ساری ریاستوں کے لوگ بڑے مہمان نواز اور محبت کرنے والے ہیں۔ خاص طور پر برصغیر کے لوگوں سے ان کے تاریخی روابط اور رشتے ہیں۔ بہت سی سماجی اقدار، رسم و رواج، لباس، خورد و نوش اور رہن سہن میں حد درجہ مماثلت ہے۔ فیض صاحب جب بھی کبھی وسطی ایشیا کی ان سوویت ریاستوں کے دورے سے واپس آتے ہمیشہ بہت خوش نظر آتے، وہاں اُن کو ذہنی سکون ملتا تھا۔ ان کے اعزاز میں ادبی محفلیں، مشاعرے، رقص و موسیقی کے کنسرٹ آراستہ کئے جاتے۔ ضیافتیں ہوتیں اور مختلف قسم کی رنگا رنگ تقاریب کا انعقاد ہوتا۔ فیض صاحب بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ تھے اور اس طرح کی سرگرمیوں کو بے حد پسند کرتے تھے۔

ان کے دوست ڈاکٹر ایوب مرزا نے جو فیض صاحب سے کبھی کبھی بڑی بے تکلفانہ گفتگو بھی کر لیتے تھے، ایک دن دریافت کیا۔ ''فیض صاحب آپ تاشقند تو کئی مرتبہ جا چکے ہیں۔ سمرقند و بخارا ابھی آپ کی زد میں رہے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کے ناچ اور گانوں میں ایک عجیب قسم کی جاذبیت اور دلکشی ہوتی ہے۔ رقص میں شجاعت اور مردانگی اور ایک خاص قسم کا آہنگ اور نغموں میں محبت، قدرتی مناظر اور جام جم کے مضامین۔ لڑکیاں انتہا کی خوبصورت اور ان کا لباس بہت دیدہ زیب ہوتا ہے۔ جب یہ لڑکیاں ناچتی ہیں تو بالکل تتلیاں لگتی ہیں بلکہ پریاں۔ جیسے حافظؔ کے شعر مجسم ہو گئے ہوں۔''

فیض صاحب نے جواب دیا'' بھئی یہ حافظؔ کا علاقہ تو نہیں ہے لیکن تہذیب وہیں کی ہے۔ ان کا پرانا روایتی کلچر ہے۔ خوبصورتی اس علاقہ کا خاصہ ہے اور جو بات اس علاقہ کی ہے اور اس کی حسیناؤں کی ہے وہ کہیں اور نہیں۔'' اس کے بعد فیض صاحب نے ایک نظم سنائی۔ ''اشک آباد کی ایک شام۔''

اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ 1972ء میں فیض صاحب کو ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ جب

روایت ان کے اعزاز میں استقبالیہ ہوا جس میں ثقافتی شو بھی شامل تھا۔ فیض صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ جس محفل میں بھی ہوں سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ خاص طور صنفِ نازک کے لئے فیض صاحب میں ایک خاص کشش تھی۔ اکثر اوقات خواتین ان کے گرد حلقہ کر لیتی تھیں۔ فیض صاحب کو خود بھی عورتوں میں اپنی "بے پناہ مقبولیت" کا احساس تھا۔ یہی اُس شام اشک آباد میں بھی ہوا۔ پروگرام کے اختتام پر فیض صاحب اپنے مداحوں میں گھر گئے جن میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔ اُن ترک حسیناؤں میں سے ایک فیض صاحب پر بُری طرح ریجھ گئی۔ فیض صاحب نے بھی کچھ التفات کا اظہار کیا۔ جب محفل برہم ہوئی تو اس حسینہ دلنواز نے اگلے روز شام کو آنے کا وعدہ کیا۔ مگر افسوس وہ اپنے وعدہ کو ایفا نہ کر سکی فیض صاحب ساری شام انتظار کرتے رہے مگر وہ نہ آئی۔ یہ خوبصورت نظم اسی انتظار کا ثمر ہے۔

جب سورج نے جاتے جاتے
اشک آباد کے نیلے اُفق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی
سرخیِ اوّلِ شام
اور یہ جام
تمہارے سامنے رکھ کر
تم سے کیا کلام
کہا پرنام
اُٹھو
اور اپنے تن کی سیج سے اُٹھ کر
اِک شیریں پیغام
ثبت کرو اس شام
کسی کے نام
کنارِ جام
شاید تم یہ مان گئیں اور تم نے
اپنے لبِ گلفام
کیے انعام

کسی کے نام

کنارِ جام

یا شاید

تم اپنے تن کی سیج پہ سج کر

تھیں یوں محوِ آرام

کہ رستہ تکتے تکتے

بجھ گئی شمعِ جام

اشک آباد کے نیلے اُفق پر

غارت ہو گئی شام

☆......☆......☆
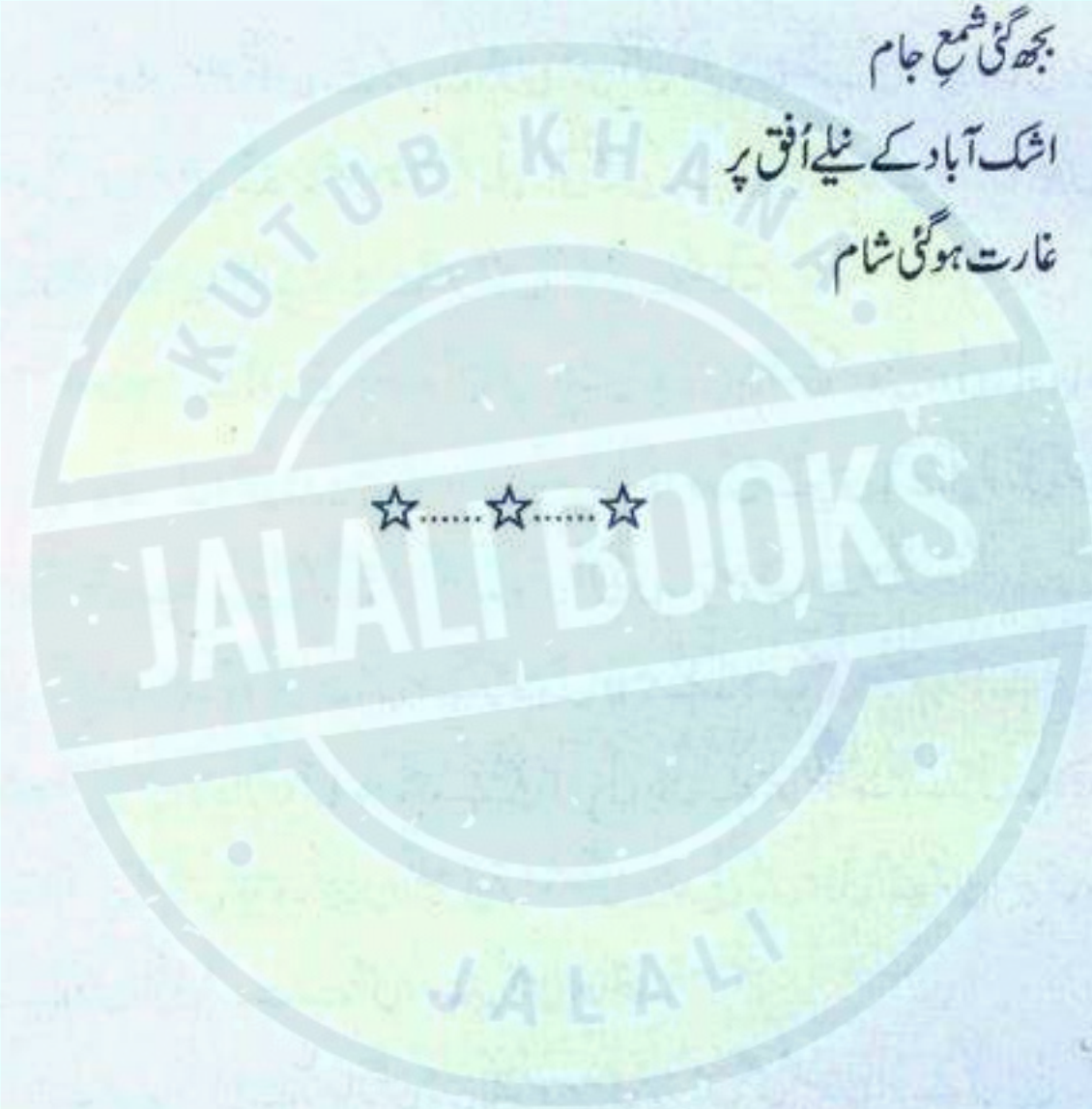
بہار آئی

جیل کے خشک ، بے مزہ اور صعوبتوں سے بھرے دنوں میں بھی فیض صاحب کی حسِ جمال ہمیشہ برقرار رہی۔ پس زنداں بھی اُن کی نگاہیں خوبصورتی اور دلفریبی کے مناظر کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ اپنے ان محسوسات کا ذکر اُنہوں نے بارہا ایلس کے نام اپنے خطوں میں کیا ہے۔ 1953ء کا ایسا ہی ایک خط ہے۔ جس میں اُنہوں نے لکھا۔

''دو دن ہوئے میں بیدار ہوا تو صبح کی ہوا میں ایک نئی ملائمت محسوس ہوئی، باد بہار کی مانوس اور جانی پہچانی نرمی، میں ڈریسنگ گاؤن پہن کر باہر نکلا اور صبح نے اس بات کی توثیق کر دی کہ واقعی بہار آ چکی ہے اس لیے کہ صبح کی رنگت بدل چکی تھی۔ یہ صرف درجہ حرارت کی بات نہیں ہے۔ روشنی، رنگ اور فضا کی کیفیت میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ جب بھی موسم بدلتا ہے ہر نئے دن میں کچھ دھڑکن سی، کچھ ارتعاش سا، کچھ بے یقینی سی پائی جاتی ہے جو اس وقت تک رہتی ہے جب تک اگلا موسم آ کر جم نہیں جاتا۔ ہیجان انگیزی تو موسم کی ہر تبدیلی میں ہوتی ہے لیکن اسیری کے دنوں سے پہلے اس کا اتنی شدت سے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔

اب جو بہار آئی ہے تو ساز سخن میں کچھ موہوم سی لرزشیں بھی محسوس ہونے لگی ہیں۔ میں بہار کے نام ایک سلام لکھنا چاہتا ہوں اور زندگی اور محبت کے نام بھی جن کا ہر بار جنم لینا ایسا ہی ابدی عمل ہے جیسا خزاں کی غارت گری۔ ان دنوں کے نام بھی جو بے دھڑک قضا اور نیستی کو للکارتے ہیں۔''

فیض صاحب کی یہ تمنا اسیری کے دوران تو پوری نہ ہو سکی لیکن یہ خیال ان کے دل کے کسی نہاں خانے میں موجود رہا۔

لدمیلا وسیلیوا اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں ''جیل سے فیض احمد فیض کے خطوں کا مطالعہ کرنے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے تخلیقی منصوبے وہیں جیل میں وجود میں آئے۔ ان میں سے کئی ارادے اشعار کی شکل میں ڈھل کر پورے ہوئے، دوسرے ادھورے رہ گئے اور بعض منصوبوں پر وقت کی کمی کی وجہ سے عمل درآمد کی باری ہی نہیں آئی۔ بہار کے نام سلام لکھنے کی آرزو بھی ایسا ہی ایک خیال تھا جس پر برسوں بعد مارچ 1975ء کے موسم بہار میں عمل ہو سکا۔''

1986ء میں معروف موسیقار ارشد محمود نے ٹینا ثانی کی آواز میں یہ نغمہ ریکارڈ کیا اور پہلی بار محترمہ بینظیر بھٹو کی طویل جلاوطنی کے بعد اُن کی وطن واپسی پر منظر عام پر آیا۔

بہار آئی تو جیسے یکبار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مرمٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جئے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مُشکبو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
ملالِ احوالِ دوستاں بھی
خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی
غبارِ خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے جواب سارے
بہار آئی تو کُھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

☆......☆......☆

پیامِ مشرق

1976ء میں پاکستان بھر میں علامہ اقبال کی ولادت کی صد سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی سننے میں آیا کہ فیض صاحب ان کی منتخب فارسی غزلوں کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔

ایک روز راولپنڈی کلب میں احمد فراز اور میں فیض صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ فیض صاحب چونکہ خود اتنے بڑے شاعر ہیں اور ایک طرح اقبال کے ہم پلہ ہیں، اس لئے ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو ترجموں کے کام میں ضائع کریں۔ پہلے تو فیض صاحب ہنسی مذاق میں ٹالتے رہے اور کہتے رہے "بھئی آپ لوگ بالکل فضول باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں، یہ کتنا بڑا کام ہے"۔ مگر جب ہماری ضد جاری رہی اور ہم نے اصرار کیا کہ یہ ترجمے کا کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے، آپ جیسے بلند مرتبہ شاعر کو یہ زیب نہیں دیتا تو وہ سنجیدہ ہو گئے اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ آپ ترجمہ کو کمتر قسم کا کام سمجھتے ہیں حالانکہ یہ طبع زاد تخلیق کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ہم ان کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ آخر میں انہوں نے کہا" بھئی اقبال کی اصل شاعری تو فارسی زبان میں ہے۔ یوں بھی ''پیامِ مشرق'' تو ہمارے مطلب کی شاعری کی کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ضرور ہونا چاہیے"۔ پھر کچھ اور ذکر چل نکلا اور ''پیامِ مشرق'' کے ترجمے کی بات ختم ہو گئی۔

مگر ختم کہاں ہوئی، دو تین مہینوں کے بعد جب میں کسی کام سے لاہور گیا تو ٹیلی وژن اسٹیشن پر فیض صاحب کا یہ پیغام ملا کہ میں شام کو ان سے ملوں۔ میں فیض صاحب کو ملنے ان کے ماڈل ٹاؤن والے گھر گیا، وہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس گھر کے باہر ٹہل رہے تھے۔ بڑی شفقت سے ملے اور پھر لابی میں بیٹھا دیا جہاں پہلے سے ایک سینٹرل ٹیبل اور آمنے سامنے دو کرسیاں رکھی تھیں۔ انہوں نے کہا'' بھئی آپ نے ایک روز ہم سے ''پیامِ مشرق'' کے ترجمے پر بات کی تھی نا۔۔۔تو اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے صوفی تبسم سے اس کی نک سک بھی درست کرالی ہے۔ تو بھئی اب جب یہ کام ہو ہی گیا ہے تو ہم نے سوچا کہ سب سے پہلے آپ ہی کو یہ ترجمے سنائے جائیں'' اس کے بعد وہ لطف لے لے کر اقبال کے فارسی کلام کے اردو ترجمے سناتے رہے۔

فیض صاحب نے ''پیامِ مشرق'' کی غزلیات کے یہ ترجمے بڑی محبت اور محنت سے کئے تھے۔ اگرچہ ''نسخہ ہائے وفا'' میں ''پیامِ مشرق'' کی نظمیں شامل نہیں ہیں مگر اشفاق حسین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ ترجمے ''انتخاب پیام مشرق'' کے نام سے غالباً اقبال

اکادمی نے شائع کئے ہیں۔

فیض صاحب نے یہ کام اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا جب اُن سے "پیامِ مشرق" کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی گئی تو اُنہوں نے کافی پس و پیش کے بعد اس کی حامی بھری۔ اُنہوں نے انتخاب "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"اُردو اور فارسی میں قربت کے باوجود اظہار اور آہنگ کے پیرائے کافی مختلف ہیں۔ فارسی زبان کو تراکیب اور مستثنیات کی وجہ سے اجمال اور اختصار کی جو سہولتیں حاصل ہیں وہ اُردو میں موجود نہیں ۔ اس لیے میں نے اس انتخاب میں انہی منظومات پر اکتفا کیا ہے جس میں یہ التزام کسی حد تک ممکن تھا۔ اُن صفحات میں اگر کوئی خوبی ہے تو علامہ کی دین ہے اور جو نقائص ہیں وہ میرا عجزِ کلام۔"

انہیں میں سے یہ چند ادبیات ہیں۔ ان ترجموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کے کلام کا ترجمہ کرے تو پھر معیار کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

عاشق کے لئے یکساں کعبہ ہو کہ بت خانہ
یہ جلوتِ جانانہ وہ خلوتِ جانانہ
جبرئیل تو ادنیٰ سا ہے صیدِ جنوں میرا
یزداں تہہِ دام آئے اے ہمتِ مردانہ

****

ہوس منزل لیلیٰ نہ تجھے ہے نہ مجھے
تابِ سرگرمیِ صحرا نہ تجھے ہے نہ مجھے
میں بھی ساحل سے صدف چنتا رہا ہوں تو بھی
حاصل اک گوہر یکتا نہ تجھے ہے نہ مجھے

****

آئے تربت پہ مری حلقہ کیے نوحہ گراں
دلبراں سیم تناں سروقداں گل بدناں
لا کوئی نغمہ جسے تیری زمیں پہچانے
بے خبر چھوڑ بھی دے طرز نوائے دگراں

****

ہے شاخِ زیست میں میری نمی زتشنہ لبی
تلاشِ چشمۂ حیواں، دلیلِ کم طلبی
حدیثِ دل کا بیاں کس طرح ہو کس سے ہو
کہ بے اثر ہے دعا اور نگاہ بے ادبی
غزل کا زمزمہ ہلکے سروں میں رہنے دو
ہنوز نالۂ مرغاں ہے صوتِ زیر لبی
متاعِ قافلہ گرچہ حجازیوں میں لٹی
مگر زبان نہ کھولو کہ یار ہے عربی
نہالِ ترک کو راس آگئی ہے برقِ فرنگ
ہے نورِ مصطفوی کو بہانہ بولہبی
کشید کی ہے خمِ پیرِ روم سے میں نے
مئے سخن کہ ہے بہتر ز بادۂ عنبی

☆......☆......☆

اس وقت تو یوں لگتا ہے

1983ء میں فیض صاحب بیروت میں اپنی طویل جلاوطنی ختم کر کے وطن واپس لوٹ آئے۔ واپسی پر وہ بہت خوش بھی تھے اور بہت اداس بھی۔ خوش تو اس لئے کہ اپنی زمین پر اپنے پیاروں کے درمیان آ گئے تھے اور اداس اس لئے کہ ملکی حالات بہت دگرگوں تھے۔ جنرل ضیاء الحق کے بے رحم مارشل لا کا شکنجہ روز بہ روز سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب ایک مطلق العنان حکمران بن چکا تھا۔ ایک جابر سلطان جو خود کو امیر المومنین کہلوانا چاہتا تھا۔ ملک میں سیاسی سرگرمیاں بند تھیں۔ بڑی سیاسی جماعتوں کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا جا رہا تھا۔ افسر شاہی مکمل طور پر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے قبضہ میں تھی۔ تعلیمی اداروں میں ہر قسم کی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں معطل تھیں۔ ابلاغ عامہ کے ادارے خاص طور پر ٹیلی وژن پر سرکار کی ''نظرِ خاص'' تھی۔ نہ صرف خبریں اور حالاتِ حاضرہ کے پروگرام بلکہ ثقافتی اور تفریحی پروگراموں میں بھی مارشل لا سکریٹریٹ کا عمل دخل تھا۔ ضیاء الحق نے کمال مہارت سے سیاسی جماعتوں میں توڑ پھوڑ اور نا اتفاقی پیدا کر دی تھی۔ ادیبوں اور شاعروں کو 'اہل قلم'' کانفرنسوں کے ذریعہ مطیع و فرماں بردار بنا لیا گیا تھا۔ صاحبان علم اور حساس لوگوں کے لئے سانس لینا دشوار تھا۔ ایک نا قابلِ برداشت سکوت تھا۔ بقول جوش ملیح آبادی

وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

یہ انتہائی کرب کا زمانہ تھا۔ نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ہمسایہ ملک افغانستان میں بھی روسیوں کے خلاف جہاد کا معرکہ تھا جس میں شرکت کے لئے وطن کے نونہال اور کڑیل جوان جہاد میں شرکت کے لئے جا رہے تھے یا بھیجے جا رہے تھے۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ اس ماحول اور ان سارے عوامل نے فیض صاحب کو بسترِ علالت تک پہنچا دیا۔ وہ شدید بیمار ہو گئے۔ اس کا بیان ایوب مرزا کی زبانی مناسب معلوم ہوتا ہے جو ان کے دوست اور سوانح نگار کے علاوہ ان کے معالج بھی تھے۔

''فیض صاحب مارچ 1983ء میں شدید علیل ہو گئے۔ میں اسلام آباد میں تھا۔ چھیمی نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا "ابو بیمار ہیں۔ مما چاہتی ہیں آپ فوراً آ جائیں۔'' میں ایک ثانیہ ضائع کئے بغیر لاہور کے میو ہسپتال میں فیض صاحب کے روبرو کھڑا تھا۔ حالت یہ تھی کہ فیض کا سانس اُکھڑ چکا تھا۔ آکسیجن ماسک منہ پر تنی ہوئی تھی۔ بازو میں ڈرپ لگی تھی۔ میں نے آہستہ سے ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ اُنہوں نے صرف آنکھیں گھما کر دیکھنے کی کوشش کی۔

یوں ہی چھ شب و روز گزر گئے۔ ساتویں صبح میں نے دروازہ کھولا، کیا دیکھتا ہوں فیض صاحب کلین شیو منہ ہاتھ دھلا دھلایا بستر پر بیٹھے ہیں۔ بڑے تپاک سے بولے ''بھئی آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ راولپنڈی میں مریضوں کو کون دیکھتا ہوگا۔ آج ساتواں دن ہے اب آپ فوراً واپس جائیں۔'' میں نے بڑھ کر پیشانی کو بوسہ دیا اور پوچھا "اجازت ہے؟" بولے "ہاں بھئی جا سکتے ہو۔ اور یہ نظم لو۔ آج رات سانس قابو میں آئی تو یہ نظم ہوئی۔''

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سُورج، نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حُسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اِک بَیر، نہ اِک مہر، نہ اِک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا، نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سُنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اِک ہی گھڑی ہے
ہمّت کرو، جینے کو تو اِک عمر پڑی ہے

☆......☆......☆

سلیمہ ہاشمی اور فیض صاحب

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں

فیض صاحب کو شاعری میں نت نئے تجربات کرنے کا شوق تھا۔ اس آرزو کی تکمیل میں ان کی شاعری نے طرح طرح کی صورتیں اختیار کیں۔ انہوں نے فلمی گیت بھی لکھے۔

تھم گئے آنسو تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات

پنجابی زبان میں بھی طبع آزمائی کی۔

اٹھ اُتاں تو جٹا
مردا کیوں جائیں
بھولیا! توں جگ دا ان داتا
تیری باندی دھرتی ماتا
توں جگ دا پالن ہار
تے مردا کیوں جائیں

اپنے ہم عصر اور ہم خیال ترک شاعر ناظم حکمت کے افکار بھی اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی ہے

اکیلے جیو
ایک شمشاد تن کی طرح
اور مل کر جیو
ایک بن کی طرح

داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ نے بھی انہیں بہت متاثر کیا

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نور
اک شکاری ہے دن اک شکاری ہے رات
جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دور
مچھلیوں کی طرح ابنِ آدم کی ذات

فیض صاحب نے سہرا بھی لکھا۔ اُن کے ایک عزیز تھے اظفر شفقت جن سے وہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اُن کا سہرا فیض صاحب نے لکھا مگر پڑھا نہیں۔ اُنھوں نے کہا ''بھئی یہ کام ہمیں نہیں آتا۔''

جو گل و لالہ تھے رونق گلستان
آج اظفر کے سہرے میں کھِل کر سجے

اور تو اور ارشد محمود جوان دنوں نئے نئے میوزک کمپوزر بنے تھے اُنھوں نے فیض صاحب سے ضد کر کے ایک جنگل بھی لکھوالیا۔

ادرک دھنیہ مرچ اور ہلدی
نیشنل نے سب کی کایا پلٹ دی
کون کرے مرچوں کی پسائی
ہلدی ادرک کی رگڑائی
پل میں مسالہ ہے تیار
خالص عمدہ خوشبودار

فیض صاحب کے انہیں تجربات کی ایک کڑی یہ چھوٹا سا گیت ہے، جو اس چھوٹے سے خط کے ساتھ انھوں نے اپنی بیٹی کو بھیجا تھا۔

پیاری چھم تمہارا خط ملا۔ خوشی ہوئی

یہ ہندی گیت کینیڈا میں ایک ہندوستانی لڑکی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ ایک شعری محفل میں اس نے کہا مشکل اردو ہماری سمجھ میں نہیں آتی کچھ ہندی زبان میں سنایئے۔ میں نے پوچھا آپ کیا کرتی ہیں۔ کہنے لگی باتیں کرتی ہوں

بہت سا پیار۔ ابو

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں
آؤ کوئی بَیت بنائیں
جن کی رہ تکتے جگ بیتے
چاہے وہ آئیں یا نہ آئیں

آنکھیں مُوند کے رُت پل دیکھیں
آنکھوں میں اُن کی پرچھائیں
اپنے دردوں کا مُکٹ پہن کر
بے دردوں کے سامنے جائیں
جب رونا آوئے مُسکائیں
جب دل ٹوٹے دیپ جلائیں
پریم کتھا کا انت نہ کوئی
کتنی بار اسے دہرائیں
پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ نہیں مانگیں، سب کچھ پائیں
فیضؔ اُن سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

☆......☆......☆

ایک منظر

بڑی حد تک یہ بات درست ہے کہ فیض صاحب کی وجہ شہرت اور شاعری میں اُن کا اعلیٰ مقام اُن کی سیاسی شاعری کے سبب سے ہے۔ مگر یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ اُنہوں نے صرف سیاست، مزاحمت اور احتجاج کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی اُن کی شاعری کے بہت سے پہلو ہیں۔ فیض صاحب کو پڑھنے والے اس بات سے بھی واقف ہیں کہ اُن کی شاعری کا ابتدائی دور تمام تر رومانوی اور عشقیہ اشعار سے مزیّن ہے۔ اُنہوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اختر شیرانی اور حسرت موہانی اُن کے پسندیدہ شاعر تھے اور ابتدائے زمانہ میں وہ اُن دو شاعروں سے بے حد متاثر تھے۔ جب اُنہوں نے زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کو سمجھا اور جان لیا کہ

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

تب بھی اُنہوں نے مظاہر قدرت اور حُسن فطرت سے اپنے لگاؤ کو کم نہ ہونے دیا۔ اُن کی شاعری میں یہ رچاؤ اُن کی زندگی کے آخر تک برقرار رہا۔ خوبصورتی چاہے کسی بھی شکل میں ہو اس سے حظ اُٹھانا فیض صاحب کی سرشت میں داخل تھا۔ وہ یقیناً حُسن پرست تھے۔ انسانی صورتیں، فطری مناظر، پھول، دریا، پہاڑ، جھیلیں، کھیت کھلیان، وادیاں، آسمان، چاند ستارے یہ سارے کے سارے عناصر اُن کی زندگی کا حصہّ تھے اور مرتے دم تک وہ ان سے دوری اختیار نہ کر سکے۔

جب ستانے لگے بے رنگئ دیوار جہاں
نقش کرنے لوئی تصویر حسیناں چلئے

اس زمانے میں بھی جب اُن کی انقلابی اور پس زنداں شاعری اپنے عروج پر تھی۔ تب بھی وہ چہار اطراف پھیلے ہوئے مناظر کے حسن کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر فطرت کی عکاسی کرتے رہے۔

اگلے چند صفحات میں ہم نے فیض صاحب کی چار ایسی نظمیں جمع کی ہیں جو مختلف ادوار میں لکھی گئیں۔ یہ اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ فطرت سے ساری زندگی اُن کا پیار برقرار رہا۔

پہلی دو نظموں کا تعلق اُن کی شاعری کے پہلے دور سے ہے جب اُنہوں نے ابھی سیاسیات کو اپنا موضوع نہیں بنایا تھا۔ اُن

دونوں نظموں میں فیض صاحب کا مخصوص اسلوب ہے اور الفاظ کی وہی سحر انگیزی ہے جو تاحیات ان کی شاعری کا خاصہ رہی۔ سرودِ شبانہ کی یہ کیفیت فیض صاحب نے بڑی دلکشی کے ساتھ رقم کی ہے۔

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سَراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا رُوئے حسیں

اسی کے کچھ عرصہ بعد لکھی گئی یہ نظم ہے جس کو انہوں نے ''ایک منظر'' کا عنوان دیا ہے۔ صرف ساڑھے تین اشعار پر مبنی یہ ایک چھوٹی سی نظم ہے جس میں نصف شب میں بستیوں، آبادیوں، مکانوں اور مکینوں پر طاری ہونے والی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور
آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراؤں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے رباب ہستی کی

ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں

فیض صاحب تنہا ایسے شاعر نہیں ہیں جنہوں نے مناظرِ قدرت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہو۔ اُن کے مرشد اور راہ نما علامہ اقبال کی شاعری بھی جا بجا امیجری سے پُر ہے۔ میرا خیال ہے کہ فیض صاحب ضرور اقبال کی طرزِ ادا، انداز فکر سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً "ماہ نو" کے زیرِ عنوان اقبال کے ان اشعار کی جھلک فیض صاحب کی نظم میں نظر آتی ہے۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرالی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

روس میں فیض صاحب کی مستقل مہماندار اور ''پرورش لوح وقلم'' کی مصنفہ ارمیلا دسیلیو نے اپنی کتاب میں لکھا ہے "فیض صاحب بہت خوشی خوشی ماسکو میں قیام کرتے تھے یہاں وہ احترام پاتے، خیر سگالی کے ماحول میں رہتے اور دوستوں کی فکر و خیال کا مرکز بنے رہتے۔ یہاں آکر وہ تازہ دم اور تخلیقی قوت سے فیض یاب ہو جاتے تھے۔ ان کی شاعری کی دیوی کو سرد شمالی آب و ہوا بھاتی تھی۔ جیل کے زمانے کے شہرہ آفاق کلام کے بعد فیض نے جتنی بہترین نظمیں اور غزلیں لکھیں ان میں متعدد ماسکو ہی میں وجود میں آئیں۔ یہ نظم بھی 1964ء کی ایک شام کو ماسکو کے ایک ہوٹل میں لکھی گئی تھی"۔

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کُھلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہُوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پُھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ

شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، ''آہستہ''
چاند نے جھک کے کہا
''اور ذرا آہستہ''

اور یہ ہے اسی موضوع اور اسی عنوان سے ایک اور نظم جو 1978ء میں سمرقند میں لکھی گئی۔ ان اشعار میں ایک عجب سا تاثر ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خاموشی اور تنہائی کے کسی لمحے میں وہ چپ چاپ بیٹھے سمندر اور آسمان کی بیکراں وسعتوں کو تک رہے ہیں۔ شاید اللہ کی ذات اور کائنات اُن کے تفکّر کا محور ہے۔ اور جیسے اس لمحے نے اُنہیں خدا سے بہت قریب کر دیا ہے۔

ممکن ہے وہ سورہ رُحمٰن کی اُن آیات سے متاثر ہوئے ہوں جس میں اللہ تعالیٰ تکرار کے ساتھ یاد دلاتا ہے کہ "اے جن و انس تم اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں کی جھٹلاؤ گے۔''

''اور آسمان کو بلند کیا اللہ نے اور قائم کر دیا نظام توازن
اور زمین کو بنایا ہے اُس نے مخلوقات کے لیے
اس میں لذیز پھل ہیں اور کھجور کے درخت ہیں
جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں
پس تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کی جھٹلاؤ گے
اور اسی کے ہیں یہ جہاز جو اُونچے اُٹھے ہوئے ہیں''
سمندر میں پہاڑوں کی مانند

اور اب ملاحظہ کریں فیض صاحب کی نظم کے اشعار

آسماں آج اِک بحرِ پُر شور ہے
جس میں ہر سُو رواں بادلوں کے جہاز
ان کے عرشے پہ کرنوں کے مستول ہیں
بادبانوں کی پہنے ہُوئے فرغلیں
نیل میں گنبدوں کے جزیرے کئی

ایک بازی میں مصروف ہے ہر کوئی
ابابیل کوئی نہاتی ہوئی
کوئی چیل غوطے میں جاتی ہوئی
کوئی طاقت نہیں اس میں زورآزما
کوئی بیڑا نہیں ہے کسی ملک کا
اس کی تہ میں کوئی آبدوزیں نہیں
کوئی راکٹ نہیں، کوئی توپیں نہیں
یوں تو سارے عناصر ہیں یاں زور میں
امن کتنا ہے اس بحرِ پُر شور میں

☆......☆......☆

بہت ملا نہ ملا زندگی سے

آخری ایام

اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے
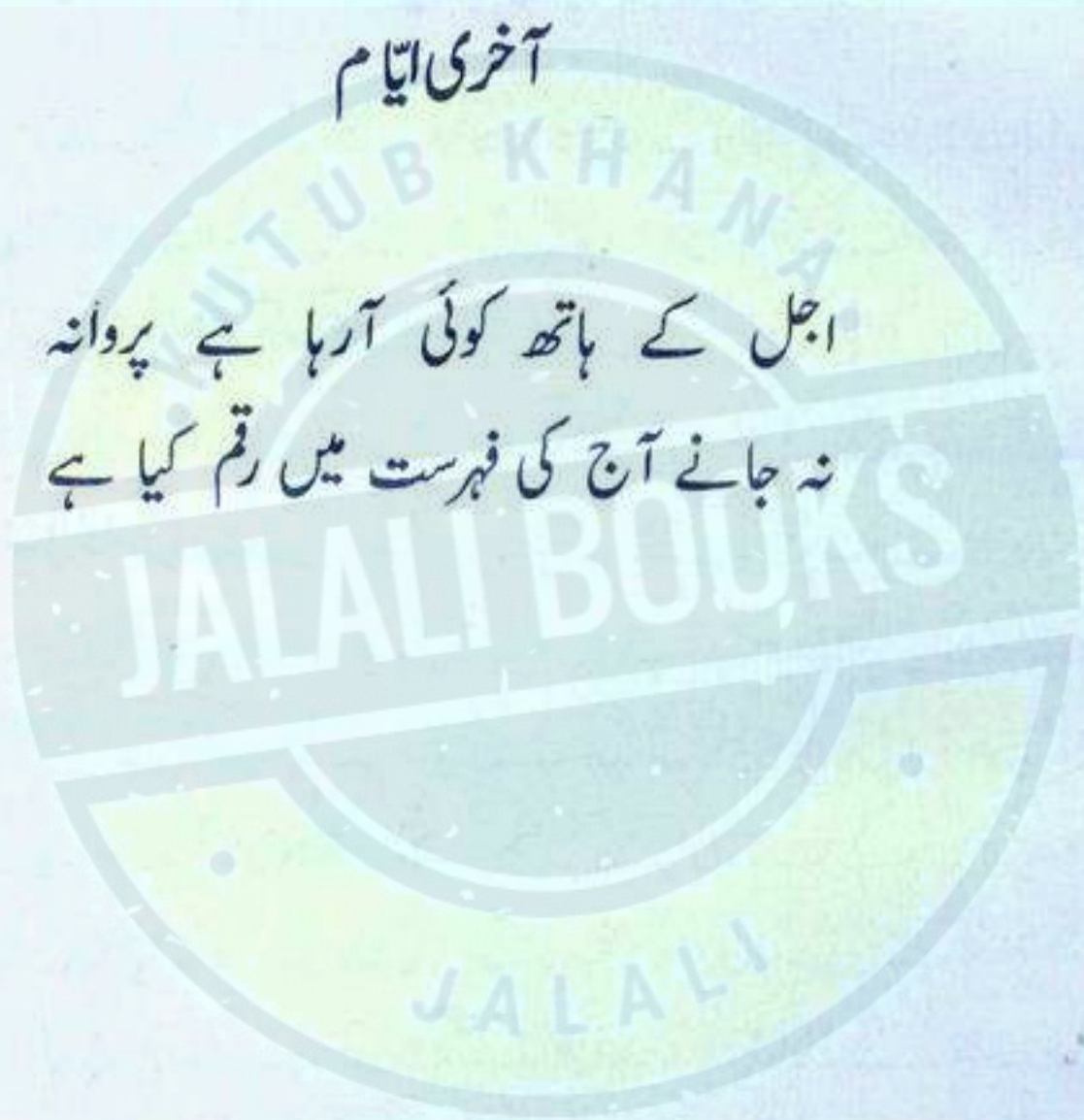
- تم ہی کہو کیا کرنا ہے
- قطعہ
- یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا
- بہت ملا نہ ملا زندگی سے
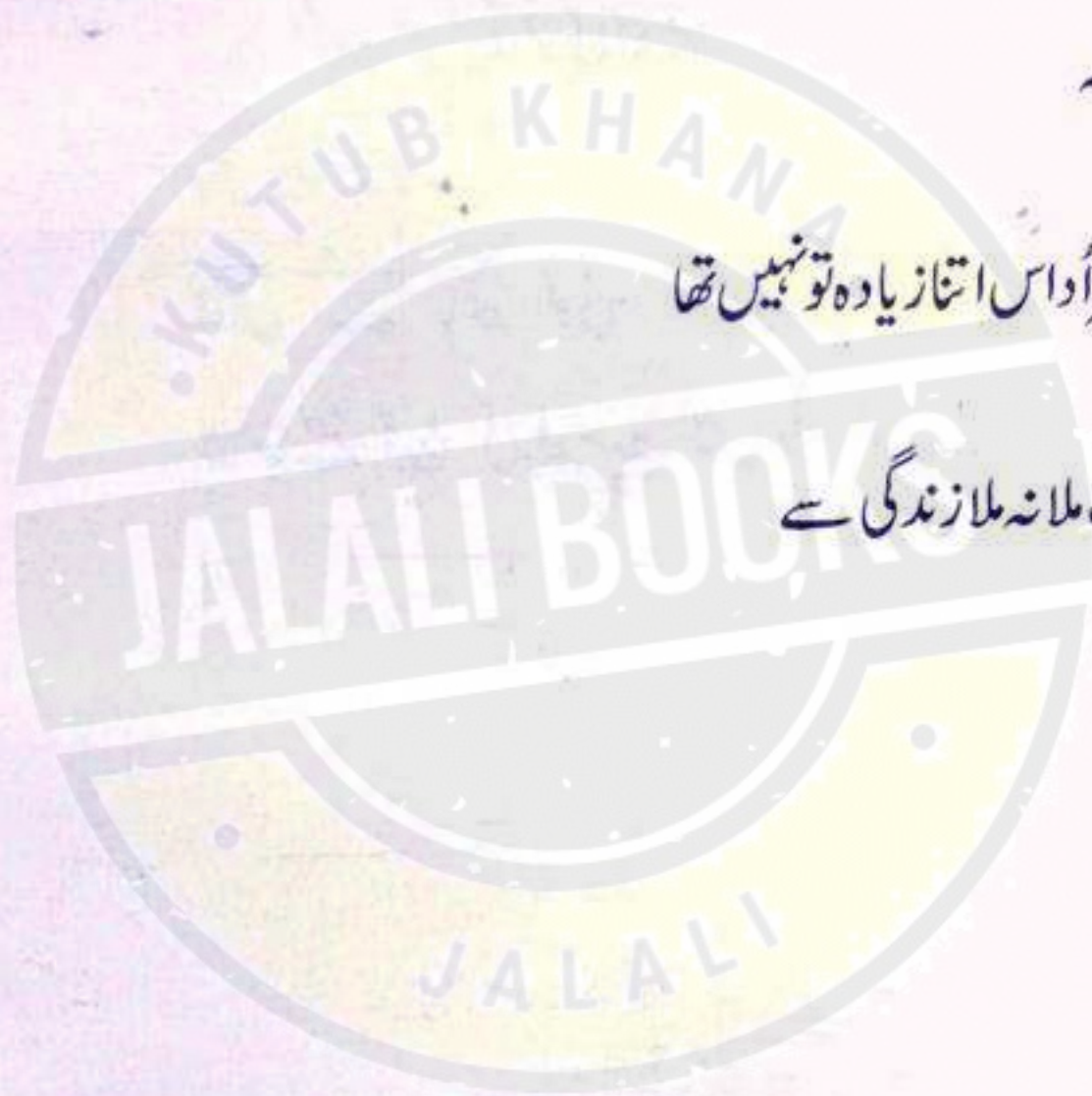
تم ہی کہو کیا کرنا ہے

ایک زمانے میں جب پاکستان کے حالات بہت خراب تھے۔ فیض صاحب کے نام سے ایک لطیفے یا حکایت نے بڑی شہرت پائی اور چونکہ فیض صاحب نے کبھی اس کی تردید نہیں کی اس لئے اس کی صداقت پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بات یوں تھی کہ کسی محفل میں ملک کی بدحالی اور بگڑتی ہوئی سیاسی صورتِ حال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ کسی نے کہا مجھے تو اندیشہ ہے۔ یہ ملک ٹوٹ جائے گا اور کئی حصّوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ دوسرے نے اظہارِ خیال کیا کہ تمہارا اندیشہ تو چلو پھر جو ہے مجھے تو یہ ڈر ہے کہ ہندوستان ہمارے ملک پر قبضہ کرلے گا اور ہم ایک بار پھر غلام بن جائیں گے۔ فیض صاحب بھی اُس محفل میں موجود تھے۔ کسی نے اُن سے دریافت کیا کہ فیض صاحب آپ کا اس سلسلہ میں کیا خیال ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور جواب دیا ''بھئی آپ لوگوں کے اندیشے اور ڈر اپنی جگہ مگر میرا خوف آپ سب سے زیادہ ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوگا اور یہ یونہی چلتا رہے گا۔''

ان کا خیال کس قدر صحیح تھا۔ ساری قیامتیں گزر گئیں، حالات ابتر ہوتے گئے مگر ملک یونہی چلتا رہا اور آج تک چل رہا ہے۔

اس نظم کا انتخاب میں نے جان بوجھ کر کتاب کے آخری حصّے کے لئے کیا ہے کہ ان اشعار میں فیض صاحب نے پاکستان کے حوالے سے نہایت اختصار کے ساتھ قومی صورتِ حال کا ایک جائزہ پیش کر دیا ہے۔ ایک طرح سے یہ ہماری تاریخ کی سمری یا خلاصہ ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کی شاعری کے انتخاب پر مبنی اس کتاب کو اس نظم پر ختم کیا جائے۔ میرے خیال میں صبح آزادی کے ''داغ داغ اجالا'' والی نظم سے شروع ہونے والے ان کی شاعری کے سفر کو اسی سوال پر ختم کیا جانا چاہیے تھا۔ ''اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے؟؟''

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی تھی
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لوہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی

ایسا نہ ہُوا، ہر دھارے میں
کچھ اَن دیکھی منجدھاریں تھیں
کچھ مانجھی تھے انجان بہت
کچھ بے پرکھی پتواریں تھیں
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اترنا ہے
جب اپنی چھاتی میں ہم نے
اِس دیس کے گھاؤ دیکھے تھے
تھا ویدوں پر وشواش بہت
اور یاد بہت سے نسخے تھے
یوں لگتا تھا بس کچھ دن میں
ساری بپتا کٹ جائے گی
اور سب گھاؤ بھر جائیں گے
ایسا نہ ہُوا کہ روگ اپنے
کچھ اتنے ڈھیر پُرانے تھے
وید ان کی ٹوہ کو پا نہ سکے
اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے

☆......☆......☆

اردو مرکز لندن۔ سامعین میں مشتاق احمد یوسفی اور ایلس بھی ہیں۔

قطعہ

فیض صاحب کے اس قطعہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی کسی رسالے میں شائع ہوا ہے۔

میں نے یہ قطعہ ڈاکٹر آفتاب احمد کی کتاب ''فیض ـــ شاعر اور شخص'' میں دیکھا تھا۔ اس کتاب کے پہلے صفحہ پر یہ جلی حروف میں شائع ہوا ہے۔ میں اس کھوج میں تھا کہ اس خوبصورت قطعہ کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔ یہ کب لکھا گیا اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ مگر معلومات صرف ڈاکٹر آفتاب سے حاصل کی جاسکتی تھیں اور بدقسمتی سے جب میں نے اپنی زیرِ نظر کتاب لکھنا شروع کی تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ لہٰذا میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے کتاب میں شامل نہ کروں۔

مگر پھر اچانک قسمت نے یاوری کی اور ایک دن باتوں باتوں میں آئی اے رحمان صاحب نے اس قطعہ کے بارے میں بتایا۔۔ دراصل اس محفل میں ذکر کچھ اور چل رہا تھا جس کا موضوع تھا ہمارے ملک کی مقتدر شخصیات۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا نام آگیا کہ وہ کسقدر ہمہ جہت صفات کے آدمی تھے۔ نامور سائنسدان تو وہ تھے ہی مگر اس کے علاوہ مصور تھے، موسیقی سے بھی بہت شغف رکھتے تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ رحمان صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ایک بیاض تھی جس میں وہ اپنے اشعار کے علاوہ دیگر مشہور شاعروں کے شعر بھی لکھا کرتے تھے۔ اسی ضمن میں ایک بار انہوں نے فیض صاحب سے بھی فرمائش کی کہ ان کی بیاض میں اپنا کوئی شعر لکھ دیں۔ فیض صاحب ان کی فرمائش کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ مگر ساتھ ہی وہ اس عظیم المرتبت انسان کے ساتھ عام لوگوں جیسا طریقہ بھی اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنا کوئی پرانا شعر رقم کرنے کی بجائے ایک بالکل نیا قطعہ بیاض میں لکھ دیا۔

یہ دو عظیم انسان نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ ہم جلیس، ہم مذاق اور ہم مشرب بھی تھے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور فیض صاحب کی عادات، خصائل میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی تھی۔ دونوں درویشانہ مزاج رکھتے تھے۔ دونوں نہایت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور پُر سکون انداز میں آہستہ آہستہ بولنے کے عادی تھے۔ دونوں کی عمر میں بھی کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا۔

گمان غالب ہے جب فیض صاحب نے یہ قطعہ ان کے لئے لکھا تو ڈاکٹر صاحب علیل تھے اور ان کے چل چلاؤ کا وقت قریب آ رہا تھا۔ فیض صاحب کے ان دو اشعار میں اس تاثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہاں ندرت الفاظ اور خیال آفرینی اپنے عروج پر ہے۔

ہم اپنے وقت میں گزرے جہان گزراں سے
نظر میں رات لئے دل میں آفتاب لئے
ہم اپنے وقت میں پہنچے حضور یزداں میں
زباں پہ حمد لئے ہاتھ میں شراب لئے

☆......☆......☆
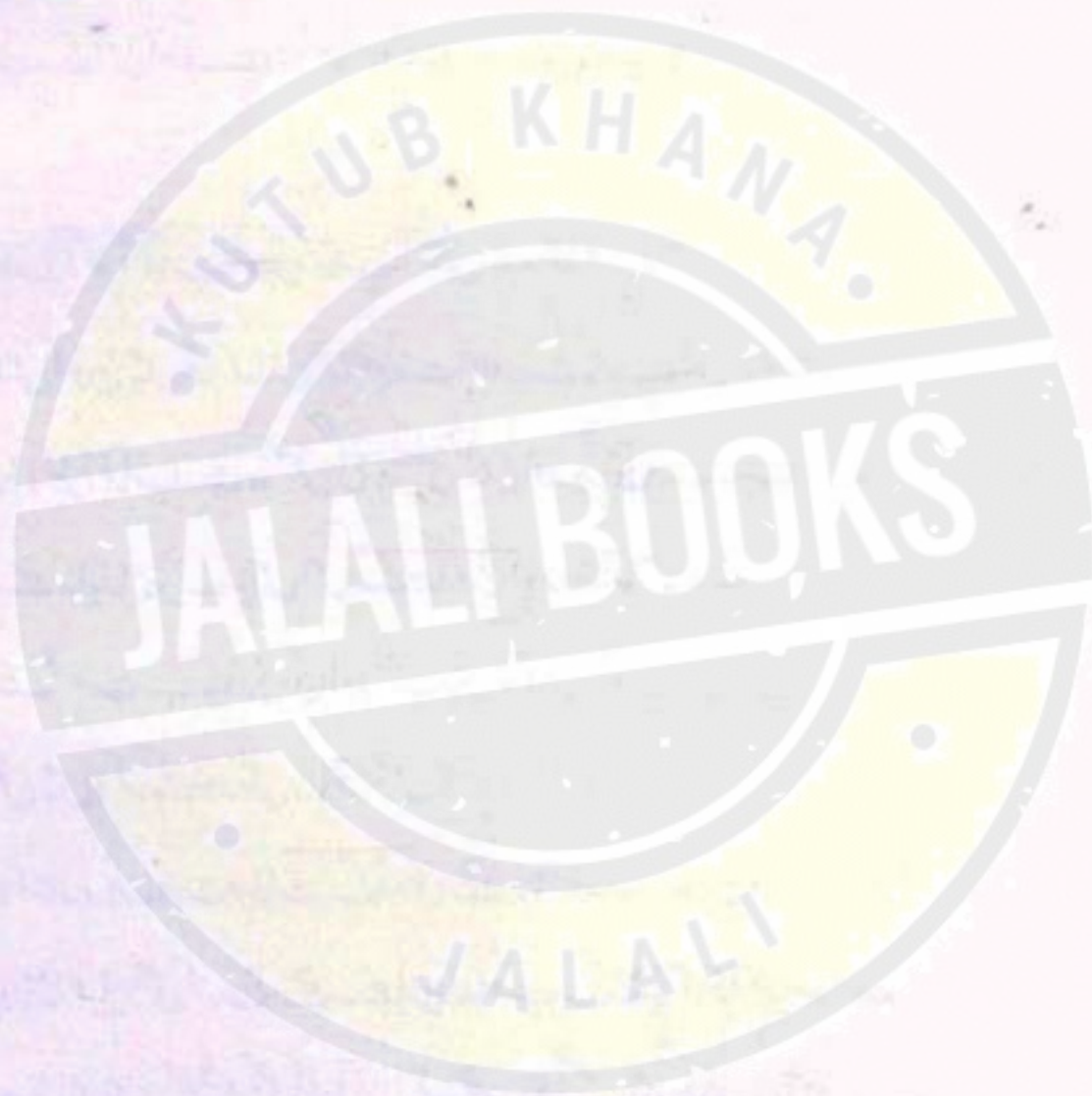
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

یہ چھوٹی سی نظم فیض صاحب نے فروری 1983ء میں لکھی تھی۔

وہ 1982ء میں چار سال وطن سے دور گزار کر واپس لاہور آ گئے تھے لیکن اپنے وطن اور اپنے شہر کو وہ جن حالات میں چھوڑ کر گئے تھے وہ اُسی طرح برقرار تھے بلکہ اگر دیکھا جائے تو معاملات اور زیادہ بگڑ چکے تھے۔ سیاسی سرگرمیاں معطل تھیں، طلباء یونینوں پر پابندیاں عائد تھیں۔ اخبارات سخت سینسر شپ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ سرکاری ابلاغ عامہ کے ادارے دن رات حکومت کی ہرزہ سرائی میں مصروف تھے۔ ادیب شاعر دانشور اور فن کار یا تو خاموش تھے یا ڈرے ڈرے سہمے سہمے انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ سرگوشیوں کا ماحول تھا، سناٹوں کا زمانہ تھا۔

وہ ہنستا مسکراتا مہکتا شہر جو فیض صاحب کے خوابوں کا شہر تھا بے بسی اور بے اعتباری کا نمونہ بنا نظر آتا تھا۔ لاہور کے پھولوں سے خوشبو، چراغوں سے روشنی اور نغموں سے سُر جیسے روٹھ گئے تھے۔ فیض، صاحب جو ساری زندگی تنہائی سے خوف کھاتے رہے تھے۔ اب خود اپنے بھرے پُرے شہر میں تنہا تھے۔ نہ کوئی ہم دم دیرینہ، نہ یارانِ طرح دار۔

یہ وہ حالت زار تھی جس کا احوال فیض صاحب پہلے ہی اپنی ایک غزل میں بیان کر چکے تھے جسے اُنہوں نے ''دکنی غزل'' کا نام دیا تھا۔

کچھ پہلے اُن آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارہ گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا
تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا
تھی یادوں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار نہ تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارہ گزرے تھا

اس زمانے میں اُداسی اور تنہائی نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اُن کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی تھی۔ ماسکو کے اسپتال میں اپنا آخری چیک اپ کرانے کے بعد اُن کے روزمرّہ کے معاملات پر بہت سی پابندیاں لگا دی گئی تھیں۔ معمولات کی تبدیلی نے

اُن کی طبیعت پر اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ کچھ بیزار بیزار اور شاکی نظر آتے تھے۔ یہ غزل شاید اپنے محبوب شہر کے لیے اُن کا آخری تحفہ ہے۔

شہروں کے حوالے سے اُردو شاعری میں بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ پُرانے اساتذہ کے یہاں بھی اور فیض صاحب کے ہم عصروں کے یہاں بھی۔ مگر فیض صاحب کی یہ غزل اُن سب سے جدا محسوس ہوتی ہے۔

منیر نیازی نے اپنے شہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

اک بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اشک رواں کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

احمد فراز جب پہلی بار یورپ کے سفر پر گئے تو اپنے شہر کو اس طرح یاد کیا تھا۔

روم کا حسن بہت دامن دل کھینچتا تھا
اے مرے شہر پشاور تیری یاد آئی بہت

اور ناصر کاظمی اپنے شہر کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے یوں پوچھتا ہے

دل تو اپنا اُداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

فیض صاحب پر بھی یہی کچھ بیتا۔ اُنہوں نے وطن واپسی پر اپنے شہر کو دیکھا تو بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

منزل کو نہ پہچانے رہ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اُٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فرق ان میں کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا

☆......☆......☆

بہت ملا نہ ملا زندگی سے

یہ فیض صاحب کی زندگی کے آخری اشعار ہیں۔ان کی وفات 1984ء میں نومبر کی 19 تاریخ کو لاہور میں ہوئی۔یہ غزل انہوں نے اپنی موت سے صرف چند روز پہلے کہی تھی۔اس کا انداز اور موڈ صاف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہیں موت کی قربت کا احساس ہو چکا ہے۔

بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ دردِ بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

اگر غور سے پڑھیں تو یہ بات واضح ہے کہ یہ نظم ایک طرح سے فیض صاحب کی زندگی کی بیلنس شیٹ ہے۔لگتا ہے وہ اپنی زندگی کا اکاؤنٹ close کر کے سفر پر روانہ ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔

طبعاً فیض صاحب بڑے صابر و شاکر قسم کے انسان تھے۔انہوں نے جیتے جی کبھی کسی بات کی شکایت نہیں کی۔جو زندگی نے انہیں دیا خاموشی سے قبول کر لیا۔جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی ان کا اطمینان بھی دوچند ہوتا گیا۔وہ کہا کرتے تھے ''ہمیں زندگی میں جس قدر عزت اور شہرت ملی اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔شاید ہم اس کے مستحق بھی نہیں تھے۔'' اگرچہ انہیں بار بار مالی، ذہنی اور جسمانی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ یہ سب کچھ خوش دلی سے قبول کرتے رہے۔انہوں نے اپنی ضرورتوں اور اپنی خواہشات کو ہمیشہ بڑا محدود رکھا۔

فیضؔ نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

زندگی سے جو انہوں نے طلب کیا وہ انہیں جلد یا بدیر ملتا رہا۔اگر سب نہیں تو کم کم ہی سہی۔

اپنی اولاد کی طرف سے بڑے مطمئن تھے۔بچیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں۔فیض صاحب نے نہ صرف اپنی بیٹیوں کی خوشیاں دیکھیں بلکہ ان کے بچوں کی بھی۔اپنے نواسوں نواسی کو پروان چڑھتا دیکھ کر ان کا ڈھیروں خون بڑھتا تھا۔ان کی ساری خواہشات ایک ایک کر کے پوری ہو گئی تھیں۔یہاں تک کہ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اپنے گاؤں کالا قادر

بھی ہو آئے۔ انہوں نے گاؤں کی مسجد میں نماز کی امامت بھی کی اور یوں بعض لوگوں کا یہ تاثر بھی ختم کر دیا کہ فیض کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اے تو کہ ہست ہر دل محزوں سرائے تو
آوردہ ام سرائے دگر از برائے تو

ان کی یہ خواہش بھی کہ ان کے پس ماندہ گاؤں کے لئے پکی سڑک تعمیر ہو جائے، پوری ہو چکی تھی۔

نہ جانے کتنے زمانوں سے اس کا ہر رستہ
مثالِ خانۂ بے خانماں تھا دربستہ
خوشا کہ آج بفضل خدا وہ دن آیا
کہ دست غیب نے اس گھر کی درکشائی کی
چنے گئے ہیں سبھی خار اس کی راہوں سے
سنی گئی ہے بالآخر برہنہ پائی کی

فیض صاحب نے زندگی میں کڑے سے کڑا وقت گزارا لیکن صبر وقناعت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ طبعاً حوصلہ مند اور مثبت سوچ رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اچھے اور روشن مستقبل کی امید کی۔

سحر کی بات امید کی بات کرو

لیکن ڈھلتی عمر کے ساتھ انہیں موت کی آہٹیں سنائی دینے لگی تھیں۔ اس کی گونج ان کی شاعری میں بھی شامل ہو گئی تھی، لگتا تھا کم حوصلگی نے اب ان کے دل میں اپنی جگہ بنانا شروع کر دی تھی۔ عمر اپنا خراج لے رہی تھی اور زندگی کی راہ کا تھکا ہارا مسافر اب یوں بھی سوچنے لگا تھا۔

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خون تھا گِرو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اتر جائے

مرنے سے دو تین سال پہلے جلاوطنی کے بعد وہ واپس لاہور آ گئے تھے اور اس کا بھی ایک بڑا سبب یہی تھا کہ اب وہ ''مجاہدہ'' کے لیے مزید تیار نہیں تھے۔ اشفاق حسین نے اپنی کتاب میں ان کی واپسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو ستر سال سے زائد عمر گزار چکا ہو وہ آخر کب تک بے وطنی کا عذاب سہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وہ پاکستان لوٹے تو اس وقت تک وطن سے دوری کا عذاب سہتے سہتے تھک چکے تھے۔۔۔ خود فیض صاحب نے ایک انٹرویو میں واضح الفاظ میں یہ بات کہی تھی ''اب ہم عمر کی ان منزلوں میں ہیں جہاں انسان یہ سختیاں جھیلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب یہ ہم سے بعد میں آنے والوں کا

کام ہے کہ وہ اس جدوجہد کو جاری رکھیں۔"

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم

ویسے موت سے فیض صاحب کی چھیڑ خانی ساری زندگی جاری رہی۔ ابتدائی دور کی شاعری میں بھی انہوں نے بارہا ایسے اشعار کہے جو بقا و فنا کے موضوع پر تھے۔ لگتا ہے ایسے شعر کہنے میں انہیں ایک خاص قسم کا حظ ملتا تھا۔ موت سے برسوں پہلے انہوں نے ایک بڑی خوبصورت نظم لکھی تھی، جس کا عنوان تھا۔ "جس روز قضا آئے گی۔"

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی

شاید اس طرح کہ جس طور کوئی اولِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمت بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے
جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرفِ ودع کی صورت
اللہ الحمد بانجام دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنام لبِ شیریں دہناں

موت سے رومانس میں فیض صاحب کو بڑا مزہ آتا تھا۔ انہوں نے داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ کی شاعری سے بھی ترجمہ کے لئے اسی لئے اس نظم کا انتخاب کیا۔ جس کا عنوان ہے "آرزو"

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزم دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں

اسی موضوع پر فیض صاحب کے سوانح نگار ڈاکٹر ایوب مرزا نے ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے جو گفتگو کی تھی ان کی زندگی کے آخری اشعار پڑھنے سے پہلے ان پر ایک نظر ڈال لیں۔

''ہمارے دیس میں ہر ذی نفس پچاس برس کا ہونے کے بعد اپنے بڑھاپے کے بندوبست کا سوچتا ہے۔فیض سے ان کے بڑھاپے کے انتظام کے بارے میں استفسار کیا تو بولے ''بھئی میں ہر کام کرنے والے کی طرح ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال کچھ کماتا رہا ہوں اور خرچ کرتا رہا ہوں۔میری کوئی جائیداد نہیں ہے۔''

پوچھا،فیض صاحب! کوئی آخری خواہش؟

بولے ''نہیں بھئی کوئی نہیں۔سوائے اس کے کہ میں ایک ناکارہ بوڑھے کی زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔بس مجھے اس سے وحشت ہوتی ہے۔'' اور دم آخریں تک فیض کی زندگی باکار گزری۔

فیض صاحب اپنے پیچھے سوگواروں کی ایک بڑی تعداد چھوڑ گئے۔ان کی بیوی بچے،ان کے رشتہ دار،ان کے قریبی دوست اور ان کے فن کے لاکھوں قدردان۔یہ صدمہ سب کے لئے بڑا جانکاہ تھا۔میں نے اس روز ماڈل ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں اپنی آنکھوں سے بڑے رقت آمیز مناظر دیکھے۔لوگوں کو ایک بڑے شاعر اور ایسے عظیم المرتبت شخص کے گزر جانے کا بہت صدمہ تھا۔ حالانکہ انہوں نے کچھ عرصہ پہلے سب کو خبردار کر دیا تھا۔

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

اب ملاحظہ کیجیے اس عظیم شاعر کی زندگی کے آخری اشعار۔

بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے
ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لطف کیا ہے مرے مہرباں ستم کیا ہے
کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشم نم کیا ہے
لحاظ میں کوئی کچھ دور ساتھ چلتا ہے
وگرنہ دہر میں اب خضر کا بھرم کیا ہے
اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے
سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے

☆......☆......☆

کتابیات

اس کام کے دوران بہت سی کتابوں سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان تحریروں سے رہنمائی حاصل کیئے بغیر شاید یہ کام مکمل نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے نوشتوں میں کہیں کہیں ان مصنفوں اور کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ مگر عام طور پر جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ صفحہ بہ صفحہ کتابوں اور مصنفوں کے نام رقم کیے جاتے ہیں اس سے میں نے گریز کیا ہے۔ حاشیوں کی ان تحریروں سے میرے نزدیک کتاب کی دلکشی اور اشاعت کا حسن متاثر ہوتا ہے۔ پھر یوں بھی میری یہ کتاب کوئی تحقیقی دستاویز نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے انداز میں وہ کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے، جس کا یا تو خود مجھے علم تھا، یا اپنے بزرگ دوستوں اور فیض صاحب کے ہم عصروں کی زبانی سنا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے یہ سمجھا کہ ان کتابوں کے مصنف بھی جیسے اس کام میں میرے شریکِ کار ہیں۔ ذیل میں ایسی تصانیف اور مصنفوں کے ناموں کی فہرست درج ہے جن کی گراں قدر تحریروں سے میں فیضیاب ہوا۔

#	کتاب	مصنف	ناشر
1	ہم کہ ٹھہرے اجنبی	ڈاکٹر ایوب مرزا	الکتاب پرنٹرز، اسلام آباد
2	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک، لاہور
3	فیض حبیب عنبر دوست	اشفاق حسین	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
4	فیض، شاعر اور شخصیت	اشفاق حسین	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
5	An Introduction to Poetry of Faiz.	امداد حسین	وین گارڈ بکس، لاہور
6	Dear Heart	ایلس فیض	فیروز سنز، لاہور
7	Over My Shoulder .	ایلس فیض	فرنٹیر پوسٹ پبلی کیشنز
8	دلّی جو ایک شہر تھا	انتظار حسین	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

9	ششماہی ''غالب''	رانا فاروقی	ادارہ یادگارِ غالب، کراچی
10	بیادِ صحبت نازک خیالاں	ڈاکٹر آفتاب احمد	دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد
11	فیض احمد فیض، شاعر اور شخص	ڈاکٹر آفتاب احمد	مکتبۂ دانیال، کراچی
12	گمشدہ لوگ	آغا ناصر	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
13	فیض، شاعری اور سیاست	پروفیسر فتح محمد ملک	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
14	ہم کلامیاں	حسن رضوی	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
15	ناممکن کی جستجو	حمید نسیم	فضلی سنز، کراچی
16	منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں	خلیق ابراہیم خلیق	فضلی سنز، کراچی
17	روشنائی	سید سجاد ظہیر	مکتبہ دانیال، کراچی
18	ماہنامہ ''ماہِ نو'' فیض نمبر	ساجدہ اقبال	ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، اسلام آباد
19	مقالاتِ فیض	شیما مجید	فیروز سنز، لاہور
20	ماہنامہ ''افکار'' فیض نمبر	صہبا لکھنوی	مکتبہ افکار، کراچی
21	زندگی زندہ دلی کا نام ہے	ظفر اللہ پوشنی	فضلی سنز، کراچی
22	لاؤ تو قتل نامہ مرا	عبداللہ ملک	تخلیقات، لاہور
23	آج بازار میں پابجولاں چلو	عزیز حامد مدنی	اکیڈیمک آفسٹ پریس، کراچی
24	نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	مکتبہ کارواں، لاہور
25	صلیبیں مرے دریچے کی	فیض احمد فیض	مکتبۂ دانیال، کراچی
26	مہ و سال آشنائی	فیض احمد فیض	دار الاشاعت، ماسکو
27	متاعِ لوح و قلم	فیض احمد فیض	مکتبۂ دانیال، کراچی

28	ادبی تنقید اور اسلوبیات	گوپی چند نارنگ	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
29	پرورش لوح وقلم	لدمیلا وسیلیوا	اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی
30	عمر گذشتہ کی کتاب	مرزا ظفر الحسن	ادارہ یادگارِ غالب، کراچی
31	لوحِ ایام	مختار مسعود	فیروز سنز، لاہور
32	اور لائن کٹ گئی	مولانا کوثر نیازی	جنگ پبلشرز، لاہور
33	حسرت موہانی، انقلاب اور آزادی	ڈاکٹر نفیس صدیقی	اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی
34	آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

☆......☆......☆

عکاس: حنیف خٹک

نام	آغا ناصر
جائے پیدائش	میرٹھ (یوپی)
تعلیم	ایم اے تاریخ۔ کراچی یونیورسٹی

ملازمت

پروڈیوسر	ریڈیو پاکستان
ڈائرکٹر پروگرام	پاکستان ٹیلی وژن
مینجنگ ڈائرکٹر	نیف ڈیک
ڈائرکٹر جنرل	پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن
ڈائرکٹر جنرل	پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس
مینجنگ ڈائرکٹر	پاکستان ٹیلی وژن
چیف ایگزیکٹو	شالیمار ریکارڈنگ اینڈ براڈ کاسٹنگ کمپنی
ایگزیکٹو ڈائرکٹر	جیو ٹی وی

تصنیفات	سات ڈرامے۔ ٹیلی وژن ڈرامے۔ گمشدہ لوگ۔ گلشنِ یاد
اعزازات	میڈیا، ادب اور ثقافت کے شعبوں میں متعدد اعزازات بشمول ”صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی“
مشغلے	مطالعہ اور چہل قدمی
نجی زندگی	بیوی صفیہ۔ بیٹا آغا بلال۔ بیٹیاں ھما اور شائلہ

Rs. 750.00

www.sang-e-meel.com
ISBN-10: 969-35-2153-6
ISBN-13: 978-969-35-2153-5
9789693521535